بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

عَمَّ

حصہ دوم

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

30

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

عَمَّ

حصہ دوم

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

30

اکرم التفاسیر

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ

پارہ .... 30 حصہ دوم

بارِ سوم .... نومبر 2017

تعداد.................... دو ہزار

قیمت.................... -/470 روپے

ناشر .... ملک عبدالقدیر اعوان

ناظم اعلیٰ ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

نے انتخاب جدید پریس لاہور سے طبع کروایا

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی

کالج روڈ ٹاؤن شپ لاہور

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بدبختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہوگی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

www.QuranTafseer.net

الحمد وللہ اس ویب سائیٹ سے ہزاروں لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور مزید آسانی سے لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے اب اسی ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ اپلیکیشن بھی متعارف کروادی گئی ہے۔

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ اپلیکیشن سرچ کرکے انسٹال کرسکتے ہیں۔

QuranTafseer.net —search

Quran Urdu Tafseer

QuranTafseer.net

INSTALLED

اپنے دوستوں رشتہ داروں کو بھی بتائیں اور اس نیک کام کا حصہ بن جائیں۔

Message from +92 322 2158491 @ ذاکرین اللہ

Quran Urdu Tafseer

اسلامی دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام الرشد کی آڈیوز، وڈیوز۔ جس میں آپ بھی اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

پنجابی تفسیر آڈیوز، وڈیوز کے لیے یہاں ٹچ کریں۔

ماہانہ اجتماع آڈیوز ، وڈیوز

سالانہ اجتماع آڈیوز ، وڈیوز

جمعہ نماز بیان آڈیوز ، وڈیوز

سپیشل پروگرام آڈیوز ، وڈیوز

VISITOR COUNTER

انسٹال کرنے کے بعد اسی جگہ Rate this app میں 5 سٹار کو ٹچ کرکے سبز کرکے Submit کردیں۔

R

Rate this app

★ ★ ★ ★ ★

Loved it

SUBMIT

83% 1:53 am

Quran Urdu Tafseer

اردو آڈیو تفسیر کے لیے یہاں ٹچ کریں۔

تحریری یعنی لکھی ہوئی اردو تفسیر کے لیے یہاں ٹچ کریں۔

ناظرہ قرآن پڑھنا سیکھنے کے لیے یہاں ٹچ کریں۔

قاری السدیس صاحب کی خوبصورت آواز میں قرآن کی تلاوت اور حضرت مولانا اکرم اعوان صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو میں سنٔ

اللہ کے ذکر کا ایسا طریقہ سیکھیں جس سے آپ کا دل اور جسم اللہ اللہ کرنے لگ جائے۔

پنجابی آڈیو، وڈیو تفسیر کے لیے یہاں ٹچ کری

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکﷺ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد وخواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ، روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقۂ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔

www.QuranTafseer.net

الحمدُللہ قرآن تفسیر مکمل ہو جانے کے بعد حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی نے دورہ حدیث کا آغاز فرمادیا ہے جس میں مشکوٰۃ شریف احادیث کی شرح کا آغاز ہو چکا ہے جو آپ اس ایپلیکیشن میں سُن سکتے ہیں۔

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ ایپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں کو بھی بتائیں اور اس نیک کام کا حصہ بن جائیں۔

انسٹال کرنے کے بعد اسی جگہ Rate this app میں 5 سٹار کو ٹچ کر کے سبز کر کے Submit کر دیں۔

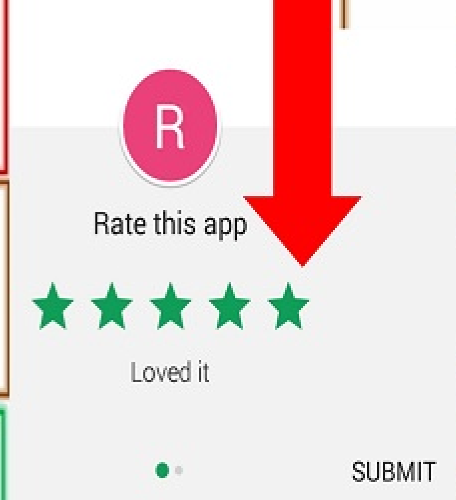

دیباچہ

جتنا شکر ادا کیا جائے اس ربّ کریم کا ادا نہیں ہوسکتا کہ اُس نے ہمیں قرآنِ حکیم بیان کرنے کی، سننے کی، عمل کی توفیق ارزاں فرمائی۔ چند گزارشات۔

اللہ کریم کا بے پناہ احسان ہے۔ میں عالم نہیں ہوں، مفتی نہیں ہوں، پڑھا لکھا انسان نہیں ہوں۔ مجھ سے میرے مالک نے جو چاہا وہ خدمت لی۔ اُس کا احسان ہے۔ اللہ نے توفیق دی قرآن کی خدمت کی اور دم آخر تک دیئے رکھے۔ اس کی اپنی لذّت ہے اور شاید ہر ایک کو اپنی اپنی لذّتوں کا احساس ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خادمہ مسجد صاف کیا کرتی تھیں، اُن ؓ کا رات کو وصال ہو گیا۔ اب حجرۂ مبارک میں آواز دینے کی جرأت تو نہیں ہوتی تھی۔ جنازہ رکھنا حکم شرعی نہیں تھا۔ رات ہی کو جنازہ ہوا دفن کر دی گئیں۔ بارگاہ عالی میں خبر ہوئی صبح حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اُن ؓ کی قبر پر تشریف لے گئے۔ جنازہ پڑھا، دعا فرمائی۔ کسی صحابیؓ نے اُن ؓ سے کشفاً پوچھا کہ بی بی نجات کے لیے کون سا عمل افضل ہے؟ انہوںؓ نے کہا مسجد میں جھاڑو دینا سب سے افضل بات ہے۔ اب اُن ؓ کی نجات اسی عمل پہ ہوگئی تو جس کو جہاں سے ملتا ہے وہ سمجھتا ہے اس کی لذت اپنی ہے۔ بادشاہ کے لیے اگر خوانِ نعمت لذیذ ہے تو فقیر کے لیے سوکھی روٹی کی اپنی لذت ہے۔ ہر چیز کی اپنی لذت ہے۔ شب بیداری کی، تہجد کی، صلوٰۃ کی، حج کی نماز کی لیکن میں سمجھتا ہوں جو لذت قرآن پڑھنے، بیان کرنے، سننے، سمجھنے کی ہے شاید یہ بہت اچھی، سب سے اچھی ہے۔ جس کو جہاں سے جو ملتا ہے اُسے وہ اچھا لگتا ہے۔

قرآنِ کریم ایک انتہائی جلیل القدر کتاب ہے۔ فرمایا: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ۔ یہ ہے وہ کتاب۔ بلند مرتبہ، عظیم الشان۔ عربی میں قریب کے لیے ھٰذا استعمال ہوتا ہے۔ اصولاً یہاں ھٰذا آنا چاہیے تھا لیکن قرآن کی بلندیٔ شان بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لیے ذٰلِكَ استعمال فرمایا، اس میں میں بہت بڑی بات ہے کہ یہ ہے وہ کتاب۔ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ جس کے کسی حکم، کسی ارشاد، کسی بیان میں شبے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

نزول سے لے کر قیامت تک پورا نظامِ زندگی ہے۔ جس میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ نزول سے لے کر قیامت تک زمانہ کتنی کروٹیں لے، کتنے نئے سوال پیدا ہوں، ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ اس بیسویں صدی تک علمائے تاریخ کے مطابق قرآن کی تقریباً ڈھائی لاکھ تفاسیر لکھی گئیں ہر زمانے میں کچھ لوگوں سے اللہ نے اس کی خدمت لی تو ڈھائی لاکھ کے قریب تفاسیر لکھی گئیں جن میں علمائے تاریخ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار ایسی ہیں جو طبع نہ ہو سکیں جب مطبوعات نہیں تھے، وسائلِ پریس نہیں تھے، قلمی نسخے چلتے رہے۔ پھر بعد میں پریس آ گئے۔ دو لاکھ ایسی ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔ اب اس صدی میں شاید اور بہت سی آ گئی ہوں گی وہ اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ بھی کسی نے سوال کیا تھا کہ اتنی زیادہ کیوں لکھی گئی ہیں؟ بات یہ ہے کہ ہر عہد کی اپنی ضرورتیں، اپنے سوال ہیں، اپنے مسائل ہیں۔ یہ کتاب واحد ہے کہ نزول سے لے کر قیامت تک ہر عہد میں اللہ نے ایسے بندے پیدا فرمائے جنہوں نے اسی کتاب سے اس عہد کے سوالات کو حل کر دیا۔ ہم پریشان ہوتے ہیں کہ فلاں پرانی تفسیر اُٹھائی اُس میں میرا مسئلہ نہیں مل رہا۔ پریشانی کی بات نہیں آپ کا مسئلہ آج کا ہے اُنہوں نے اپنے عہد کے مسائل حل کیے ہیں۔ جس عہد میں تفسیر لکھی گئی ہے اس عہد کا کوئی مسئلہ ان لوگوں نے نہیں چھوڑا لیکن مستقبل کا خدا جانے۔ انہیں کیا خبر کب، کہاں، کون کون سا مسئلہ پیدا ہوگا؟ لہٰذا اللہ نے ہر دور میں کچھ لوگوں کو یہ خدمت عطا فرمائی۔ بہت سے لوگ، شیطان نے بھی تیار کیے مفسروں کے نام پر۔ آج بھی ایسی تفسیریں ملتی ہیں جیسے غلام احمد قادیانی نے بھی آیات کی تفسیر کی۔ اس طرح کچھ اور لوگ بھی جسارت کرتے رہے۔ میں نے تو ساری عمر سیدوں کے ساتھ شاہ سنا ہے۔ ایک سنا ہے کوئی احمد خان صاحب بھی سیّد ہوئے ہیں انہوں نے بھی ایک تفسیر لکھی۔ اُس میں بھی انہوں نے اسی طرح کی تک بندی کی تو کچھ ہوتے ہیں شیطان کے پیروکار جو اس طرح کی تک بندی کرتے رہتے ہیں۔ اللہ سب کو معاف کرے۔

اللہ نے اپنے بندوں سے اپنے بندوں کی راہنمائی کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی خدمت کا اور قرآن کی خدمت کا کام لیا اور یوں ہر زمانے میں تفاسیر اس عہد کی راہنمائی کرتی رہیں۔ ہر تفسیر نے اپنے عہد کے سوالوں کے جواب دیے۔ میں قرآن بیان کیا کرتا تھا حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بہت پسند فرماتے تھے۔ تو آپؒ نے مجھے ایک دفعہ فرمایا، ایک تفسیر لکھو۔ 1984ء میں آپ کا وصال ہو گیا اللہ آپؒ پر کروڑوں

رحمتیں نازل فرمائے۔ 1987 میں، میں نے اُس ارشاد کی تعمیل میں اسرار التنزیل لکھنا شروع کی۔ بڑی عجیب بات ہے رمضان شریف میں شروع کی پہلے تین پاروں کی تفسیر لکھ لی۔ اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ اب جو یہاں سے دور ہو گیا ہے۔ تین پارے لکھے گئے۔ رمضان شریف گزر گیا پوری کوشش کی ایک لفظ نہ لکھا گیا۔ چھوڑ دیا۔ پھر رمضان شریف آیا پھر قلم چل پڑا۔ اگلے رمضان شریف میں تین پارے پھر لکھے گئے۔ یوں سلسلہ چلتا رہا۔ ہر رمضان شریف میں تین پارے پھر لکھے گئے۔ یوں سلسلہ چلتا رہا۔ غیر رمضان میں کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔

رمضان میں دَر واہو جاتا تھا۔ ایک سال درمیان میں بیماری کی وجہ سے تفسیر پر کام نہ ہو سکا۔ یوں گیارہ سال لگے۔ 1998ء میں الحمدللہ! اسرار التنزیل کے نام سے وہ تفسیر مکمل ہو گئی۔ اللہ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے، عوام کے ہاں بھی علما کے ہاں بھی بہت مقبول ہوئی۔ میں امریکہ میں تھا نیو یارک میں تھا تو ایک خاتون مجھ سے ملنے آئیں وہاں انہوں نے ایک اسلامک لائبریری الگ سے بنا رکھی ہے جس میں وہ لوگ اسلامی کتب جمع کرتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کے عقائد نظریات، حالات پہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس کی انچارج تھیں۔ ہمارے ایک وزیر رہے ہیں صاحبزادہ یعقوب خان وہ ان کی کزن تھیں عمر رسیدہ تھیں مجھے ملنے نیو یارک آئیں تو انہوں نے بتایا کہ ہماری لائبریری نے بھی اسرار التنزیل منگوائی ہے میں نے پڑھی ہے بہت لطف آیا۔ اللہ نے اسے یہاں تک مقبولیت بخشی۔ حتیٰ کہ اسلام دشمنوں کو بھی ضرورت پیش آئی کہ یہ بھی دیکھی جائے۔ پھر ایک ٹیلی ویژن چینل نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں پنجابی میں قرآن کریم کی تفسیر نشر کریں۔ اللہ بھلا کرے وہ اس کا سبب بن گئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا میں نے کہا جی بالکل بہت اچھی بات ہے، ہم نے با قاعدہ ایک Sound proof کمرہ بنوایا۔ اس کی دیواریں چھت ریکارڈنگ کے قابل بنائیں۔ پھر کیمرے خریدے سارا انتظام کیا۔ اس میں ہم ریکارڈنگ کرتے اُنہیں بھیج دیتے CDs چلتی رہیں چلتی رہیں۔ اکسویں پارے تک تو وہ نشر کرتے رہے پھر ان کو کچھ باتیں تلخ لگیں تلخ تو نہیں تھیں اُن کی پسند کے خلاف تھیں تو وہ ناراض ہو گئے وہ ایک بہانہ بن گیا۔ انہوں نے بند کر دیا۔ لیکن ہم نے بند نہ کیا۔ انہوں نے تو اپنی پسند کے کوئی

مولوی لے کر خانہ پری کر لی لیکن ہم نے وہ جاری رکھی اور الحمد للہ! تیس پارے مکمل ہو کر پنجابی میں وہ ایک بیانیہ تفسیر بن گئی اب اُس کے بارے عبد القدیر (ناظم اعلیٰ) بتا رہا تھا کہ اُسے ضبطِ تحریر میں لایا جا رہا ہے لیکن پنجابی میں اس کی پوری کیسٹیں، سی ڈیز دستیاب ہیں الحمد للہ!

پھر ہوا یہ کہ میری عادت ہے کہ ہمیشہ قرآن ہی بیان کرتا ہوں تو ہم ہر جمعہ پہ آتے کوئی تیاری نہیں ہوتی کوئی ذہن میں مضمون نہیں ہوتا کوئی حالات کی پروا نہیں ہوتی قرآن کریم کھولتے جہاں سے کھل گیا ایک دو چار آیات جن کی تفصیل بیان کر دی تو خیال آیا کہ جب تفسیر بیان کر ہی رہے ہیں تو اسرار التنزیل کی شرح کیوں نہ کر دی جائے! چنانچہ 2005 میں سورۂ فاتحہ سے شروع کر دی۔ یہ ساری اکرم التفاسیر اسرار التنزیل کی تفصیل ہے۔ اسرار التنزیل مجمل ہے یہ مفصل ہے وہ اجمالی سی ہے اُس میں بنیادی نکات ہیں اِس میں تفصیلی بحث ہو گئی تو یہ 2005 میں ہم نے شروع کی۔ آج الحمد للہ! بارہ سال بعد یہ اپنے نقطۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اس میں عہدِ حاضر کے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں واقعی کوئی کمال ہے تو وہ اللہ کی عطا ہے، اُس کا کرم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ شفقت ہے۔ وہ توجہ ہے مشائخ عظام کی۔ وہ برکات ہیں شیخ المکرم کی۔ کیا لوگ تھے! جانے کہاں کھو گئے! یہ مسجد بن رہی تھی پرانے والی اور بہت وسیع تھی اس میں تقریباً آٹھ کینال جگہ ہے۔ مجھے اس لیے پتا ہے کہ میں نے آٹھ کینال بہترین ٹکڑا زمین کا دے کر یہ تبادلے میں لی تھی یہ بے کارسی زمین تھی لیکن وہ بیچ نہیں رہا تھا میں نے کہا یار اچھی زمین لے لو یہ دے دو، تبادلے میں آٹھ کینال لی تھی تو یہ ایک ویرانہ تھا۔ یہ دکانیں یہ آبادیاں بعد میں بنیں کچھ کوئلے کے پیڑے تھے لیکن مکان نہیں تھے ایک دفتر تھا چھوٹی سی کوٹھڑی اور اتنی بڑی مسجد۔ حضرت جی رحمۃ اللہ تعالیٰ کھڑے تھے پھر رہے تھے دیکھ رہے تھے حضرت قاضی صاحب مرحوم ساتھ تھے اور احباب بھی تھے خادم بھی حاضر تھا تو کسی نے کہا اتنی بڑی مسجد اس ویرانے میں یہاں کون آئے گا؟ آپ اجتماع بھی کرتے ہیں بیس نہ سہی تو چالیس پچاس ساتھی آجاتے تو اتنی بڑی مسجد! قاضی صاحب نے دیکھ کر فرمایا میں دیکھ رہا ہوں یہ کم پڑ جائے گی اور حقیقت یہ ہے کہ ہم انکار تو نہیں کرتے تھے ہمیں پتا ہوتا تھا یہ بندے سچے ہیں

اللہ کی طرف سے جانتے ہیں سچ بولتے ہیں لیکن حیرت مجھے بھی ہوئی کہ اتنی بڑی مسجد کم پڑ جائے گی! اللہ نے وہ وقت دیکھنا نصیب فرمایا کہ وہ مسجد کم پڑ گئی پھر جہاں ہم بیٹھے ہیں یہ سارا اضافہ کرنا پڑا اور اب یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہ کم پڑ رہا ہے۔ کیا لوگ تھے! کہاں تک ان کی نگاہیں تھیں! کیسے عجیب بندے تھے! یہ تو حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور جوتیاں اٹھانے والے لوگ تھے تو جو کمال ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ کہیں کوئی کوتاہی ہو گئی، بھول چوک ہو گئی، غلط بات، غلطیاں پرنٹنگ میں بھی ہو جاتی ہیں کتابت میں بھی ہو جاتی ہیں بعض مجھ سے بھی ہو جاتی ہیں کہیں کوئی غلطی ہے تو قصور میرا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ کسی صاحبِ علم کو، کسی ساتھی کو کوئی غلطی نظر آئے تو بڑی فراخدلی سے نشاندہی کر دے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اصلاح کی گنجائش ہے۔ میں بھی توبہ کرلوں، رجوع کرلوں، اس کی اصلاح کرلوں۔ میرا کہنا حرفِ آخر نہیں ہے۔ میں بھی انسان ہوں، مجھے بھی سمجھنے میں بھول چوک، غلطی ہو سکتی ہے تو یہ اللہ کریم کا احسان ہے آج اس نے یہ دن دیکھنا نصیب فرمایا۔ الحمد للہ! اللہ اس کی برکات سے آپ سب کو بھی اور حاضر و غائب تمام احباب کو بھی، عامۃ المسلمین کو بھی مستفید فرمائے۔

اللہ اپنے اس کلام کے صدقے ہمارے ملک پر رحم فرمائے۔ اسے قائم رکھے، اس کے حالات درست ہوں، اس میں امن قائم ہو اور اس پہ انصاف کی حکومت اور اسلام کی حکومت قائم ہو۔ حقیقی معنوں میں یہ اسلامی پاکستان ہو، اسلامی جمہوریہ پاکستان ہمیں نہیں چاہیے ہمیں، اسلامی پاکستان چاہیے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں کسی پخ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام اسلام ہے بس اس کے بعد کچھ نہیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے، بڑے سے بڑے سوال کا جواب اسلام میں موجود ہے جو حق پر مبنی ہے۔ انصاف پر مبنی ہے۔ جو اللہ کا فیصلہ ہے اللہ ہمارے اس ملک کو اسلامی ریاست بنا دے۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

میرے یہ آخری چند الفاظ ہی اس تفسیر کا دیباچہ بن جائیں گے ان شاء اللہ العزیز

الحمد للہ الحمد للہ الحمد للہ رب العلمین

از دلِ خیزد بردلِ ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود نمائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم ومعارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب وکتاب' جنت ودوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں' آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل وحمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم وایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کردیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل ہو

رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقامِ ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا وکرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

امیر محمد اکرم

مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن وحدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدُنّی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدُنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ، ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے او چھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت و دوزخ یا ثواب و عذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت و رسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہلِ حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے' جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔

امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

پارہ 30

حصہ دوم

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
1	سورۃ الیل رکوع 1 آیات 1 تا 21	19
2	تفسیر و معارف	20
3	شب و روز گواہ ہیں کہ ہر حال کا ایک فطری نتیجہ ہے:	20
4	مرد اور عورت کا تخلیقی رجحان اور ذمہ داریاں:	21
5	انسانی زندگی کا کمال دوسروں کے لیے زندہ رہنے میں ہے:	24
6	مصائب کو دعوت دینے والے رویے:	30
7	دنیا کا مال و دولت کام نہ آئے گا:	33
8	دنیا و آخرت، اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے:	34
9	محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے خرچ کرنے والے:	36
10	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان:	40
11	سورۃ الضحیٰ رکوع 1 آیات 1 تا 11	41
12	تفسیر و معارف	41
13	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی مسلسل اور لامتناہی ہے:	43
14	آیۂ کریمہ میں مسلمان کے لیے ایک پیغام:	46
15	عطائے باری:	47
16	حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کریم کے خاص انعامات:	48
17	نورِ نبوت کے اظہار کی بیقراری:	49
18	اللہ کی نعمتوں کا زبان سے اور حال سے اظہار:	54
19	سورۃ الم نشرح رکوع 1 آیات 1 تا 8	56
20	تفسیر و معارف	56
21	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان:	56
22	شرحِ صدر کا تعلق روح سے ہے:	57
23	کفر کا سینہ چاک کر کے اسلام کا نور پھیلانا کارِ عظیم:	59
24	تہذیب اور معاشرت عقیدے اور ایمان کا مظہر ہوتی ہے:	60
25	ہم سے وہ بنیاد کھو گئی جو تہذیب کی مظہر ہے:	60

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
26	''بول بالا ہے تیرا ذکر ہے اونچا تیرا:''	65
27	تمام وظائف کا جامع وظیفہ:	66
28	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات اس کائنات کی روح ہے:	68
29	دورِ حاضر میں کفر کے حربے:	69
30	محنت کے ساتھ کامیابی ہے:	72
31	وظائف کی اپنی جگہ ہے:	72
32	طالبانِ حق کے لیے لازم ہے:	75
33	سورۃ التین رکوع 1 آیات 1 تا 8	78
34	تفسیر و معارف	78
35	ذلت سے بچنے کا راستہ:	82
36	سورۃ العلق رکوع 1 آیات 1 تا 19	85
37	تفسیر و معارف	86
38	نزولِ وحی کی ابتدا:	86
39	عظمتِ اسمِ ذات:	87
40	علمِ نافع وہ ہے جو عظمتِ الٰہی پر دلالت کرے:	88
41	خالق، صرف اللہ جلّ شانہٗ:	89
42	جبرئیل امین کا بھیجنا، ایک سبب تھا:	92
43	صوفیا کے ہاں یہی مسنون طریقہ رائج ہے:	93

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
44	آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پروردگار بڑا کریم ہے:	95
45	کریم ربّ نے چند لکیروں میں علم کو مقید کرنا سکھا دیا:	97
46	عطائے الٰہی اور ہماری بدنصیبی:	98
47	حاصلِ کلام:	101
48	بغاوت اور سرکشی:	103
49	اتباعِ شریعت عبادت ہے:	104
50	انسان کی سرکشی کا سبب:	105
51	قرآن کا نزول خاص ہے، حکم عام ہے:	106
52	راہِ راست پر ہونے کا معیار:	108
53	تقویٰ کا نتیجہ، مخلوق کی بہتری:	109
54	نظامِ اسلام سے روکنے والوں کا انجام:	110
55	کافرانہ نظام قبول نہ کیا جائے:	115
56	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نصیب ہو جائے تو ہر کام سجدہ بن جاتا ہے:	116
57	سورۃ القدر رکوع 1 آیات 1 تا 5	118
58	تفسیر و معارف	118
59	نزولِ قرآن کے لیے اہتمام:	119
60	سورۃ البینۃ رکوع 1 آیات 1 تا 8	124
61	تفسیر و معارف	125

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
62	عہدِ فترت:	126
63	عہدِ حاضرہ:	128
64	قرآن سب امور کو محیط ہے:	129
65	آج کلمہ گو:	129
66	ایک حدیثِ مبارکہ کی تشریح:	130
67	تفرقہ بازی کیوں؟	132
69	ہم آہنگی اور اتفاق کا بنیادی نکتہ:	133
71	مسلمانوں کا امیر، خلیفہ:	134
72	خشیت کیا ہے؟	138
73	سورۃ زلزال رکوع 1 آیات 1 تا 8	140
74	تفسیر و معارف	140
75	کردار کے مطابق گروہ:	143
76	سورۃ العٰدیٰت رکوع 1 آیات 1 تا 11	145
77	تفسیر و معارف	145
78	سورۃ القارعہ رکوع 1 آیات 1 تا 11	149
79	تفسیر و معارف	149
80	اعمال میں وزن کس چیز سے ہوگا؟	151
81	سورۃ التکاثر رکوع 1 آیات 1 تا 8	153
82	تفسیر و معارف	154
83	دورِ حاضر، ایک مثال:	157
84	کیا ہی اچھا ہوتا!	159
85	اللہ کریم کا خاص کرم:	162
86	سب سے بڑی دلیل:	162
87	ماننا، عمل کا تقاضا کرتا ہے:	165
88	بڑی آسان سی قیمت تھی:	165
89	سورۃ العصر رکوع 1 آیات 1 تا 3	168
90	تفسیر و معارف	168
91	زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے:	168
92	خسارے سے محفوظ لوگ:	170
93	سورۃ الھمزہ رکوع 1 آیات 1 تا 9	174
94	تفسیر و معارف	174
95	دین پر طعن کرنے والوں کا کردار اور انجام:	174
96	سورۃ الفیل رکوع 1 آیات 1 تا 5	179
97	تفسیر و معارف	179
98	واقعہ کا تاریخی پس منظر:	179
99	حضرت عبدالمطلب کا عقیدہ:	180
100	سپر پاور صرف اللہ ہے:	181
101	سورۃ قریش رکوع 1 آیات 1 تا 4	185
102	تفسیر و معارف	185

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
103	اللہ کریم کا احسان کہ بنی آدم کو موسموں کا عادی بنا دیا:	185
104	خوشحالی اور امن اللہ کی نعمتیں ہیں جن کا شکر اطاعت ہے:	187
105	سورۃ الماعون رکوع 1 آیات 1 تا 5	190
106	تفسیر و معارف	190
107	روزِ جزا کے منکرین کا کردار:	190
108	خلاصہ:	194
109	سورۃ الکوثر رکوع 1 آیات 1 تا 3	199
110	تفسیر و معارف	199
111	خیر کثیر:	199
112	سورۃ الکٰفرون رکوع 1 آیات 1 تا 6	203
113	تفسیر و معارف	203
114	باطل کو باطل نہ کہنا اسے قبول کرنا ہے:	206
115	میرا اور تمہارا طریقہ ایک نہیں ہو سکتا:	209
116	سورۃ النصر رکوع 1 آیات 1 تا 3	210
117	تفسیر و معارف	210
118	نیکی کر کے دو کام کرنے چاہئیں:	212
119	سورۃ اللھب رکوع 1 آیات 1 تا 5	217
120	تفسیر و معارف	217

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
121	بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت محتاط رہنا چاہیے:	217
122	ابی لہب اور اس کی بیوی کا انجام:	219
123	ہر ایک کا معاملہ اللہ کریم کے ساتھ ہے:	221
124	اہلِ کشف کے لیے انتباہ:	222
125	سورۃ الاخلاص رکوع 1 آیات 1 تا 4	223
126	تفسیر و معارف	223
127	توحیدِ باری کی عظمت:	223
128	سورۃ الاخلاص کی فضیلت:	232
129	لمحہ فکریہ:	232
130	سورۃ الفلق رکوع 1 آیات 1 تا 5	234
131	تفسیر و معارف	234
132	نظرِ بد اور جادو:	234
133	عظمتِ نبوت:	237
134	جادو، دکھ، پریشانی کا علاج:	237
135	سورۃ الناس رکوع 1 آیات 1 تا 6	241
136	تفسیر و معارف	241
137	نظرِ بد کا علاج:	2433
138	معوذتین کے ذریعے علاج کا طریقہ	246

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (البقرة:32)

مَولَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

سورۃ الیل رکوع 1 آیات 1 تا 21

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ
سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾ اِنَّ عَلَيْنَا
لَلْهُدٰى ۟ۖ﴿۱۲﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ﴿۱۴﴾ لَا
يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۵﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۶﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ﴿۱۷﴾
الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

رات کی قسم جب (دن کو) چھپالے ﴿۱﴾ اور دن کی قسم جب چمک اٹھے ﴿۲﴾ اور اُس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ پیدا کیے ﴿۳﴾ کہ بے شک تم لوگوں کی کوشش مختلف ہے ﴿۴﴾ تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور پرہیز گاری کی ﴿۵﴾ اور نیک بات کو سچ مانا ﴿۶﴾ تو اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے ﴿۷﴾ اور جس نے بخل اور لا پرواہی کی ﴿۸﴾ اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا ﴿۹﴾ تو ہم اسے سختی میں پہنچائیں گے ﴿۱۰﴾ اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اس کا مال اُس کے کچھ کام نہ آئے گا ﴿۱۱﴾ یقیناً ہمارے ذمہ ہے راہ دکھانا ﴿۱۲﴾ اور بے شک آخرت اور دنیا ہماری ہی چیزیں ہیں ﴿۱۳﴾ سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کیا ﴿۱۴﴾ اس میں بڑا بد بخت ہی داخل ہوگا ﴿۱۵﴾ جس نے جھٹلایا اور منہ

پھیرا ﴿۱۶﴾ اور جو بڑا پرہیز گار ہے اور اس سے بچا لیا جائے گا ﴿۱۷﴾ جو اپنا مال دیتا ہے کہ پاک ہو ﴿۱۸﴾ اور اس لئے نہیں (دیتا) کہ اس پر کسی کا احسان ہے جس کا بدلہ اتار رہا ہے ﴿۱۹﴾ بلکہ اپنے اعلیٰ و بلند پروردگار کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے ﴿۲۰﴾ اور وہ عنقریب خوش ہوگا ﴿۲۱﴾

تفسیر و معارف

سورۃ لیل مکی سورتوں میں سے ہے۔

شب و روز گواہ ہیں کہ ہر حال کا ایک فطری نتیجہ ہے:

ارشادِ باری ہے: وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ① رات کی قسم جب (دن کو) چھپالے۔

فرمایا، نظامِ کائنات میں رات کا اپنا ایک اثر ہے۔ جب رات آتی ہے تو دن بھر کی مشقتیں رک جاتی ہیں اور رات ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ کام کاج رک جاتے ہیں۔ دن بھر جن کاموں میں بندہ مصروف رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُنہیں پایہء تکمیل تک پہنچنا چاہیے ذرا سا بھی تعطل نہیں آنا چاہیے لیکن رات آتی ہے تو وہ کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے منصوبے پھر نہیں چلتے پھر اُسے اپنے امور رات کے مطابق ترتیب دینا پڑتے ہیں۔ اس بات کی قسم دی گئی ہے کہ رات گواہ ہے کہ ہر وقت، ہر حال، ہر کام کے اپنے نتائج ہوتے ہیں جن کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ رات آتی ہے تو اس کے اپنے نتائج ہیں کہ ہر شئے کو ڈھانپ لیتی ہے۔ انسان، حیوان، پرندے سب اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ پرندے بھی گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ انسان بھی نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور اگلے دن تازہ دم ہو کر اُٹھتا ہے۔ رات کی اپنی مصروفیات اور نتائج ہیں۔ کتنے ایسے جانور اور پرندے ہیں جو دن بھر چھپے رہتے ہیں رات کو رزق کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اُن کی روزی اللہ کریم نے رات سے وابستہ کر دی ہے۔ عمومی طور پر رات مخلوق کے لیے آرام کرنے کا وقت ہے تو وہ سارے کام کاج چھوڑ کر آرام کے لیے آجاتے ہیں۔ گویا رات اس بات کی گواہ ہے ہر فعل، ہر حال، ہر موسم اپنا ایک نتیجہ رکھتا ہے جس کے مطابق مخلوق عمل کرتی ہے۔

فرمایا: وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ② اور دن کی قسم جب چمک اٹھے۔

جب دن نکلتا ہے تو ہر طرف ہر چیز روشن ہو جاتی ہے۔ مخلوق زندہ ہو جاتی ہے اور دن کا شور، کام کاج کی مصروفیات پھر سے شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر کوئی تازہ دم ہو کر پھر سے اپنے کاروبارِ زندگی میں لگ جاتا ہے یعنی دن اس

بات پر گواہ ہے کہ جب یہ آتا ہے تو نتائج بدل جاتے ہیں۔ کردار اور سوچ بدل جاتے ہیں اور سارا نظام بدل جاتا ہے۔ رات کا اپنا نظام ہے اور دن کا اپنا نظام ہے۔ رات آتی ہے تو سب کام رک جاتے ہیں۔ لوگ آرام کرتے ہیں۔ جب دن آتا ہے تو لوگ بستروں سے نکل کر کام پر لگ جاتے ہیں۔ گویا ہر حال کا جو قدرتی اور فطری نتیجہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس حتمی نتیجے کو بدلا نہیں جاسکتا۔

مرد اور عورت کا تخلیقی رجحان اور ذمہ داریاں:

فرمایا: وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ﴿٣﴾ اور اس ذات کی قسم جس نے نَر اور مادہ پیدا کیے۔

اللہ کریم نے ہر مخلوق میں نَر اور مادہ پیدا فرمائے۔ انسانوں میں حیوانوں میں، پرندوں حتیٰ کہ درختوں میں بھی نَر اور مادہ درخت ہیں۔ یہ اللہ کریم کی عجیب قدرت ہے کہ جس جنس کا نَر ہے، انسان ہے یا حیوان، اسی جنس سے مادہ ہے۔ وہی نسل ہے وہی ماں باپ ہیں۔ ایک گھر میں، ایک ہی والدین کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اور اسی گھر میں اُنہی والدین کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ بیٹے کی جسمانی ساخت اپنی ہے، قد کاٹھ اپنا ہے، استعدادِ کار جسمانی اور ذہنی قوت الگ ہے۔ بیٹے کا کردار اپنا ہے، کام کرنے کا فطری رجحان اور مزاج تک اپنا ہے۔ اسی کی مناسبت سے اس کی ذمہ داریاں الگ ہیں۔ بیٹی کا کردار اپنا ہے، جسمانی ساخت، قد کاٹھ، لباس، استعدادِ کار جسمانی اور ذہنی طاقت اور فطری رجحان اپنا ہے۔ اسی مناسبت سے اس کی ذمہ داریاں اپنی ہیں۔ اس خالق کی قدرت اس بات پر گواہ ہے کہ جو جس کام کے لیے ہے اس سے وہی کام ہوگا جو فطرت نے اس کے ذمے رکھا ہے۔ دونوں نے اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ دونوں کو اجر ایک بادشاہ نے، اُس احکم الحاکمین نے دینا ہے لیکن ایک جیسے کام پر نہیں بلکہ اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے پر دینا ہے۔ مرد کے ذمے ہے کہ وہ حلال رزق، جائز وسائل سے کمائے اور اولاد کو پالے۔ عورت کے ذمے ہے کہ مرد جو رزق کما کر لائے اس کی حفاظت کرے اُسے ضائع نہ کرے اور اولاد کی تربیت شفقت سے کرے۔ دونوں کے کام مختلف ہیں، ایک کا کام لانا ہے، ایک کا کام خرچ کرنا ہے۔ دونوں کو اجر ملے گا کہ انہوں نے کس خلوص سے اپنی اپنی ذمہ داری پوری کی۔ جیسے فوج میں ایک افسر ہے، ایک سپاہی ہے، دونوں کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے۔ اگر افسر کو انعام ملے گا تو اس فرض کی بطریقِ احسن ادائیگی پر ملے گا جو اُس کے ذمے تھا۔ اسی طرح سپاہی کو اس کی ذمہ داری اچھی طرح ادا کرنے پر انعام ملے گا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ سپاہی نے افسر کا کام کیا اور انعام پایا یا افسر نے سپاہی کی ڈیوٹی سرانجام دینے پر انعام پایا۔ اسی طرح مرد و عورت اجر میں برابر ہیں دونوں کا مالک ایک ہے لیکن تخلیقِ انسانی بتارہی ہے کہ ہر شخص کے کام کے نتائج اپنے ہیں۔ اگر کوئی خاتون ہے تو وہ خواتین کے ہی کام

بخوبی ادا کر سکتی ہے۔ جسے مرد بنایا ہے، اس سے وہی کام ہوں گے جو مرد کے ذمّے فطرت نے رکھے ہیں۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے چنانچہ جو استعداد اللہ نے کسی کو دی ہے، اُس کے مطابق ذمّہ داری نبھانے کا حکم دیتا ہے۔ خاتون کو مرد کے برابر حقوق دیے۔ دونوں اس بات میں برابر ہیں کہ دونوں اپنی اپنی ذمّہ داری پوری کریں۔ مرد سے وہ کام لیا جائے جو مردوں کے ذمّے ہے اور خاتون کو وہ ذمّہ داری دی جائے جو خواتین کے ذمے ہے۔ مرد کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جس کا وہ مستحق ہے اور عورت کے ساتھ اس احترام کا سلوک کیا جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ برابری کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سے وہ کام پوری دیانت داری سے لیا جائے جو قدرت نے اُن کے ذمے لگایا اور دونوں کو بغیر کسی تکلف کے ان کا حق دیا جائے۔ یہ اصل برابری ہے ورنہ تو انسان اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی برابر نہیں کر سکتا۔ کیا بڑی انگلی کاٹ دے گا کہ وہ چھوٹی کے برابر ہو جائے؟ دو آنکھوں کی نظر برابر نہیں ہوتی دو کانوں کی سماعت برابر نہیں ہوتی، سر کے سارے بال برابر نہیں ہوتے۔ دائیں اور بائیں ہاتھ کی قوت برابر نہیں ہوتی۔ تو ان میں برابری کیسے کریں گے؟ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا کام لیں اور بائیں ہاتھ سے دائیں کا کام لیں تو کیا یہ برابری ہو جائے گی؟ یہ آج کی تہذیبِ جدید نے نیا مسئلہ نکالا ہے کہ مرد اور عورت برابر ہیں۔ اُنہوں نے اس طرح کی برابری کو برابری کا نام دے کر نظامِ قدرت میں مخل ہونے کی کوشش کی ہے۔ ایسی مساوات عورت کو حقوق دیتی نہیں بلکہ یہ اس کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے عورت کو مرد کے برابر کیسے کیا ہے؟ یہ بھی بڑا عجیب دھوکا ہے کہ جو خاتون کی فطری ذمّہ داریاں تھیں اُسے تو کوئی نہیں بدل سکتا۔ بچے تو اسی نے پیدا کرنے ہیں کہ اس کو اللہ نے عورت بنایا، وہ قوت اور مزاج دیا۔ اس مساوات کے علمبرداروں نے یہ برابری کی کہ مرد کی ذمہ داریاں بھی اس پر ڈال دیں۔ اُسے یہ فریب دیا کہ تم بھی بازار میں نکلو، روزی کماؤ، تم مشقت کرو۔ اپنے کاموں کے علاوہ تم مرد کے کام بھی کرو، تم برابر ہو گئی! یہ کون سی برابری ہے؟ اگر برابری دینی ہے تو یہ دو کہ ایک بچہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہو، دوسرا مرد کے پیٹ سے پیدا ہو۔ اس برابری کا نعرہ لگانے والی قومیں اس وقت کہاں تھیں جب چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں بعثتِ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نورِ اسلام طلوع ہوا؟ آج حقوقِ نسواں کے علمبردار تو اس عہد میں عورت کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی تاریخ اس بات سے بھری پڑی ہے کہ بات بات پر عورتوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ ڈائن ہے، جادوگرنی ہے اسے جلا دو۔ اسے کھمبے سے باندھ کر نیچے لکڑیاں رکھ کر آگ لگا دیتے اور تماشا دیکھا کرتے۔ ہندوستان میں خاوند کے مرنے پر بیوہ کو اس کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا۔ اگر زندہ نہ بھی جلائی جاتی تو بھی بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہوتی۔ وہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کھانا دیا جاتا نہ اچھے کپڑے پہننے کی اجازت ہوتی اور نہ کوئی اس سے بات کرنا پسند کرتا۔

افریقہ کی سیاحت پر گئے ہوئے ایک سیاح کا سفرنامہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک جنگل میں پہنچا تو ایک بڑھیا گوشت پکا رہی تھی۔ اس نے مجھے پیش کیا کہ یہ بہت مزیدار سالن ہے اور یہ سب سے لذیذ بوٹی میں تمہیں دے رہی ہوں۔ لکھتا ہے، میں نے پوچھا یہ کس چیز کا گوشت ہے جو بڑے شوق سے پکا رہی ہو۔ وہ کہنے لگی ہمارے قبیلے میں ایک جوان عورت تھی جس کی چار پانچ سال پہلے شادی ہوئی مگر وہ بے اولاد رہی تو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا۔ شادی کے بعد والدین تو گھر آنے نہیں دیتے لہٰذا وہ جنگل میں چلی گئی میرے بیٹے اس کا شکار کر کے لائے تھے۔ یہ اس کا گوشت ہے اور یہ بوٹی جو تمہیں دے رہی ہوں یہ بازو کی مچھلی کی بوٹی ہے جو بہت لذیذ ہوتی ہے۔ چین میں بچی کو پیدا ہونے پر لوہے کے جوتے پہنا دیے جاتے تھے تاکہ یہ بڑی ہو کر چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے، ہماری محتاج اور غلام رہے۔ وسطی ایشیائی ریاستوں میں جس کا دل چاہتا عورتوں کو چھین کر پکڑ کر لے جاتا۔ یہ وہ قومیں ہیں جو آج حقوقِ نسواں اور برابری کے نعرے کی علمبردار بنی ہوئی ہیں! عورت کو انسانیت کا درجہ دیا ہی اسلام نے ہے۔ اسلام کہتا ہے جو چیز جس کام کے لیے تخلیق کی گئی ہے اس سے وہی کام لیا جائے۔ اس پر وہ بوجھ نہ لادا جائے جس کے لیے اسے نہیں بنایا گیا۔ جو جس کا حق بنتا ہے اس تک بلاتکلف پہنچایا جائے۔ اس کے حصول میں دونوں برابر ہیں، ایک سپاہی اور جرنیل برابر ہیں۔ سپاہی کو سپاہی کی تنخواہ بلاتکلف مل جائے اور جرنیل کو جرنیل کی بلاتکلف مل جائے۔ تو یہ اسلامی مساوات ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ جرنیل اور سپاہی کی تنخواہ برابر کر دی جائے۔ ایسا کوئی کرسکتا ہے؟

یہ سب دھوکا ہے، فراڈ ہے اور اس نے خاتون کو رسوا کر دیا ہے۔ عورت کی کیا عزت بچی؟ مغرب اور غیر مسلم اقوام کو چھوڑیں اپنے ملک کے اخبارات ورسائل دیکھیں۔ ہفت روزہ رسالوں کے سرورق اور تصاویر دیکھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید یہ قوم اپنی بیٹیوں کو نیلام کرنا چاہتی ہے۔ عورت کا معنیٰ ہے پوشیدہ، چھپائی گئی چیز، پردے میں رکھی گئی چیز۔ اب جو اخباروں کی زینت بن گئی وہ عورت کہاں رہی؟ ان ہی اخباروں میں اگلے روز پکوڑے بک رہے ہوتے ہیں، جوتے لپیٹ کر لے جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ برابری ہرگز نہیں ہے۔

فرمایا، یہ سارا نظام شب و روز کا سلسلہ، نر اور مادہ کی تخلیق گواہ ہے کہ فرمایا: اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ۴ بے شک تم لوگوں کی کوشش مختلف ہے۔ یہ سارا نظام اس بات پر گواہ ہے کہ تمہارا کردار بھی دو طرح سے ہے، بھلا ہے یا برا ہے۔ ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ بھلائی کا نتیجہ بھلا ہے اور برائی کا نتیجہ برا ہے۔ جس طرح رات کے نتائج کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ جب رات آتی ہے تو سارے حالات وہ پیدا ہو جاتے ہیں جن کا رات تقاضا کرتی ہے۔ اسی طرح دن کے نتائج کوئی نہیں بدل سکتا۔ دن ہے تو حالات اور موسم دن کے ہوں گے۔ لوگوں کی سوچ اور معمولات دن کے

ہوں گے۔ اسی طرح اگر کردار بھلا ہے تو سارا ماحول بھلائی کی طرف جائے گا، بہتری کی طرف جائے گا۔ اگر کردار برا ہے تو نتائج برے ہوں گے افکار برے ہوں گے۔ اللہ کریم نے نر اور مادہ پیدا کر کے انہیں کردار بانٹ دیا، اس کے نتائج بانٹ دیے۔ اب نر اور مادہ کے ملنے سے افزائشِ نسل رکھی، اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جس طرح رات اور دن کے نتائج نہیں بدل سکتے، مرد اور عورت کے فطری کردار نہیں بدل سکتے، اسی طرح کردار کے نتائج بھی نہیں بدل سکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی برائی کرے اور نتیجہ اچھا ہو! کوئی رہے تو رات میں اور یہ چاہے کہ روشنی دن کی ہونی چاہیے تو یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ بھی ناممکن ہے کہ دن میں کوئی یہ چاہے کہ پردہ رات جیسا ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا ہے۔ کوئی دن میں رات یا رات میں دن نہیں بنا سکتا اور نہ ہی مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر بنا سکتا ہے۔ اسی طرح انسانی کردار کے نتائج نہیں بدل سکتے۔ انسان اچھا یا برا کردار اختیار کر سکتا ہے لیکن اس کے نتائج نہیں بدل سکتا۔ کوئی یہ سمجھے کہ میں برائی کرتا رہوں گا لیکن نتیجہ اچھا آئے گا۔ یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح کوئی یہ سمجھے کہ نیکی تو کر رہا ہے لیکن نتیجہ نہیں ملے گا تو یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ برائی پر اچھے نتائج آئیں اور نیکی پر خراب نتائج آئیں یا وہ ضائع ہو جائے۔ فطرت کا جتنا نظام مذکور ہے اور جس کی قسم دی گئی ہے اس کی یہ مراد ہوتی ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جارہی ہے وہ اگلی بات پر گواہ ہوتی ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ کریم کے علاوہ کسی کی قسم کھائی جائے۔ اگر قسم کھانی پڑے تو اللہ کی قسم کھاؤ کہ وہ ہر بات پر گواہ ہے۔ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ یہاں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے وہ دلیل ہیں کہ بھلائی پر بھلا انجام نصیب ہوگا۔ برائی کا انجام برا ہوگا۔ سو انسان کو چاہیے کہ یقین کر لے اگر یہ برا سوچے گا، برا کرے گا تو اسے برا پیش آئے گا، برا نتیجہ نکلے گا۔ اگر بھلا کرے گا تو بھلائی پیش آئے گی۔

انسانی زندگی کا کمال دوسروں کے لیے زندہ رہنے میں ہے:

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ انسانی مزاج ایسا ہے کہ ہمہ وقت کچھ لینے کی فکر میں رہتا ہے کہ کہاں سے اُسے کیا ملے گا۔ اُس کے ہر کام کا بنیادی عنصر عموماً یہی ہوتا ہے کہ میں یہ کام کروں تو اس سے مجھے کیا ملے گا! میں فلاں سفر کروں تو اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا! فلاں شخص سے ملنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا! ملک میں انتخابات ہوتے ہیں تو عموماً یہی سوچ ہوتی ہے کہ اُس کو ووٹ دوں جس سے مجھے فائدہ ہو۔ یہ رویہ معاشرے کی ہر خرابی کی بنیاد ہے۔

اللہ کریم نے نظامِ کائنات کو کچھ دینے پر استوار کیا ہے، لینے پر نہیں۔ اس نظام کے تمام عناصر، سورج، چاند، ستارے، زمین، ہوا، پانی وغیرہ سب اپنی ذمہ داری پوری کر کے اللہ کی مخلوق کو کچھ دے رہی ہے، لے نہیں

رہی۔ یہ نظام ایسا ہے کہ ہر چیز کا مدار دوسری چیز پر ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی کرنیں چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک، آبی جانوروں سے لے کر پرندوں تک، انسانوں اور حیوانوں تک بلا تفریق روشنی اور تمازت پہنچاتی ہیں۔ اسی طرح چاند، دن اور رات، موسم، ہوائیں، گرمی سردی ہر چیز اپنے اثرات پہنچاتی ہے۔ اگر یہ بات سورج کے اختیار میں ہو کہ وہ سوچے کہ کسے روشنی دے تو اُسے کیا ملے گا تو کتنے لوگ روشنی حاصل کر پائیں گے؟ زمین اگر یہ رویہ اپنا لے کہ کتنے اجناس کس کو دے تو اُسے کیا ملے گا۔ ہوائیں، بادل، بارشیں الغرض تمام عناصر اس رویے پر آجائیں تو دینے کا نظام رک جائے اور سارا نظامِ حیات تباہ ہو جائے۔ اللہ کریم نے ان تمام عناصر کو یہ سوچنے کا اختیار نہیں دیا بلکہ اُنہیں اس بات پر پابند کر دیا ہے کہ وہ دینے پر کاربند رہیں بغیر یہ سوچے کہ کوئی بدلے میں کیا دے گا۔ اس سے نظامِ حیات رواں دواں ہے۔ انسان کو چونکہ نیکی اور بدی کے انتخابات کا اختیار دیا گیا ہے یہ اگر صرف لینے پر آجائے، دینا چھوڑ دے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو جائے۔ سو انسان کے لیے بھی بہترین راستہ یہی ہے کہ اس کی بنیادی سوچ یہ ہو کہ میرے عمل سے کسی کو کیا فائدہ پہنچے گا۔

فرمایا: فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی ۔۔۔ تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا۔ انسانی زندگی کا کمال یہ ہے کہ دوسروں کے لیے زندہ رہے۔ انسان سوچے کہ اگر اس نے کوئی علم حاصل کیا ہے تو اس سے دوسروں کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اگر اللہ نے اسے اقتدار دیا ہے تو اس سے اللہ کی مخلوق کو کیا فائدہ ہوگا۔ اللہ نے اُسے بڑا قبیلہ دیا ہے اس کے پاس ایک قوت ہے تو وہ اس سے اللہ کی مخلوق کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ فرمایا، وہ لوگ جو دوسروں کا بھلا سوچتے ہیں اور جو اُن کے پاس ہو اس سے خلقِ خدا کو فیضیاب کرتے ہیں۔ اُن کے پاس دولت ہو تو اسے دوسروں کی بھلائی پر خرچ کرتے ہیں، علم ہو تو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اقتدار و اختیار ہو تو عدل و انصاف اور تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان تو لینے کے لیے حریص ہے اس کا مزاج ہے کہ ہمہ وقت کچھ لینے کی فکر کرتا ہے؟ فرمایا: وَاتَّقٰی ۞ اور پرہیز گاری کی۔

اس کام کے لیے ایک ہمت چاہیے جو اللہ کے ساتھ ایک تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس تعلق کو تقویٰ کہتے ہیں۔ چونکہ عربی کے مقابلے میں اردو کا دامن بہت تنگ ہے لہٰذا تقویٰ کا معنی نیکی یا پرہیز گاری لکھ دیا جاتا ہے۔ تقویٰ دراصل ایک تعلق، ایک محبت کے رشتے کا نام ہے جس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ ایک خالق و مخلوق کا تعلق ایک عابد و معبود کا رشتہ، مالک و مملوک کا رشتہ ہے۔ بندے کا اپنے پروردگار سے بحیثیت بندہ ایک رشتۂ الفت بن جائے کہ وہ میرا مالک ہے، اس کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں۔ اس کی عطا کردہ نعمتیں اُس کی امانت ہیں لہٰذا ان نعمتوں کو میں اس کی مخلوق کی بھلائی پر خرچ کروں تاکہ وہ مجھ سے خوش ہو راضی رہے اور مزید انعام عطا فرمائے۔ اس کیفیت

کا نام تقویٰ ہے۔ اس تعلق میں ذرا سا بال آنے سے بھی پھر وہ ڈرتا ہے۔ فرمایا، جن لوگوں نے دینے کا رویہ اپنایا یہ وہ لوگ ہیں جن میں تقویٰ ہے۔ اس کے لیے تقویٰ چاہیے جس کا اللہ سے عبدیت کا، محبت کا رشتہ ہوگا اُسے اپنے معبود کی رضا مطلوب ہوگی اور اُسے راضی کرنے کے لیے وہ اس کی مخلوق کا بھلا چاہے گا۔ ورنہ ہر کوئی کچھ لینے کی امید پر کام کرتا ہے۔

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو لوگ امراء کو راضی کرنا چاہتے ہیں وہ اُن کے نوکروں کو بھی خوامخواہ انعام دیتے رہتے ہیں، اُن کی خوشامد کرتے ہیں۔ اُن کے بچوں کی بھی خوشامد کرتے ہیں۔ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اُن کا مقصد اُن امراء کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ جس کا تعلق اللہ رب العزت سے ہو وہ پھر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتا رہے گا۔ فرمایا، نظامِ حیات دینے پر استوار ہے اور یہ ایسا عجیب نظام ہے کہ جتنا اللہ کی راہ میں دیا جاتا ہے، اس سے زیادہ پیچھے سے آجاتا ہے، خلا پیدا نہیں ہوتا۔ نظامِ کائنات میں سورج کتنی روشنی بانٹتا ہے لیکن وہ کم نہیں ہوتی۔ کتنے بادل برستے ہیں لیکن بادل ختم نہیں ہوئے۔ کتنی آکسیجن لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن ہوا میں آکسیجن ختم نہیں ہوئی۔ زمین سے کتنا غلّہ، اجناس، پھل سبزہ اُگتا ہے اور اللہ کی مخلوق ہمہ وقت استعمال کر رہی ہے لیکن وہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ہی جنگل میں وہ جانور بھی رہتے ہیں جو شکار ہوتے ہیں اور وہ بھی رہتے ہیں جو شکار کرتے ہیں دونوں زندہ رہتے ہیں تو اللہ کا نظام ہے کہ جتنا کوئی خرچ کرتا ہے اللہ اُسے اتنا اور دے دیتا ہے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتا لیکن دینے کے لیے ایک حوصلہ چاہیے جو اللہ کے ساتھ تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ جسے تقویٰ نصیب ہوتا ہے وہ اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہے اور جتنی ہو سکے اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ وہ خلقِ خدا کے لیے مفید بن جاتا ہے جس طرح سورج کرنیں بانٹتا ہے اس طرح وہ برکاتِ الٰہی تقسیم کرتا ہے۔ ان تک جینے کے ذرائع پہنچنا آسان کرتا ہے لوگوں کو انصاف پہنچاتا ہے۔ بے بسوں بے کسوں کا مددگار بن جاتا ہے۔ کمزوروں کے لیے طاقت بن جاتا ہے، بیماروں کے لیے علاج کا سبب بن جاتا ہے سب کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ اس کی سوچ میں کتنا فرق آ گیا ہے کہ ہر بندہ تو کچھ پانے کی امید پر کام کرتا ہے۔ اس کیفیت کو پاتے ہی یہ سوچتا ہے کہ میں ہر کام محض رضائے الٰہی کے لیے کروں۔ اسے فرق نہیں پڑتا کہ دنیا کسے زیادہ مل رہی ہے، کون کتنی لے رہا ہے۔ ان باتوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کی مخلوق کے لیے مفید بن جاتا ہے۔ یہ تقویٰ کہاں سے ملتا ہے؟ اللہ سے یہ تعلق کیسے پیدا ہوگا؟ فرمایا: وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ اور نیک بات کو سچ جانا۔

فرمایا، یہ کیفیت اُسے نصیب ہوتی ہے جو سب سے خوبصورت بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ سب سے پیاری، سب سے سچی کھری اور بے عیب بات کون سی بات ہے؟ سب سے خوبصورت بات کہ اللہ کی ذات کیسی

ہے، اُس کی صفات کیسی ہیں یہ ایمان باللہ کہاں سے ملے گا؟ یہ ارشاد فرمائیں گے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی سب سے سچی اور خوبصورت بات وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم فرماتے ہیں۔ ذاتِ باری سے رشتہ، ذاتِ باری سے متعلق عقیدہ اور صفاتِ باری کے بارے نظریہ، جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں، وہ سب سے خوبصورت بات ہے۔ اللہ کی خوشنودی پانے کے لیے طریقے اور سلیقے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے۔ اللہ کی نافرمانی کن امور میں ہے اُن سے رک جانے کی تعلیم ارشاد فرمائی۔ یہ سب ارشادات دنیا کی خوبصورت ترین زبان، خوبصورت ترین لب ہائے مبارک، خوبصورت ترین ہستی نے ارشاد فرمائے۔ گویا ایمان باللہ ہو، اللہ کو مانتا ہو عظمتِ الٰہی کا اقرار کرے اور اللہ سے ویسا تعلق ہو جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تو یہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ ایسا بندہ پھر مخلوقِ خدا کو فیض پہنچاتا ہے۔ جب کہ عمومی طور پر ہر کوئی لینے کے درپے ہوتا ہے اپنے لیے لالچ میں پڑا رہتا ہے۔

فرمایا، میری مخلوق میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دینے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر کام اس نظریے سے کرتے ہیں کہ اس سے خلقِ خدا کا فائدہ ہو۔ یہ لوگ کام کے ہیں۔ جس کا رشتۂ الفت میرے ساتھ جڑ جاتا ہے وہ پھر دنیا کے لیے کام نہیں کرتا بلکہ میری رضا کے لیے کرتا ہے اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میری مخلوق پر شفقت کی جائے، اس سے اچھا برتاؤ کیا جائے۔ میرے بندے میری خوشنودی کے لیے میری مخلوق کو مستفید کرتے ہیں۔ ساری دنیا تو اپنی اجرت لیتی ہے لیکن میرے بندے میری رضا خریدتے ہیں۔ یہ بہت بڑی اجرت ہے! ایک بندے نے ایک کام کیا اور اس کی اجرت لے لی، اُسے روپے مل گئے، وہی کام ایک دوسرے بندے نے کر کے آخرت پالی، اللہ کی رضا پالی، جنت پالی تو دونوں کے نتائج میں کتنا فرق ہے! یہ سودا تو بہت اچھا ہے تو پھر لوگ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ اُن میں وہ تمنا وہ شعور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک خاص علم، ایک خاص درجے کی کیفیت، وہ نگاہ چاہیے جو دنیا و آخرت کو دیکھ رہی ہو جسے دنیا سے زیادہ آخرت کا یقین ہو۔ اس کے سامنے دنیا کا انجام ہو اور آخرت کا دوام دیکھ رہی ہو۔ پھر جب وہ انتخاب کرے تو ہر بات پر آخرت کا انتخاب کرے گی۔ یہ نگاہ، یہ کیفیت کہاں سے ملے گی؟ فرمایا، تقویٰ سے کہ جس کا تعلق ذاتِ باری سے استوار ہوگا اور اس کے دل میں انوارات و تجلیاتِ باری ہوں گی، برکاتِ نبوت ہوں گی تو اسے آخرت سامنے نظر آئے گی۔ یہ تجلیاتِ باری بوساطتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دلوں کو پہنچتی ہیں۔ یہ دنیا و مافیہا سے قیمتی چیز ہے۔ انہی برکات و کیفیات کے امین مشائخ کہلاتے ہیں اور اسلام میں پیری مریدی یہ ہے کہ پیر صاحب مرید کو معرفتِ باری کی کیفیت عطا کریں گے، تقویٰ سے آشنا کریں گے اور اس کا شعور سدھر جائے گا۔ اس کے لیے

آخرت اور رضائے الٰہی مقدم ہو جائے گی لہٰذا انہی کے حصول کے لیے زندہ رہے گا۔ یہی اصل کام تھا جس کے لیے پیر اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ مروجہ تصور کہ پیر صاحب دعا کریں گے تو بیٹا ہوگا، صحت ہوگی کاروبار چلے گا۔ یہ تصور ہندوؤں سے در آئے ہیں۔

یہ کتنی عظیم نعمت ہے جو مشائخ بانٹتے ہیں کہ کسی کو برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچائی جائیں۔ اس کے دل میں تجلیاتِ باری در آئیں اور اُسے تقویٰ نصیب ہو جائے۔ یہ ایسا آبِ حیات ہے کہ اس کا جسم موت سے گزر بھی جائے لیکن اس کا ہر سیل CELL اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ اس کی قبر بھی ذاکر ہوتی ہے۔ جس مٹی میں دفن ہوتا ہے وہاں سے بھی اللہ اللہ کی آواز آتی ہے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے انسان بھی اللہ کی عجیب مخلوق ہے کہ یہ آبِ حیات پی کے بھی مر جاتا ہے۔

آبِ حیات ایک افسانوی چشمہ ہے جو قصے کہانیوں میں ملتا ہے کہ جس سے پانی پینے والا ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اللہ کریم نے ایسی کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی ہے۔ بہر حال یہ افسانہ ہے۔ انسان کو برکات و تجلیات کا آبِ حیات مل جائے، یہ اس سے بھی مر جاتا ہے۔ ایسی عجیب بات ہے کہ اکثر لوگ اللہ اللہ سیکھنے آتے ہیں تو اُن کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انہیں کشف و مشاہدہ ہو جائے۔ ایسے بدنصیب ہیں کہ جہاں سے انہیں برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلم جیسی قیمتی دولت مل سکتی تھی وہاں سے دنیا طلب کر رہے ہوتے ہیں۔ کشف حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگوں پر رعب جما سکیں، اُن کا حال جان سکیں۔ یہ لوگ ہیں جو آبِ حیات پی کر بھی مر رہے ہیں لیکن ہم اُنہیں اللہ اللہ سکھاتے رہتے ہیں کہ یہ ہمارے ذمے ہے شاید کبھی اصلاح ہو جائے۔ یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ حصولِ رضائے الٰہی اور تقویٰ کی بجائے مقصد حصولِ کشف ہو۔ اگر تماشا ہی دیکھنا ہے تو ذرائع ابلاغ پر بڑے تماشے ہیں، دیکھتے رہو۔ اب تو فون پر بھی سب نظر آتا ہے۔ یہ شعبہ تو رضائے الٰہی کا ہے اور تقویٰ حاصل کرنے کا ہے۔ یہاں تین اوصاف ارشاد ہوئے ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور اس کا حاصل تقویٰ ہے یعنی دامنِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم تھاما، اللہ سے تعلق قائم ہو گیا، عقیدہ درست اپنایا اور برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیفیات پائیں تو تقویٰ حاصل ہو گیا۔ جسے یہ حاصل ہو گیا وہ مخلوق کے لیے پھر آبِ حیات کا چشمہ بن جاتا ہے۔

فرمایا: فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ تو اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔

فرمایا، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آسانیوں کے راستے کھول دیے جاتے ہیں جو زندگی بھر رضائے الٰہی پانے کے لیے کچھ دینے کے لیے زندہ رہا۔ اس کے پاس علم تھا، مال تھا عہدہ یا اختیار تھا جو بھی تھا وہ اللہ کی مخلوق تک اس

لیے پہنچاتا رہا تا کہ اللہ راضی ہو جائے ایسے لوگوں کے لیے کامیابی کی راہ آسان کر دی جاتی ہے۔ انہیں نیکی مزاجاً اچھی لگنے لگتی ہے۔ انہیں دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی، پُرسکون مزے کی زندگی ملتی ہے، اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے اور ان کی موت بھی پرسکون ہوتی ہے۔ ان کے لیے موت میں کوئی تکلیف ہے نہ برزخ میں بلکہ خوبصورت برزخ اور بہترین آخرت عطا ہوگی۔ اس لیے کہ ان کی زندگی رضائے باری کے حصول میں دوسروں کو کچھ دینے میں بسر ہوئی۔ ہر کام اسی نیت سے کیا کہ اس سے اللہ کریم راضی ہوں گے حتیٰ کہ اگر صاحبِ اقتدار تھے تو لوگوں کو اسی نیت سے انصاف اور تحفظ فراہم کیا۔ ووٹ لینے کی غرض سے نہیں۔ اگر آج ہم قومی معاملات میں یہ سوچ اپنا لیں کہ ووٹ دیتے وقت بھی یہ ارادہ کر لیں کہ اُس بندے کو دیں گے جس کو دینے میں اللہ کی خوشنودی ہو تو ملک میں کتنی بہتری آ سکتی ہے۔ ہر معاملے میں اللہ کی رضا کو مقصد بنا لیا جائے تو کتنی آسانیاں نصیب ہو جائیں۔ فرمایا، جنہوں نے خلقِ خدا کو فیض پہنچایا اُن کے لیے سارے راستے آسان کر دیے جاتے ہیں۔ انہیں نیک کام بھلے لگنے لگتے ہیں، برائی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

حدیث شریف میں ایک واقعہ ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ ایک خاتون اس لیے دوزخ جائے گی کہ اس نے ایک بلی پال رکھی تھی جسے کئی روز تک باندھے رکھا مگر اس کی خوراک مہیا کرنے میں لاپروائی کی۔ اُسے کھول ہی دیتی کہ وہ اپنی خوراک تلاش کر لیتی لیکن پرواہ نہ کی اور وہ بلی بھوکی پیاسی مر گئی۔ وہ عورت نیک اور پارسا تھی لیکن اس جرم میں وہ جہنم چلی جائے گی۔ اللہ کریم فرمائیں گے کہ تیری عبادت کا کیا فائدہ جبکہ تو نے میری ایک کمزور سی مخلوق پر اتنا ظلم کیا۔ ایک اور خاتون جس کا کردار صحیح نہیں تھا۔ وہ عابد و زاہد کیا ہوتی، وہ بدکردار تھی لیکن وہ جنت میں جائے گی۔ اس لیے کہ ایک دن وہ کسی کنویں کے پاس سے گزری تو اس نے ایک کتا دیکھا جو پیاس کا مارا ہوا کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس عورت نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر رسی بنائی اور اس سے اپنا جوتا باندھ کر کنویں سے چلو بھر پانی نکال نکال کر اس پیاسے کتے کو پلایا جس سے اس کی جان بچ گئی۔ فرمایا، یہ عورت جنت جائے گی۔ اللہ کریم اس کے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔ وہ نیک نہیں تھی لیکن ایک پیاسے کتے کو سیراب کیا تو بخشی گئی اور ایک پارسا تھی لیکن ایک بلی کو مار دیا وہ پکڑی گئی۔

فرمایا، جنت کا راستہ تو بڑا آسان ہے لیکن مزاجِ انسانی کو بنانا پڑتا ہے تو جو اللہ کی رضا کے لیے زندہ رہے وہ اگر مال دار ہے تو مال دے، حکمران ہے تو انصاف دے ڈاکٹر ہے تو دلجمعی سے علاج کرے۔ جس شعبے میں ہو دوسروں کی بھلائی چاہے اور اس لیے چاہے کہ اللہ کو خوش کرے تو ایسے متقی کے لیے سارے راستے آسان کر دیے جاتے ہیں۔ اس کی زندگی بھی آبرو سے گزرے گی موت بھی آسان ہوگی، برزخ بھی آسان ہوگی۔ اس کے لیے قیامت بھی آسان

ہوگی اور آخرت بھی آسان ہوگی۔ گویا ہر مشکل کا حل مل جاتا ہے، زندگی کے بھی سارے دکھ دور ہوجاتے ہیں۔ قومی امور بھی سدھر جاتے ہیں۔ بیماریاں اور قحط سالیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ اتفاق اور اتحاد نصیب ہوتا ہے، معاشرے میں امن قائم ہوجاتا ہے لوگوں کی زندگی آسان ہوجاتی ہے اور اُن میں تفریق ختم ہوجاتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہر بندہ اپنی ذمّہ داری خلوصِ دل سے، اللہ کی رضا کے لیے پوری دیانتداری سے ادا کرے تو ہر ایک کو اس کا حق مل جائے۔ جو ملازمت کرتا ہے وہ صرف تنخواہ لینے کی فکر نہ کرے بلکہ جس کام کی تنخواہ لیتا ہے اُسے سو فیصد دیانتداری سے بروقت اور درست کرے۔ جو مزدوری کرتا ہے وہ کام چوری نہ کرے بلکہ خلوص سے پورا کام کرے۔ اگر کوئی صاحبِ اختیار ہے، عدالت میں مجسٹریٹ ہے تو اللہ کے روبرو جوابدہی کو سامنے رکھ کر ہر مستحق تک انصاف پہنچانا اپنی ذمّہ داری سمجھے۔ اگر معاشرے میں ہر کوئی اپنی ذمہ داری پوری دیانتداری سے ادا کرنے کی فکر کرے تو کسی کا حق نہ رکے اور آئے دن حقوق کے مطالبوں کی جنگ نہ چھڑی ہو۔ کسی کے حقوق غصب نہ ہوں اگر ہر کسی کو احساسِ ذمّہ داری ہوجائے۔ پھر اللہ کریم کی رحمت بھی ہوگی اور یہی دہشت گردی روکنے کا صحیح علاج بھی ہے۔ جو حاکم ہو وہ تمام رعایا کے حقوق کا تحفظ کرے۔ ہر ایک اپنی اپنی سطح پر بااختیار ہے، حکمران ہے۔ کسی کی بات ملک میں سنی جاتی ہے، کسی کی شہر میں اور کسی کا اختیار محلے پر ہے جبکہ اپنے خاندان اور گھر پر تو ہر سربراہ کا حکم چلتا ہے ورنہ اپنے وجود پر تو ہر کوئی اختیار رکھتا ہی ہے جتنی کسی کے پاس حکومت ہے اتنی جوابدہی ہوگی۔ کامیاب وہی ہوں گے جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے اُس کی مخلوق کی خدمت کی ہوگی۔

مصائب کو دعوت دینے والے رویے:

فرمایا: وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَاسۡتَغۡنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡعُسۡرٰى ؕ﴿۱۰﴾ اور جس نے بخل اور لاپروائی کی۔ اور نیک بات کو جھوٹا سمجھا۔ تو ہم اُسے سختی میں پہنچائیں گے۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دینا نہیں چاہتے بس ہمہ وقت لینے پر تیار ہیں۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ جو میرے ذمّے ہے وہ نہ دوں جو دوسرے کے پاس ہے وہ بھی مجھے مل جائے۔ اس سے پھر معاشرے میں دھینگا مشتی شروع ہو جاتی ہے اور لوگ چھین کر کھانا شروع کر دیتے ہیں تو پھر من جانب اللہ غضبِ الٰہی وارد ہوتا ہے۔ اسی معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو بااختیار ہیں وہ جبراً لوگوں کا مال ضبط کرنا شروع کر دیتے ہیں جو بے اختیار ہے وہ بندوق لے کر گلیوں میں نکل جاتے ہیں، ڈاکو اور دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ جب ہم بخل کرتے ہیں یعنی کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتے یہاں تک کہ زائد از ضرورت چیز بھی نہیں دیتے تو سارا نظامِ زندگی بری طرح متاثر ہوتا

ہے۔ بخل بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً گھروں میں فریج آ گئے ہیں تو جو سالن بچتا ہے اُسے فریج میں رکھ دیا جاتا ہے حالانکہ گھر والے امیر ہیں اور دوسرے دن تازہ پکاتے ہیں۔ باسی کھانا شاید کوئی کھانا بھی پسند نہ کرے۔ وہ سالن تین چار دن فریج میں پڑا رہتا ہے پھر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اتنا نہیں کرتے کہ کسی غریب پڑوسی کو ہی دے دیتے۔ اگر پھینکنا ہی تھا تو کسی جانور کو کھلا دیتے۔ کسی ذی روح کے تو کام آ جاتا۔ کیا آج گھروں میں یہی نہیں ہو رہا؟ اس طرح کے بخل سے ہم شروع کرتے ہیں۔ پھر اس سے اوپر جائیں تو ذخیرہ اندوزی اسی بخل کی صورت ہے۔ لاکھوں ٹن گندم موجود ہے لیکن بازار میں قحط ہے۔ کہتے ہیں مہنگی ہوگی تو بیچیں گے۔ اسی طرح چینی، دالیں ہر چیز روک لیتے ہیں کہ مہنگی کر کے بیچیں گے۔ یہ لوگ دینا نہیں چاہتے دوسروں کا بھلا نہیں چاہتے۔ کسی کے پاس علم ہے۔ وہ مخلوق کو فائدہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ کسی کو کچھ پڑھا کر راضی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی بات بتا کر خوش نہیں۔ حاکم ہے تو محکوموں کا حق نہیں دیتا عدل اور انصاف نہیں کرتا، اپنی موج میں مست ہے۔ پھر عذاب کی مختلف صورتیں وارد ہوتی ہیں۔ چیزیں بازار میں موجود ہونے کے باوجود نہیں ملتیں۔ بندے کے پاس خریدنے کے وسائل ہیں پھر بھی چیز نہیں ملتی۔ ملک میں بجلی ہے لیکن ملتی نہیں ہے۔ ملک میں جب چراغاں کرتے ہیں تو ایک ایک عمارت پر سینکڑوں بلب جلتے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں لگے ہوتے ہیں۔ بجلی تو ہے ملتی اس لیے نہیں کہ بدانتظامی ہے۔ کوئی اپنی ڈیوٹی کرنے کو تیار نہیں ہے صرف تنخواہ لینا چاہتا ہے۔ ملک کے ایک صوبے میں لاکھوں من گندم بارش میں گل سڑ گئی کچھ چوہے کھا گئے اور اسی صوبے کے نواح میں لاکھوں لوگ بھوک سے مر گئے۔ حالانکہ وہ گندم انہی لوگوں کے لیے آئی تھی۔ اب جس کے ذمے اُن تک پہنچانا اور تقسیم کرنا تھا اُس محکمے نے یا عملے نے اپنی ڈیوٹی ادا نہیں کی اور وہ ساری گندم گل سڑ گئی یا چوہے کھا گئے۔ جن کے لیے آئی تھی وہ گندم کے دانے کو ترستے ہوئے مر گئے۔ یہی وہ حال ہے جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ:124) یقیناً اس کے لیے (دنیا میں) تنگی کی زندگی ہوگی۔ اسی حال کو روزی کا تنگ کر دیا جانا کہا گیا ہے۔ اس طرح سے بخل کرنے والے، لوگوں کے حقوق غصب کرنے والے پھر کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: وَاسْتَغْنٰى ﴿٨﴾ اور لاپروائی کی۔ بخل کرنے والا پھر لاپروا ہو جاتا ہے، بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ایسا بے حس ہو جاتا ہے کہ کوئی مرے یا جیئے، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُسے کوئی دکھ یا درد محسوس نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ فرمایا: وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿٩﴾ اور نیک بات کو جھوٹا سمجھا۔

اس کی لاپروائی اس حد پر جاتی ہے کہ پھر وہ اللہ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ پھر وہ دنیا کی سب سے اعلیٰ، سب سے خوبصورت سب سے پیاری بات کا انکار کر دیتا ہے۔ کہتا ہے میں نہیں مانتا۔ پچھلے دنوں ٹیلی وژن پر ہمارے دانشور بحث کر رہے تھے اور انہیں قوم سے یہ شکوہ تھا کہ ہماری قوم مسلمان

ہو کر علامہ اقبالؒ کی باتوں کو نہیں مان رہی، ہمارے سیاستدان قائداعظمؒ کے فلسفے کو نہیں مان رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں قائداعظمؒ کی باتوں اور علامہ مرحومؒ کے فلسفے اور باتوں سے اعراض کا دکھ ہے لیکن یہ قوم تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مان رہی وہاں قائداعظمؒ یا علامہ اقبالؒ کی بات کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ علامہ صاحبؒ کے کلام میں یہی کمال تھا کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے مفاہیم کو شعروں میں ڈھال دیا۔ علامہ صاحبؒ کو اللہ کریم نے یہ سعادت اور عظمت بخشی کہ اُنہوں نے اللہ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالی کو خوبصورت اشعار میں ڈھالا تو یہ علامہ صاحبؒ کے کلام کا کمال نہیں بلکہ اللہ کے کلام کا کمال ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالی کا کمال ہے۔ اللہ کے کلام کی صداقت اور حسن کی مثال کائنات میں نہیں ملتی جو اسے جھٹلا دیتے ہیں وہ علامہ صاحبؒ اور فرموداتِ قائدؒ کو کیا اہمیت دیں گے!

فرمایا، جس نے بخل کیا دوسروں کے حقوق اور وسائل روکنے کا سبب بنا وہ پھر مستغنی ہو جاتا ہے، لاپرواہو جاتا ہے۔ اُسے شرم آتی ہے نہ حیا آتی ہے۔ کوئی جیئے یا مرے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُسے اللہ کا خوف رہتا ہے نہ آخرت کا، اُسے اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرواہتی ہے نہ معاشرے یا حکومت کا کوئی خوف رہتا ہے۔ ہر بات سے لاپرواہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ جب اس نے دو جہانوں کی حسین ترین، خوبصورت ترین حقیقت کو جھٹلا دیا تو وہ کسی کی پرواکیوں کرے گا۔ اسے تو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے، فرمایا: فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝١٠ تو ہم اسے سختی میں پہنچائیں گے۔ ایسے شخص کے لیے ساری مصیبتیں آسان کر دی جائیں گی۔ اس کے لیے ساری مصیبتوں کے دروازے کھول دیں گے۔ ہر دکھ اس پر آجائے گا پھر اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ جو کام شروع کرتا ہے وہ مصیبت بن جاتا ہے۔ لذت حاصل کرنے کے لیے کھانا کھاتا ہے اس سے بیمار پڑ جاتا ہے۔ لطف اندوز ہونے کے لیے میٹھا کھاتا ہے شوگر بڑھ جاتی ہے۔ گرم بستر میں آرام کے لیے لیٹتا ہے پسینہ آتا ہے لقوہ ہو جاتا ہے چہرہ ہی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ زندگی میں پیسے اور چیزیں اکٹھی کرتا ہے اپنی عیش و آرام کے لیے لیکن وکیلوں اور ڈاکٹروں کو دینے پڑ جاتے ہیں۔ دولت اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے، کہیں پولیس والے رشوت میں لے گئے کہیں عدالتوں میں خرچ ہو گئی اور دکھ الگ ہوتا ہے۔ جائیداد اور گھر بناتا ہے تاکہ آرام پائے لیکن اس پر اولاد لڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی دوسروں سے چھینا جھپٹی کر کے ایک گھر بناتا ہے تو بہو، بیٹے گھروں سے نکال دیتے ہیں پھر دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ ہر طرف سے دکھوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ موت بھی سخت ہو جاتی ہے قبر میں بھی دکھ ملتا ہے، آخرت میں بھی تباہی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں تباہی کا راستہ آسان کر دیا جاتا ہے ان کا مزاج بھی ایسا کر دیا جاتا ہے کہ برائی اُسے پسند ہو اور نیکی سے اسے مستغنی کر دیا جاتا ہے۔

دنیا کا مال و دولت کام نہ آئے گا:

فرمایا: وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪ اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

بخل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس مال کے لیے اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، بہترین حقائق کو جھٹلاتا ہے اور محنت مشقت کر کے مال جمع کرتا ہے وہ اس کے کام نہیں آتا۔ دنیا میں بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دولت ہوتی ہے لیکن بیماری ٹھیک نہیں ہوتی۔ دولت ہوتی ہے لیکن عزت نہیں رہتی۔ وطنِ عزیز کی پون صدی پر محیط تاریخ میں ہم نے عجیب انقلاب دیکھے ہیں۔ ایسے حکمران بھی آئے جنہیں آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں وہ حکومت میں تھے تو لوگ عزت کرتے تھے۔ حکومت رخصت ہو گئی لیکن اُن کی عزت باقی رہی۔ پھر ایسے لوگ بھی اقتدار میں آئے کہ جب تک حکومت میں رہے لوگوں کو یاد رہے جب چلے گئے تو اُن کا نام تک یاد نہ رہا۔ لوگ بھول گئے کہ اس نام کا کوئی صدر یا وزیر اعظم کبھی گزرا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں بخل اور برائی بڑھتی گئی اور معاشرہ دین سے دور ہوتا گیا تو پھر ایسے لوگ اقتدار میں آئے کہ جب اقتدار سے ہٹے تو پیچھے پولیس نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ اشتہار لگ گئے چور چور! کمال ہے! پھر ایسے لوگ بھی آئے جنہیں اقتدار سے پکڑ کر سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اب ایسے ہیں جن کے پاس حکومت بھی ہے لیکن پیچھے پولیس بھی پھرتی ہے عدالتوں میں تاریخیں بھگت رہے ہیں۔ یہ تماشا پہلے کبھی دیکھا ہے کسی نے؟ اس بات کو رہنے دیں کہ کون سچا ہے، کون جھوٹا ہے، برا کون ہے بھلا کون ہے یہ اللہ ہی بہتر جانے لیکن یہ بات تو ہے کہ ملک کا سربراہ بھی ہے اور وہ مقدمے بھگت رہا ہے۔ آدھا ملک چور کہہ رہا ہے، آدھا ایماندار کہہ رہا ہے۔ ایسی حکومت اور اقتدار کا کیا فائدہ کہ ملک کا وزیر اعظم بھی ہو اور پیچھے پولیس بھی لگی ہو۔ ایک عام ڈاکو اور ملک کے سربراہ میں کیا فرق رہ گیا! یہ قوم کی حالت کی عکاسی ہے۔ فرمایا، جب سب سے خوبصورت بات کو جھٹلا دیتے ہیں لوگوں کے حقوق ادا نہیں کرتے، دینے کی بجائے لوٹنا شروع کر دیتے ہیں تو ہم اُن پر مصیبتوں کے، پریشانیوں اور ذلت کے راستے آسان کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دولت اُن کے کام نہیں آتی۔ انہیں دکھ پہنچتے رہتے ہیں۔ اُن کی موت بھی سخت ہو جاتی اور آخرت میں بھی وہ دولت اُن کے کام نہیں آئے گی۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ کتنا روپیہ پیسہ چھوڑ کر آئے ہو۔ وہاں یہ دولت فائدہ نہیں دے گی۔

دنیاو آخرت، اللہ کے قبضہء قدرت میں ہے:

فرمایا: إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ یقیناً ہمارے ذمہ ہے راہ دکھانا۔ اور بے شک آخرت اور دنیا ہماری ہی چیزیں ہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہمارے ذمے تو راہنمائی تھی راستہ بتانا تھا۔ یہ ہماری شان کو زیبا تھا۔ ہم نے انسان کو بھلا، برا کرنے کی قوت دی، اسے عقل وشعور دیا، احساس عطا فرمایا۔ اسے قلب جیسی نعمت عطا فرمائی۔ اس کے سامنے اپنی عظمت کے بے شمار دلائل بکھیر دیے جو حق تھے لیکن ان کے سب باوجود اس کے پاس اپنے انبیاءؑ بھی مبعوث فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائیں، گھر گھر بات پہنچائی تا کہ انسان کو جو راستہ منتخب کرنے کا اختیار دیا ہے اس میں راہنمائی ہو جائے۔ مگر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سب کچھ، یہ دنیا بھی اور آخرت بھی اللہ کے قبضہء قدرت میں ہے۔ انسان کو صرف انتخاب کی آزادی تھی کہ کس طرف جانا چاہتا ہے۔ اگر دوزخ کی طرف جانا چاہتا ہے تو دوزخ میں مرضی سے آگ کو دھیما نہیں کر سکے گا۔ جنت میں جانا چاہتا ہے تو وہاں بھی کسی کی کوئی نعمت چھین نہیں سکے گا۔ وہاں کسی کا کوئی بس نہیں چلے گا حالانکہ دنیا میں بھی یہ ایسا نہیں کرسکتا کہ جو دانہ کسی کے وجود کا حصہ مقدر ہے اُسے یہ روک سکے۔ وہ دانہ وہیں جائے گا۔ اس نے صرف اپنا کردار ظاہر کرنا ہے۔ جو لمحے کسی کی زندگی کے ہیں کوئی دوسرا چھین نہیں سکتا۔ اگر کوئی کرتا ہے تو اس کا اپنا ارادہ اور کردار اس کا اعمالنامہ مرتبہ کرتا رہے گا، ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے۔ انسان دنیا پر کوئی تصرف رکھتا ہے نہ آخرت پر کہ یہاں بھی وہی ہونا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور وہاں بھی وہی ہونا ہے جو اللہ کریم چاہیں گے۔ انسان کو صرف اپنا کردار ظاہر کر کے اپنے انجام کو پہنچنا ہے۔ اب اس کی مرضی کہ یہ دنیاو آخرت کی عزت، آبرو، سربلندی، آرام اور آسانیاں سمیٹنا چاہتا ہے یا دنیاو آخرت کے دکھ سمیٹنا چاہتا ہے۔ یہ فیصلہ انسان کا اپنا ہے۔ ورنہ دنیاو آخرت سب اللہ جل شانہٗ کے قبضہء قدرت میں ہے۔ سب فیصلے اس کے ہوتے ہیں اس کے سوا کوئی اپنا فیصلہ مسلط نہیں کرسکتا۔ اللہ کا نظام ہے کہ ہر ذرّہ جو ازل سے کسی وجود کا مقرر کردہ حصہ ہے اُس وجود تک پہنچتا ہے۔ کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔

وہ کسی غذا، کسی دوا، کسی پھل، کسی گھاس کے تنکے سے منتقل ہو کر جانوروں، پرندوں تک پہنچتے ہیں پھر گوشت، دودھ، مختلف غذاؤں کی صورت میں انسانوں تک پہنچتے ہیں۔ ہر ایک کو اس کا حصہ یقیناً پہنچتا ہے۔ یہ اللہ کا اٹل نظام ہے البتہ روکنے والا صرف روکنے کا ارادہ کرسکتا ہے۔ اگر وہ دوسروں کے لیے دس دکھ پیدا کرے گا تو یاد رکھے کہ اپنے لیے دس ہزار پیدا کر لے گا۔ دوسرے کو پریشان کرے گا تو اس سے دس گنا زیادہ پریشانی خود اسے گھیر لی گی۔ فرمایا، آخرت بھی ہمارے قبضہء قدرت میں ہے اور پہلا جہان یعنی دنیا میں بھی ہمارا ہی حکم چلتا ہے۔ جو اطاعتِ الٰہی اور اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ دیتے ہیں کیا وہ نظامِ کائنات پر قادر ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ سورج کو

طلوع وغروب کر سکتے ہیں؟ سورج کی دھوپ کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں؟ کیا ہواؤں کو چلا یا روک سکتے ہیں؟ کیا وہ بارش کو برسا یا روک سکتے ہیں؟ کیا وہ کھیتیاں اُگا یا روک سکتے ہیں؟ اسی طرح وہ لوگوں کے نظام کو بھی روک نہیں سکتے البتہ لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں اور خود مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو دوسروں کو رسوا کرنا چاہتے ہیں وہ خود رسوا ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آخرت میں بھی دکھ پاتے ہیں۔ انسان ایسی مخلوق ہے کہ زندگی میں بیماریاں تکلیفیں، بھوک افلاس بے عزتی ہر دکھ سہہ لیتا ہے۔ یہ محلوں میں زندہ رہتا ہے اور قید خانے کی کال کوٹھڑی میں بھی زندگی بسر کر لیتا ہے لیکن دوزخ کا عذاب سہنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے فرمایا: فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿١٤﴾ سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کیا۔

فرمایا، ہم تمہیں اس آگ سے ڈرا رہے ہیں جس کے شعلے بہت تیز ہیں۔ دنیا میں تو اطاعتِ الٰہی، اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیازی اور استغنیٰ اور لوگوں کے حقوق غضب کر کے شاید گزارا کر لو لیکن آخرت مشکل ہو جائے گی۔ وہاں تو ایسی آگ ہے کہ اس کا شعلہ بدن کو چھوتا ہے تو دل کی گہرائی تک ایک جیسی جلن ہوتی ہے۔ دنیا کی آگ اگر انگلی جلاتی ہے تو صرف انگلی کی کھال یا گوشت جلے گا لیکن وہ آگ اگر انگلی کو چھو جائے تو سارے بدن کے ہر سیل (CELL) کو اتنی جلن ہوگی کہ جتنی اس انگلی کو ہوگی۔ وہ ایسی شعلہ زن آگ ہے جو ہر سیل کو پہنچے گی۔ پھر یہ بھی نہیں ہوگا کہ صرف پاؤں آگ پر آ گیا بلکہ انہیں گندھک کے آگ کے لباس پہنائے جائیں گے یعنی اُن میں آگ لگی ہوئی ہوگی۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بیٹھنا ہوگا، کھولتے ہوئے پانی پینے ہوں گے، خون اور پیپ غذا ہوگی اور وہ زندگی دائمی ہوگی۔ وہاں موت ہوگی نہ ہی زندگی کا کوئی تصور ہوگا۔

اس چند روزہ زندگی میں یہ معمولی سی چھینا جھپٹی کر کے انسان کیوں آخرت برباد کرے! اللہ کریم فرماتے ہیں، ہم تمہیں آج ڈرا رہے ہیں، بروقت مطلع کر رہے ہیں۔ تمہیں صبح شام، رات دن بلایا جا رہا ہے۔ حقائق بتائے جا رہے ہیں، آج اُس شعلہ زن آگ سے ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ کتنی خوش نصیبی ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے، انسان کے پاس توبہ اور اصلاح کی فرصت ہے۔ صحت اور زندگی ہے اور کتنا کریم ہے وہ ربّ کہ اُس نے کوئی شرط نہیں رکھی کہ کتنا گناہ اور ظلم کر چکے کتنے معاف ہوں گے کتنے معاف نہیں کرے گا۔ وہ فرماتا ہے، جو کچھ بھی کر چکے ہو آج عہد کر لو کہ آئندہ نافرمانی نہیں کرو گے، توبہ کرو تو سب معاف کر دوں گا۔ اس آگ میں ہر کسی کو نہیں ڈالا جائے گا۔ فرمایا: لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾ اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

فرمایا، اس آگ میں کسی کو بلاوجہ نہیں پھینکا جائے گا لیکن جو بہت بڑے بدبخت ہیں 'شقی' بدنصیب کو کہتے ہیں، بدبخت کو کہا جاتا ہے اور اشقٰی مبالغے کا صیغہ ہے یعنی بہت ہی بڑا بدبخت۔ یہ بڑے بدبخت کون ہیں؟ فرمایا وہ

لوگ جنہوں نے اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا انکار کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ انکار دو طرح سے ہے ایک تو وہ ہے جس نے ظاہراً انکار کر دیا کہ میں مانتا ہی نہیں تو وہ کافر ہو گیا۔ یہ زبانی انکار بھی ہے اور عملی انکار بھی ہے۔ دوسرا انکار وہ ہے کہ ظاہراً کہا کہ بات سچی ہے بالکل ٹھیک ہے اللہ واحد ہے لاشریک ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں لیکن عمل اس کے خلاف کرتا ہے۔ وہ منہ پھیر کر چل دیتا ہے یعنی لاپروائی کرتا ہے۔ یہ دو باتیں ہو گئیں کہ ایک جس نے انکار کیا اور ایک جس نے انکار تو نہیں کیا لیکن پروا بھی نہیں کی۔ جو پیٹھ پھیر کر چلا گیا کہ اپنی مرضی سے کمائیں گے، سود لیں گے، رشوت لیں گے حرام حلال سب کھائیں گے۔ ایسا ماننا بھی ماننا نہیں ہے۔ سب سے بڑے بدبخت وہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد کردہ سب سے خوبصورت ترین بات کو جھٹلایا اور اس سے روگردانی کی منہ پھیر لیا یہ لوگ اس آگ کے گڑھے میں گریں گے۔ دنیا میں ان کے پاس بھی توبہ کی فرصت ہے، دعوتِ الٰہی موجود ہے، رحمتِ الٰہی منتظر ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کی کتاب، اللہ کے بندے دعوت دے رہے ہیں، پکار رہے ہیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے اس کام پر لگا دیا ہے کہ خود بھی اتباع کریں اور دوسروں کو بھی اتباع کی دعوت دیں۔

محض اللہ کو راضی کرنے کے لیے خرچ کرنے والے:

جس جلا دینے والی نہایت تکلیف دہ آگ کا ذکر ہوا ہے اس سے اللہ کریم اپنے بندوں کو بچا لیں گے۔ فرمایا:
وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس سے بچا لیا جائے گا۔

یہ بات بارہا عرض کی جا چکی ہے کہ اردو کا دامن عربی کے مقابلے میں بہت تنگ ہے اور تقویٰ کا ترجمہ پرہیزگار کر دیا جاتا ہے حالانکہ تقویٰ ایک کیفیت ہے۔ بندے کا اپنے ربّ سے جو عبدیت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رشتہ اتنا محبوب، اتنا پیارا، اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ بندہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا، کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے اس رشتے میں ہلکا سا بھی بال آئے۔ اس کیفیت کو تقویٰ کہتے ہیں۔ الاتقٰی مبالغے کا صیغہ ہے یعنی جو بہت زیادہ متقی ہوں گے جو اس رشتے کا بہت دھیان رکھیں گے۔ اُن لوگوں کو اللہ کریم اپنی ناراضگی سے، ہر طرح کے عذابوں سے، جہنم کی آگ سے محفوظ رکھیں گے۔ چونکہ جہنم کی آگ غضبِ الٰہی کا مظہر ہے تو جب اللہ کی رضا کو پا لیں گے تو غضبِ الٰہی سے محفوظ ہو کر جہنم سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ جنت رضائے الٰہی کا مظہر ہے لیکن فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے بلکہ رضائے الٰہی فی نفسہٖ مطلوب ہے۔ جنت اُسے ملے گی جس سے اللہ کریم راضی ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کریم سے محبت کرتے ہیں اور اس سے اپنا رشتۂ بندگی استوار کر کے پھر عمر بھر اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ تعلق

کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک دن رشتہ بن گیا اور انسان بے فکر ہو گیا بلکہ اُسے نباہنا پڑتا ہے۔ اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ جتنا کوئی قریبی رشتہ ہو اتنی اس کی زیادہ حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ دنیا میں کتنے پیارے رشتے ہوتے ہیں۔ والدین اور اولاد کا رشتہ کتنا پیارا ہوتا ہے لیکن اگر اولاد نافرمان ہو کر والدین کے لیے دکھ کا باعث بنے تو وہ پیار نہیں رہتا۔ لوگ پیار سے شادی کرتے ہیں میاں بیوی کا رشتہ بڑا پیار کا ہوتا ہے لیکن اُسے ساری عمر نبھانا پڑتا ہے۔ کوئی فریق اس میں کمی کر دے تو وہ بات نہیں رہتی۔ اسی طرح اللہ کریم کے ساتھ بھی رشتہ نبھانا پڑتا ہے ساری عمر دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی نافرمانی نہ ہو جائے گستاخی یا کوتاہی نہ ہو جائے۔ جو یہ رشتہ نبھاتے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ فرمایا: الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ جو اپنا مال دیتا ہے کہ پاک ہو۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دنیا کو، دنیا کے مال اور وسائل کو اللہ کی راہ میں اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ دامن پاک رہے۔ چونکہ محبتیں دو طرح کی ہیں۔ انسانی وجود مادّی ہے اور نفسِ انسانی چونکہ خود مادّی ہے لہٰذا اس کی مادّے کی طرف بڑی رغبت ہے۔ انسان کا دماغ مادّی ہے، نگاہ مادّی ہے، اعضا و جوارح مادّی ہیں۔ مادّی نگاہ جب مادّی چیزوں کو دیکھتی ہے، دماغ فوراً سوچتا ہے زبان چکھ لیتی ہے تو نفسِ انسانی مادّے کی طرف لپکتا ہے۔ اللہ کریم نے انسان کے لیے مادّی نعمتوں کا ایک بڑا جہان سجا دیا ہے، اسے منع نہیں کیا لیکن ایک چھوٹی سی پابندی لگائی ہے۔ اُسے سمجھایا ہے کہ ان نعمتوں کو استعمال کرنے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو اللہ کریم بتاتے ہیں۔ صرف اتنی سی پابندی ہے کہ اپنا حصّہ ضرور لو لیکن دوسرے کا نہ چھینو۔ اب انسان اس پابندی کو بھی برداشت نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ سب کا چھین لے۔ اس لیے کہ مادّی لذتیں اُسے محسوس ہوتی ہیں۔ ان سے بالاتر وہ لذّتیں ہیں جو روح محسوس کرتا ہے۔ مادّی لذتوں سے بالاتر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ روحانی لذّتیں چکھ سکے۔ قربِ الٰہی کی لذّت سے آشنا ہو، ذکرِ الٰہی کی لذّت محسوس کرتا ہو۔ یادِ الٰہی میں اسے لطف آتا ہو۔ اس کی دل میں وہ کیفیت ہو کہ رضائے الٰہی کی لذّت زبان کی لذّت سے زیادہ محسوس ہوتی ہو۔ قربِ الٰہی کی لذّت، مال و دولت یا رتبہ ملنے کی خوشی سے زیادہ محسوس ہو تو تب وہ اس طرف جائے گا۔ یہ ساری لذّت یہ کیفیات، مادّی وجود محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ روحِ انسانی کے اوصاف ہیں، یہ روح محسوس کرتی ہے۔ جس طرح زمین سے مادّی لذات پیدا ہوتی ہیں ویسے ساری روحانی لذات انبیاؑ کے دامن سے ملتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کریم نے سراجاً منیراً یعنی روشنیاں بکھیرنے والا عظیم سورج، بہت بڑا عظیم چراغ فرمایا ہے۔ پہلی امتوں کے انبیاؑ بھی سورج کی مثال تھے جو اپنی اپنی امتوں کے پاس، مخصوص وقت کے لیے تشریف لائے۔ اپنے اپنے وقت میں کرنیں بکھیریں اور پردہ فرما گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عالی پر ایسا سورج طلوع

ہوا جو ہمیشہ ہمیشہ اُفق اولی پر روشنیاں بکھیرتا رہے گا کبھی غروب نہیں ہوگا لہٰذا برکاتِ نبوت بھی قیامت تک جاری وساری رہیں گی۔ مسلمانوں میں پیری مریدی کا یہی تصور ہے اور شیخِ کامل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ شمسِ نبوت کی وہ روشنیاں ہمارے قلوب تک پہنچائے۔ ہماری روح اور قلب کو ان سے سیراب کردے۔ اس کے علاوہ شیخ کا کوئی کام نہیں ہے۔

تمام امور مالک الملک کے دستِ قدرت میں ہیں، اُس کا اپنا نظام ہے جو نیک پر بھی بیت رہا ہے اور بدکار پر بھی۔ صحت وبیماری، تنگی اور فراخی دونوں پر آتی ہے لیکن جب تعلق باللہ نصیب ہوتا ہے تو ان چیزوں کے اثرات بدل جاتے ہیں۔ بدکار کو معمولی سی تکلیف بھی آئے تو اُسے دکھ زیادہ ہوتا ہے جبکہ نیک پر بڑی تکلیف آجائے تو اُسے اس میں بھی لذّت ملتی ہے۔ وہ دنیوی نعمتیں جو دنیاداروں کے لیے باعثِ فخر ہوتی ہیں، اللہ کے یہ بندے اُنہیں اللہ کی رضا پر نچھاور کردیتے ہیں۔ فرمایا، یہ مال اس لیے دیتے ہیں تاکہ ان کا دامن پاک ہوجائے یعنی پاکیزگی دینے میں ہے، چھیننے میں نہیں ہے۔ اللہ نے نظامِ حیات کو دینے پر استوار کیا ہے اور یہ دینے پر رواں رہتا ہے۔ جو چیز دینے سے رک جاتی ہے وہ بے کار ہوجاتی ہے۔ جو درخت پھل دینا چھوڑ دے اُسے کاٹ دیا جاتا ہے حتیٰ کہ اگر اچھے کھیت فصل دینا بند کردیں بنجر ہوجائیں تو اس کی پروانہیں کی جاتی۔ اس کھیت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اسی طرح ہم جو جانور پالتے ہیں گائے، بھینس، دودھ دیتی ہے۔ جب دینا چھوڑ دیتی ہے ذبح کردی جاتی ہے۔ جب مکان تحفظ دینے کے قابل نہیں رہتا، دیواریں چھت مخدوش ہوجاتے ہیں، گرمی سردی سے حفاظت نہیں کرتا تو گرادیا جاتا ہے۔ جب انسان بھی کچھ دینے کے قابل نہ رہے تو نظامِ کائنات میں بے کار ہوجاتا ہے۔ فرمایا، اللہ کے بندے دینے والے ہوتے ہیں۔ حاکم ہیں تو عدل کرتے ہیں، جہاں ہوں وہاں کے فرائض ادا کرتے ہیں اور ذمہ داری سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ فرمایا: وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اور اس لیے نہیں (دیتا) کہ اس پر کسی کا احسان ہے جس کا بدلہ اتار رہا ہے۔

یہ لوگ اپنے فرائض تو ادا کرتے ہی ہیں کہ نہ دینے کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہے، یہ اس سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ اُن پر کسی کا حق نہیں بنتا جسے وہ دے رہے ہوتے ہیں۔ اب ہمارا سورج پر کیا حق ہے، کیا ہم سورج میں کوئی تیل ڈالتے ہیں؟ کوئی اس میں روشنی کرتے ہیں یا چندہ دیتے ہیں؟ کیا کرتے ہیں لیکن وہ روشنی دے رہا ہے۔ اللہ کریم نے نظامِ کائنات میں جو کچھ بنایا ہے وہ ہمیں دیے جارہا ہے حالانکہ اس کے ذمّے ہمارا کوئی حق نہیں بنتا۔ اسی طرح جو اللہ کے بندے ہیں وہ اتنے کریم ہوتے ہیں کہ وہ دوسرے سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ بدلے میں انہیں کچھ دے گا۔ جو ان کے ذمے ہے وہ تو کرتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر جو ان کے ذمّے نہیں ہے وہ بھی کرتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں دیتے کہ انہیں کسی کا بدلہ دینا ہوتا، وہ ان کی ذمہ داری نہیں ہوتی جو ضرور پوری کرنی ہو بلکہ وہ اس لیے دیتے ہیں کہ فرمایا: اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ بلکہ اپنے اعلیٰ وبلند پروردگار کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔

فرمایا، وہ اپنے عظیم ربّ کی رضا کو پانے کے لیے اس کی مخلوق کو دیتے ہیں الخلق عیال اللہ کہ مخلوق اللہ کریم کا کنبہ ہے۔ جب کوئی اس کی مخلوق پر رحم کرتا ہے تو اللہ کریم اس پر رحم فرماتے ہیں۔ جب مخلوق کے حقوق ادا کیے جائیں تو اللہ کریم مہربانیاں فرماتے ہیں اور جب مخلوق کی ادائیگی سے بڑھ کر مخلوق کی خدمت کریں تو پھر اللہ کریم بہت کرم فرماتے ہیں۔ خلقِ خدا کو دینے کا نام اسلام ہے۔ جہاں جہاں جس کی ذمہ داری ہے، وہ اس سے زائد کرے بڑھ کر دے، یہ اسلام ہے۔ ایک استاد تنخواہ لیتا ہے اُس نے جو مضمون پڑھانا ہے جتنے پیریڈ لینے ہیں وہ تو اس نے پڑھانے ہی ہیں۔ بچوں کو امتحان دلوانا ہے، جواب طلبی ہوگی کہ کوئی فیل کیوں ہوا۔ اگر وہ اس بات سے آگے بڑھ کر اُن بچوں کی اپنی اولاد کی طرح محبت سے خیر خواہی کرے اور دل سے چاہے کہ یہ بھی اچھا پڑھیں، کامیاب ہوں تو یہ مزید جو کرے گا یہ ''دینا'' ہوگا۔ اسی طرح جہاں جہاں کوئی ہے وہ جب اپنی ذمہ داری سے بڑھ کر خلقِ خدا کی بہتری میں اس لیے کوشش کرے گا کہ اللہ کریم مجھ سے راضی ہو جائیں تو یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ کریم جہنم اور عذاب سے بچالیں گے۔ آخرت کے عذاب چونکہ دائمی ہیں لہٰذا ان کے اثرات دنیوی زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ اگر آخرت بگڑ رہی ہو تو دنیا بھی بگڑ جاتی ہے۔ آج اگر ہم اپنا حال دیکھیں تو یہ شکوہ تو سب کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر مصیبتیں آرہی ہیں لیکن ہم اپنے کردار کو نہیں دیکھتے کہ ہم مسلمان ہونے کے باوجود چھیننے پر آگئے ہیں۔ دینے کی بجائے، حقوق روکنے والے بن گئے ہیں۔ اسی لیے آج یہ عالم ہے کہ ایک عام آدمی جہاں جاتا ہے لُٹ جاتا ہے۔ دکان پر جاتا ہے دکاندار اس سے دھوکا کرتا ہے۔ پولیس چوکی پر فریاد لے کر جاتا ہے وہ اس سے رشوت طلب کرتے ہیں، بے عزتی کرتے ہیں۔ عدالت میں جاتا ہے انصاف کی توقع رکھتا ہے لیکن دھوکا ملتا ہے۔ حکمرانوں سے حقوق پانے کی امید رکھتا ہے وہ اس کا مال لوٹ کر کھا جاتے ہیں۔ اسپتال علاج کے لیے جاتا ہے، ڈاکٹر سے شفقت کی امید رکھتا ہے وہ اس کے گردے نکال کر بیچ دیتا ہے۔ یہ کیا معاشرہ ہے؟ آج کوئی انسان خود کو اس مسلم ریاست میں محفوظ نہیں سمجھتا! ہم اپنی بات کریں دوسروں کو چھوڑ دیں۔ یہ اللہ کے عذابوں کی جھلک ہے۔ ہم اپنی آخرت بھول چکے ہیں ذمہ داری بھول چکے ہیں۔ ہم ایثار تو کیا کرتے ہمیں تو ذمہ داری بھول گئی۔ ہر شخص لینے کے لیے تیار ہے، لوٹنے کے لیے تیار ہے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ میرے ہونے سے کسی کو کیا فائدہ ہے۔ اللہ کریم نے توبہ کی بہت بڑی رعایت رکھی ہے کہ اصلاح کر لو تو گزشتہ گناہ معاف کر دیں گے لیکن گناہ ایسی مصیبت ہیں کہ یہ توبہ کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ فرمایا، متقی وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں، جو ان کے بس میں ہے دیتے ہیں اور اس لیے دیتے ہیں تا کہ اُن کو پاکیزگی حاصل ہو۔ اُن پر کسی کا ادھار نہیں ہوتا کہ ضرور دیں اور نہ وہ کسی بدلے یا انعام کی توقع پر دیتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں دیتے کہ اُن کی شہرت ہو، لوگ بڑا سخی سمجھیں یا اس لیے عبادت نہیں کرتے کہ لوگ پارسا سمجھیں۔ وہ ان باتوں سے مستغنی ہوتے ہیں اُنہیں لوگوں سے کچھ نہیں لینا ہوتا۔ وہ محض اللہ کریم سے امیدِ کرم رکھتے

ہیں۔ انہیں اللہ کریم کی بارگاہ سے لینے کی تمنا ہوتی ہے، اس کی رضا پانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی مخلوق کو اس لیے دیتے ہیں تا کہ وہ عظیم پروردگار، ان سے راضی ہو جائے۔ ان پر مہربان ہو جائے، اُن کی خطائیں معاف کر دے، اُن کی بھول چوک سے درگزر کرے۔ فرمایا: وَلَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾ اور وہ عنقریب خوش ہوگا۔ فرمایا، اللہ کریم عنقریب ان لوگوں کو اتنا دیں گے کہ ان کو راضی کریں گے کہ وہ 'بس بس' کہہ اٹھیں گے۔ ان پر اتنے انعامات ہوں گے، ان کی اتنی عزت ہوگی اتنے مرتبے عطا ہوں گے کہ انہیں سمجھ نہیں آ رہی ہوگی کہ اللہ کی عطا کو کیسے سنبھالیں۔ فرمایا، عنقریب وہ بہت راضی کیے جائیں گے۔ بہت خوش ہوں گے۔ انہیں ہر طرح کی تکلیف سے بچا لیا جائے گا۔ انہیں تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کب قیامت کا اتنا بڑا حادثہ ہو جائے گا۔ وہ اس کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ سنیں گے۔ جب سورج سوا نیزے پر ہوگا، زمین تانبے کی طرح تپ رہی ہوگی لوگ مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ یہ لوگ آرام سے ہوں گے انہیں پتا ہی نہیں ہوگا کہ کیا ہوا۔ فرمایا، یہ وہ لوگ ہوں گے جو میرے بندوں کو اس لیے دیتے تھے کہ ان کا دامن پاک رہے، اللہ ان سے راضی رہے اور کسی سے تعریف یا بدلہ نہیں چاہتے تھے۔ یہ صرف معاوضے میں اللہ کی رضا چاہتے تھے۔ اُن کو ان شآء اللہ بہت جلد اتنا دیا جائے گا کہ وہ اپنے ربّ کی عطا پر راضی ہو جائیں گے، بس بس کہہ اٹھیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان:

تمام مفسرینِ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان آخری آیات کا مصداق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، یہ اُنؓ کے حق میں ہیں۔ امتِ مرحومہ میں اس ایثار کی پہلی مثال سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے کہ آپؓ اُن لوگوں کو بھی دیتے جن سے ایذا پہنچتی تھی۔ جو انؓ کے لیے دکھ اور تکلیف کا باعث بنتے تھے اُن کی حاجات بھی پوری کرتے تھے۔ خلافت ملی تو ہر فرد کو اس کے حقوق ادا کرنے کا حق ادا کیا۔ اس سے بڑھ کر جو کچھ ہو سکتا تھا، کیا۔ تجارت کی تو اس سے دوسروں کی بھلائی کی یعنی آپ رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کی مخلوق کے لیے لٹاتے رہے، دیتے رہے عطا کرتے رہے۔ ان آخری آیات کی پہلی مثال امت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ آپؓ کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی تھی۔ آپؓ کی شان یہ بھی ہے کہ آپؓ کی چار پشتوں میں مسلسل شرفِ صحابیت ہے۔ آپؓ وہ واحد ہستی ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین راتیں غارِ ثور میں نصیب ہوئیں کہ صرف اللہ کریم تھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ روشنی جو قیامت تک آنے والے تمام دلوں کو روشن کرنے والی تھی، کر رہی ہے اور کرتی رہے گی وہ روشنی تین راتیں اور دو دن مسلسل صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قلبِ مبارک نے جذب کی اور حاصل کی۔ پھر اُن سے ایسی ہی توقع کی جانی چاہیے تھی کہ ان کی شان میں یہ آیات نازل ہوئیں اور آپؓ ان کی زندہ مثال تھے۔

سورۃ الضحیٰ رکوع 1 آیات 1 تا 11

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالضُّحٰی ① وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی ② مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ③ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ
لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ④ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ⑤ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا
فَاٰوٰی ⑥ وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ⑦ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ⑧ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ
فَلَا تَقْھَرْ ⑨ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ ⑩ وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ ⑪

آفتاب کی روشنی کی قسم ﴿۱﴾ اور رات (کی تاریکی) کی جب چھا جائے ﴿۲﴾ (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ (آپ سے) ناراض ہوا ﴿۳﴾ اور آخرت آپ کے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے ﴿۴﴾ اور آپ کو آپ کا پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے ﴿۵﴾ بھلا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی ﴿۶﴾ اور آپ کو جستجو میں پایا تو سیدھا راستہ دکھایا ﴿۷﴾ اور تنگدست پایا تو غنی کر دیا ﴿۸﴾ سو آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجیے ﴿۹﴾ اور مانگنے والے کو نہ جھڑکیں ﴿۱۰﴾ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہیے ﴿۱۱﴾

تفسیر و معارف

سورۃ ضحیٰ ان سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو مکی حیاتِ طیبہ میں نازل ہوئیں۔ یہ پوری سورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کریم کے بے پناہ انعامات کے تذکرہ سے پُر ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے وحیٔ الٰہی میں وقفہ آ گیا۔ پہلے مسلسل وحی آ رہی تھی پھر کچھ وقفہ آ گیا۔ مشرکینِ مکہ کی عادت تھی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف اعتراضات کرتے لیکن انداز سوالیہ ہوتا یعنی اعتراض کو

سوال کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ جب چند دن وحی نازل نہ ہوئی تو مشرکینِ مکہ کہنے لگے اب ان کے ربّ نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ ان کا ربّ ان سے خفا ہو گیا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

فرمایا: وَالضُّحٰى ﴿١﴾ آفتاب کی روشنی کی قسم۔ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴿٢﴾ اور رات (کی تاریکی) کی جب چھا جائے۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ﴿٣﴾ (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا اور نہ (آپ سے) ناراض ہوا۔

قرآنِ کریم میں جس چیز کی قسم دی جاتی ہے وہ بیان کیے جانے والے مضمون پر گواہ ہوتی ہے۔ یہاں اللہ کریم نے نظامِ کائنات کی دو حالتوں کو گواہ بنایا ہے۔ ارشاد ہوا، دن کی روشنی اور رات کی تاریکی اس نظام پر گواہ ہیں کہ دن ہوتا ہے تو ہر چیز کو روشن کر دیتا ہے لیکن ہمیشہ دن نہیں رہتا۔ اس کے بعد رات بھی آتی ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے رات آتی ہے اور چھا جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ تاریکی بڑھنے لگتی ہے اور جب مکمل طور پر تاریکی چھا جاتی ہے تو پھر چھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ پھر صبح ہو جاتی ہے۔

انسانی کفیات میں بھی یہ دو حالتیں آتی ہیں۔ انہیں اصطلاحاً قبض و بسط کہتے ہیں۔ کیفیاتِ قلبی رک جائیں یا ان کے محسوس کرنے میں کمی ہو تو حالتِ قبض ہے اور ان کا روشن ہو جانا، ترقی کرنے لگ جانا، کشادہ ہو جانا بسط ہے۔ قبض میں بھی عمل میں وہی استقامت ہوتی ہے۔ خلوص اور محنت و مجاہدہ بھی ہوتا ہے۔ قلبی کیفیات ویسی محسوس نہیں ہوتیں۔ جیسی پہلے محسوس ہوتی تھیں یعنی آدمی کے محسوس کرنے میں کمی آتی ہے، کیفیات میں کمی نہیں آتی، کیفیات بڑھتی رہتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ بچپن، لڑکپن، جوانی پھر بڑھاپا۔

ہر چیز تبدیل ہوتی ہے۔ زمین سے پہلے ایک چھوٹی سی کونپل پھوٹتی ہے پھر پودا بنتا ہے پھر درخت اور پھر وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر گر جاتا ہے۔ یعنی نظامِ کائنات اس پر گواہ ہے کہ چیزیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ واحد ذات، اللہ کریم کی ہے جو تمام تبدیلیوں سے پاک ہے۔ مخلوق کی خصوصیت ہے کہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جو اس کے محتاج ہونے کی دلیل ہے۔ سورج کی روشنی بھی اس بات پر گواہ ہے اور رات کی تاریکی بھی کہ جب چھا جاتی ہے۔ جب گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوتا ہے تو پھر صبح کی امید لگ جاتی ہے۔ سحر طلوع ہو جاتی ہے۔ حالات میں زیر و بم آتا رہتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ نہیں دیا اور نہ آپ سے خفا ہے بلکہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی شان سے نوازا ہے کہ اپنے کرم و احسان کا مظہر بنا دیا ہے۔ جوں جوں دن گزریں گے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی ہوتی رہے گی۔

مشرکین کا خیال بالکل غلط اور بودا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار نے تو آپ کو رہتی دنیا تک کے لیے رحمۃ للعالمین بنا دیا ہے۔ انہیں یہ بتا دیجیے: وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴿۴﴾ ''اور آخرت آپ کے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی مسلسل اور لامتناہی ہے:

ارشاد ہو رہا ہے کہ دنیا میں بھی ہمیشہ ہر آن ترقی ہوتی رہے گی اور جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی پہلے سے بھی زیادہ ہوتی چلی جائے گی۔ مسلسل جاری رہے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کریم کے انعامات لامتناہی ہیں۔ اللہ کی وحی کو ہی لیں۔ ایک روایت ملتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر پوری زندگی میں دس مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ نوح علیہ السلام جنہیں آدمِ ثانی کہتے ہیں اور آپ علیہ السلام نے چودہ سو سال عمر پائی۔ آپؑ پر پچاس مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر اڑتالیس مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ عیسیٰ علیہ السلام جوانی میں ہی آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔ آپؑ پر دس مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کا عرصہ تئیس برس ہے۔ ابتدائے نزولِ وحی سے لے کر وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ جس کا حاصل قرآنِ کریم ہے۔

وحیٔ الٰہی اصول بیان کرتی ہے۔ اصول کی تشریح، شرح انبیاؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنی زیادہ مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ اس کے باوجود قرآن میں صرف اصول بیان ہوئے۔ تشریحِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی۔ مثلاً اللہ کریم نے قرآن میں نماز یعنی صلوٰۃ کا حکم دیا لیکن قرآن میں یہ نہیں ملتا کہ کون سی نماز میں کتنی رکعتیں ہوں گی، اوقات کیا ہوں گے، رکوع وسجود کیسے کرنے ہوں گے، قیام میں کیا پڑھنا ہوگا، رکوع وسجود کی تسبیحات کیا ہوں گی؟ یہ تفصیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی اور متعین فرما دیا۔ یہ سب ارشادات وحیٔ الٰہی ہیں۔ انہیں وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ یعنی احکامِ الٰہی پر عمل کرنے کے لیے تفصیل جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا دی جاتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس کے مطابق سمجھاتے۔ اس وحی کی تلاوت نہیں ہوتی۔ اسے حدیثِ پاک کہتے ہیں۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات وحیٔ الٰہی ہیں اس لیے حدیث کا انکار قرآن کے انکار کے برابر ہے۔

قرآن کریم وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور مصحف میں یعنی کتابی شکل میں محفوظ ہے۔ تمام انبیائے کرامؑ اپنے اپنے عہد میں، خاص علاقوں میں مبعوث ہوئے۔ وہ خاص قومیں اور مخصوص لوگ تھے۔ اس دور کے لیے جتنے احکام کی ضرورت تھی اتنی وحی نازل ہوتی رہی۔ اصول نازل ہوئے اور انبیائے کرامؑ نے اس کی تشریح

فرمادی۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ساری انسانیت کے لیے آئے اور بعثت سے لے کر قیامت تک کے سارے زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے لہٰذا سب سے زیادہ وحی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ قیامت تک کے لیے تمام اصول ارشاد فرمادیے گئے۔ اس کی تفسیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام جزئیات ارشاد فرما دیں۔ اسی لیے اسلام، قیامت تک کے ہر سوال کا جواب اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ ہر مسئلے کا حل رکھتا ہے، ہر عہد کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ارشاد ہو رہی ہے کہ آپ کو ایسے ظاہری اور باطنی کمالات عطا فرمائے گئے ہیں جو خاص ہیں اور ہر آنے والا دن ہر اعتبار سے پہلے سے بہتر ہے۔ جہاں تک روحانی ترقی کا تعلق ہے تو بعثت عالی سے پہلے بھی حیاتِ مبارکہ کے ہر لمحے میں ترقی ہوتی رہی اسے ولایتِ نبوت کہتے ہیں۔ ہر نبیؑ کو ولایتِ نبوت نصیب ہوتی ہے۔ ولایت، اللہ کریم سے ایک خاص تعلق ہے۔ ایک کیفیت ہے جو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اپنی شان کے مطابق ہوتی ہے۔ ہر نبیؑ کو بعثت سے پہلے کے زمانے میں نصیب ہوتی ہے۔ جیسے قرآن نے یوں فرمایا ہے: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (القصص:22) ''اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے اور (قوتِ جسمانیہ اور عقلیہ سے) درست ہو گئے (تو) ہم نے ان کو حکمت اور علم (نبوت) عطا فرمائے۔'' موسیٰ علیہ السلام کے بارے آیا ہے کہ جب بالغ ہوئے تو انہیں ولایتِ نبوت عطا کر دی گئی حالانکہ بعثتِ نبوت تو ہجرت کے بعد، شادی کے بعد جب طور پر پہنچے تھے تو وہاں عطا ہوئی تھی۔ وہاں نبیؑ مبعوث ہوئے تھے۔ یعنی اس سے پہلے نبیؑ کو ولایتِ نبوت عطا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے تا آنکہ نبوت عطا ہو جاتی ہے۔ مبعوث ہو جانے کے بعد ہمیشہ درجات بڑھتے رہتے ہیں۔

قدرت کا قانون ہے کہ ایک شخص خود نیکی کرتا ہے تو ایک درجہ کی نیکی پاتا ہے۔ اس کے کہنے پر دوسرا نیکی کرے تو جتنی نیکیاں وہ کرتا ہے اتنا ثواب بتانے والے کو بھی ملتا ہے اور اس کا ثواب کم نہیں ہوتا۔ اللہ کریم اپنے پاس سے دے دیتے ہیں۔ اس قانون کے تحت حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات ہر لمحہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ بعثتِ عالی سے لے کر قیامت تک جہاں کوئی کلمہ پڑھے گا، اس کا بنیادی سبب ذاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اعمال کا درجہ اعلیٰ اور الگ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کے لیے مجاہدہ الگ! پہلے روز سے دین پھیلنا شروع ہوا، اللہ کی مخلوق بہرہ ور ہوئی۔ عبادات، اللہ سے تعلق ہے، ساری مخلوق کو جتنا ملا اس کا واحد سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور تمام مسلمانوں کے بہرہ مند ہونے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ ہے۔ فرمایا، جوں جوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھیں گے ترقی ہوتی جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا ہر لمحہ گواہ ہے کہ ترقی جاری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا سے پردہ فرما گئے لیکن کائنات میں کتنے لوگ اللہ جلّ شانہٗ کو سجدہ کرتے ہیں، فرمانبرداری اور اطاعت کرتے ہیں۔ یہ سب طاعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کردہ ہیں اور اس پر ترقی جاری ہے۔ ہر اذان کہنے والا، سجدہ کرنے والا، تلاوت کرنے والا، ہر حافظ، قاری، مؤذن سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر، کر رہے ہیں۔

ترقی کا عالم میدانِ حشر میں بھی جاری رہے گا۔ ایک طویل حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ میدانِ حشر میں کھڑے کھڑے جب لوگ گھبرا جائیں گے تو کہیں گے کہ حساب کتاب شروع ہو۔ جس نے جس ٹھکانے پر جانا ہے جائے۔ عرصہ محشر میں کھڑا ہونا آسان نہیں ہوگا۔ تھک کر حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں جائیں گے کہ آپؑ اللہ کریم سے عرض کریں کہ حساب کتاب شروع ہو۔ آپؑ معذرت کرلیں گے۔ مختلف انبیاؑ سے ہوتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں گزارش کریں گے۔ سب ہی معذرت کرتے جائیں گے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کریم کے حضور سربسجود ہو جائیں گے۔ اس وقت اللہ کریم کی طرف سے خاص کلمات تعلیم کیے جائیں گے۔ یہ کلمات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں اللہ کریم سے عرض کریں گے کہ قیامت کا حساب کتاب شروع ہو۔ عرض قبول فرمائی جائے گی اور حساب کتاب شروع ہوگا۔ یعنی عرصہ محشر میں بھی ترقی ہو رہی ہوگی۔ جنت کی روز افزوں ترقی تو خاص ہوگی! یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر دن پہلے دن سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔

امور، ہمیشہ اپنے انجام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جس کام کا انجام اچھا ہو وہ کام ہمیشہ اچھا ہوگا۔ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ امور کا انجام بہتر ہوگا۔ روحانی اعتبار سے ترقی ہوتی گئی اور مادّی اعتبار سے بھی ترقی ہوتی گئی۔ اس بوڑھے آسمان نے دیکھا کہ روئے زمین پر ایک ہستی تن تنہا، توحیدِ باری کا نعرہ لگا رہی ہے۔ سب سے پہلے زوجہء مطہرہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتی ہیں۔ خواتین میں سرفہرست، مردوں میں ابوبکر صدیقؓ اور بچوں میں حضرت علیؓ۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور مخالفت بڑھتی گئی۔ ہر قسم کے کفر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر اتحاد کرلیا۔ لیکن جتنا اہلِ مکہ روکتے گئے اتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ترقی کرتا گیا، پھیلتا گیا حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ کو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنا پڑی۔ گھر چھوٹا، صحابہؓ نے جائیدادیں چھوڑیں، دوست احباب، ماحول اور وطن چھوٹ گیا لیکن نتیجہ کیسا نکلا؟ ریاستِ مدینہ قائم ہوگئی۔ دنیوی اعتبار سے بھی ترقی ہوئی۔ ریاستِ مدینہ بنی تو کفار کی سازشیں شروع ہوگئیں۔ حملے شروع ہوگئے۔ ریاستِ اسلامیہ نے اپنا بھرپور دفاع کیا۔ دن بدن مضبوط ہوتے گئے۔ بات بڑھتے بڑھتے قبائل سے ریاستوں تک اور ریاستوں سے بڑھ کر اس عہد کی سپر پاور تک گئی۔ عہدِ نبوت میں پورا جزیرہ نمائے عرب ریاستِ اسلامی میں شامل ہوگیا۔ مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اور پورے

جزیرہ نمائے عرب پر ریاستِ اسلامی قائم ہوگئی۔ یہ ترقی بدستور جاری رہی عہدِ خلافتِ راشدہ میں معلوم دنیا کے نصف سے زیادہ حصّے پر اسلامی نظام نافذ ہوا اور دنیا نے اسلام کی چھاؤں میں سکھ کا سانس لیا۔ ریاستِ مدینہ سے ابتدا ہوئی اور آج تک دنیا میں جتنی اسلامی ریاستیں قائم ہیں۔ چھپن اسلامی ممالک ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں صحابہ کرام پہنچے۔ انؓ کے قدموں کی برکت ہے کہ اس زمین سے اسلام مٹایا نہیں جاسکا۔

آیہء کریمہ میں مسلمان کے لیے ایک پیغام:

گویا مسلمان کی خصوصیت ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملی ہے کہ وہ قلبی، روحانی اور مادّی طور پر ترقی کے راستے پر گامزن رہے۔ آگے بڑھے، پیچھے نہ آئے۔ ٹیکنالوجی میں، تعلیم وتعلم میں، کاروبار و روزگار میں قیامِ امن میں غرض زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتا جائے۔ اسی طرح عبادات میں، روحانی کمالات میں دن رات ترقی ہو۔ ترقی صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ اطاعت میں ہے۔ یہ ترقی برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہے اگر ہمیں نصیب نہیں ہو رہی تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم کہتے تو ہیں کہ ہم مسلمان ہیں لیکن عملاً دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاتھ سے چھُوٹ رہا ہے۔

آیۂ کریمہ پیغام دے رہی ہے کہ اسے ایک پیمانہ سمجھو کہ جہاں اسلام ہوگا، خلوص سے اتباعِ رسالت ہوگا وہاں روحانی ترقی تو ہوگی، مادّی ترقی بھی ہوگی۔ عدل وانصاف ہوگا تو امن وامان ہوگا، کفر مغلوب ہوگا۔ اسلام غالب ہوگا۔ آج ہمیں شکوہ ہے کہ کفر ہر طرف سے ہم پر غالب ہے۔ اس کی وجہ تلاش کی جائے تو بنیادی وجہ یہ ہوگی کہ ہم سے اتباعِ رسالت کا حق ادا نہیں ہو رہا۔ چونکہ ترقی کا وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو اگر ہمیں ترقی پانی ہے تو با اتباعِ رسالت ہی نصیب ہوگی۔

ترقی کیا ہے؟ ترقی سے مراد ہے اجتماعی طور پر انسانی زندگی ترقی کرے۔ امن ہو۔ آبرومندی ہو، آسانیاں ہوں۔ سب کے حقوق کی حفاظت ہو رہی ہو۔ جب مملکتِ اسلامیہ میں یہ ماحول ہو تو یہ نظریہ اور یہ کردار اتنا متاثر کُن ہوتا ہے کہ اردگرد والوں پر بھی غالب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقی ترقی ہے۔ جس کا وعدہ اللہ کریم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں۔

جب ہم مسلمان ہیں تو وطنِ عزیز سمیت پوری مسلم دنیا میں آنے والا ہر دن پہلے سے سخت کیوں ہے؟ بدامنی، دہشت گردی، ناانصافی بڑھ رہی ہے۔ اشیائے ضرورت کمیاب ہیں۔ عجیب وغریب بیماریاں ہیں۔ ہم دن بدن کیوں پیچھے جا رہے ہیں؟ حقیقی انداز میں اس کا تجزیہ کیا جائے تو بات ایک ہی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارا دعویٰ تو

مسلمانی کا ہے۔ہم اتباع کافروں کا کرتے ہیں۔شرعی داڑھی رکھنا پسند نہیں کرتے لیکن غیر مسلموں کی نقل میں داڑھی کے بالوں سے چہرے پر ڈیزائن بنالیتے ہیں۔جس طرح گویوں نے داڑھی کے ڈیزائن بنا رکھے ہیں۔مختلف فیشن کی داڑھیاں بنا رکھی ہیں۔یعنی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہیں کرنا۔کافر کی نقل کرنا ہے۔کتا پالنا بھی فیشن بن گیا ہے۔کسی حقیقی مقصد کے لیے نہیں پالتے۔اس لیے پالتے ہیں کہ کافر پالتا ہے۔اس کا نتیجہ ہم بھگت رہے ہیں۔ہم ترقی معکوس کر رہے ہیں۔دن بدن پیچھے جا رہے ہیں۔بیمار ہو جائیں تو دوائیں نقلی ہیں۔آٹا، چینی، دودھ، مسالے کچھ بھی خالص نہیں۔مصنوعی طریقے سے اگائی گئی سبزی، گوشت کے نام پر حرام گوشت، ٹھنڈی مرغی نقلی دودھ۔یہ سب تیار کرنے والے، انہیں بیچنے والے، حرام گوشت فروخت کرنے والے سب مسلمان کہلاتے ہیں! کوئی حکمرانوں کو کوستا ہے کوئی دکانداروں کو بُرا بھلا کہتا ہے، کوئی مُلاّ کا شکوہ کرتا ہے تو کوئی ڈاکٹروں اور استادوں کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی ہم سب ذمہ دار ہیں۔ہم نے خود دامانِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام چھوڑ دیا ہے۔ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے طرزِ حیات سے محروم ہو گئے ہیں اور یہ محرومی ہمیں دن بدن بربادی کی طرف لے جا رہی ہے۔

آیۂ کریمہ یہ پیغام دے رہی ہے کہ آج بھی بنی آدم میں سے کوئی انسان اگر بہتری چاہتا ہے تو صرف ایک ہی راستہ ہے۔ایک ہی طریقہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر لے۔عقیدہ وہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ہے۔اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں۔ایسا ہو گا تو لمحہ لمحہ بہتری نصیب ہو گی۔موت زندگی سے بہتر ہو جائے گی۔آخرت کی زندگی، برزخ سے بہتر ہو جائے گی۔برزخ، دنیا سے بہتر ہو گی یعنی دن بدن ترقی ہوتی چلی جائے گی۔

عطائے باری:

فرمایا: وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿٥﴾ "اور آپ کو آپ کا پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔" جب عطا کرنے والی ذات ربّ العالمین ہو اور انعام لینے والی ہستی محبوب ربّ العالمین ہو تو عطائے باری کا عالم کیا ہو گا! فرمایا، یہ دنیا دیکھے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار، تمام انعام عطا کرنے والا، اتنا دے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں گے۔اللہ کے قرب کی جو کیفیات ہیں ان کی سمجھ بھی ہر صاحبِ ایمان کو اس کے شعور کے مطابق ہی کچھ آ سکتی ہے لیکن دنیوی، ظاہری ترقی تو ہر مادہ پرست بھی دیکھ سکتا ہے کہ کہاں ایک ہستی صلی اللہ علیہ وسلم نے یکا و تنہا اسلام کا مشن شروع فرمایا اور کہاں اتنی بڑی ریاست پر اسلام نافذ کر دیا۔جہاں پہلے کبھی کسی ریاست کا تصور تک نہ تھا۔قبائل تھے جو علاقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ہر قبیلے کی اپنی حکومت تھی۔ہر ایک کے

اپنے قاعدے ضابطے تھے۔ ہر کوئی اپنی پسند سے جیتا تھا۔اس پر اسلام کا سورج طلوع ہوا اور چار دانگ عالم روشن ہو گیا۔ عہدِ نبوی کے بعد ربع صدی کے اندر اندر معلوم دنیا کا بیشتر حصہ اسلام کے قاعدے قانون میں ڈھل گیا۔اسلام عملاً نافذ ہوا۔ اللہ کی زمین تکبیر سے گونج اٹھی۔ تب سے اب تک کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں کہیں نہ کہیں اذان نہ ہو رہی ہو، قیام، رکوع و سجود نہ ہو رہا ہو، عبادات نہ ہو رہی ہوں۔ یہ سارا کارنامہ کس ہستی کا ہے؟ ایک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ نے ساری عطا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل مخلوق کو عطا فرمائی۔ اللہ کریم ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا عطا فرمائیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو بخشوا کر ہی راضی ہوں گے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کریم کے خاص انعامات:

فرمایا: اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۞ ''بھلا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیوی، مادّی اعتبار سے ہر طرح سے بے سہارا تھے۔ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یتیمی آ گئی۔ خاندان اعلیٰ تھا لیکن مالی اعتبار سے کوئی وسائل نہیں تھے۔ والدین کے بعد دادا نے سایہ عاطفت میں لیا لیکن ان کا بھی وصال ہو گیا۔ چچا ابو طالب نے محبت نچھاور کی۔ چچا خود مالی طور پر کمزور تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکپن سے اجرت پر بکریاں چرانا شروع کیں۔ جو ملتا وہ چچا کو دے دیتے۔ جب شادی ہوئی اور حضرت خدیجہؓ کے مکان پر رہنا شروع کیا تو چچا سے علیؓ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ اپنے ساتھ لے گئے۔ انہیںؓ پالا۔ گھر سے رشتہ دیا۔ رہنے کو گھر دیا۔ شفقتیں، محبتیں نچھاور کیں۔

اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کا احسان مند نہیں ہونے دیا۔ اپنی قدرتِ کاملہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کمالات دیے کہ جہان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا کر رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کبھی بے آسرا نظر آتے تھے، قیامت تک کے مساکین کا آسرا بن گئے۔ کبھی بے بس و بے اختیار نظر آتے تھے، قیامت تک کی انسانیت کے لیے اختیارات کا منبع بن گئے۔ اللہ کریم نے اس دُرِّ یتیمؐ کو وہ مقام، وہ ٹھکانہ دیا کہ قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا مقام و اختیار کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاستِ اسلامیہ کی نظیر اس سے پہلے کہیں تاریخ میں ملتی ہے نہ اس کے بعد ایسی بنی۔ تاریخِ عالم کے حکمرانوں کو دیکھ لیں۔ وہ قوموں کو جکڑ لیتے، ان پر قابض ہو جاتے، ان پر حکومت کرتے لیکن ان کے دلوں کو قابو نہ کر سکے۔ یہ عطائے ربِّ کریم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف مادّی اقتدار عطا ہوا، نہ صرف علاقے اور زمینیں اسلام کے زیرِ نگیں آئیں بلکہ ہر مومن کے دل پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکومت دی۔ مسلمان گناہگار سہی، بے عمل سہی لیکن اس کے دل پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت ضرور ہوتی ہے۔ وہ غلط کار و بے عمل ہو سکتا ہے لیکن

اس کا دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوتا ہے۔ نہ ہو تو مسلمان نہیں!

فرمایا، اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم پایا تو اپنی عطا سے وہ عظمتیں بخشیں جن کی مثال ہی نہیں!

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿٧﴾ ''اور آپ کو جستجو میں پایا تو سیدھا راستہ دکھایا۔''

نورِ نبوت کے اظہار کی بیقراری:

بعثت سے پہلے انبیاؑ کو ولایتِ نبوت عطا ہو جاتی ہے۔ وہی ان میں نورِ نبوت کی جستجو پیدا کر دیتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کے ضمن میں بہت خوبصورت بات لکھی ہے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ ان کی مدد فرمائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فطرت ہر چیز میں ایک تقاضا پیدا کرتی ہے۔ جب شاخ پر ایک کلی نکلتی ہے تو اس میں غنچہ بننے کی ایک تڑپ اور بیقراری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تڑپ اسے غنچہ بنا دیتی ہے۔ غنچے میں پھول بننے کی تڑپ ہوتی ہے تو وہ چٹک کر پھول بن جاتا ہے۔ اگر یہ جستجو نہ ہو۔ اگر قدرت یہ تڑپ نہ رکھے تو وہ کلی ہی رہ جائے۔ وہیں سوکھ جائے۔ نہ غنچہ بنے نہ پھول کھلیں، اسی طرح انبیاؑ کو بلوغت پر ولایتِ نبوت نصیب ہو جاتی ہے۔ نبیؑ میں نورِ نبوت کو پانے کی بیقراری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس جستجو کو یہاں فرمایا گیا: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا۔۔۔ ''اور آپ کو جستجو میں پایا'' یہی جستجو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حرا میں لے گئی تھی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلوت میں اللہ کو یاد کرتے رہتے۔ ایک ایسا معروف نوجوان جس کی عزت سارا معاشرہ کرتا ہو۔ جسے کفار و مشرکین صادق و امین کہتے ہوں۔ جو معاشرے کے ہر فرد اور ہر طبقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ لوگ اس سے اپنے فیصلے کرواتے ہوں۔ اس کے کہنے پر جنگیں ختم کر دیتے ہوں۔ میدانِ فساد میں قدم رکھ دے تو لوگوں میں صلح ہو جاتی ہو اور لوگ اپنے فیصلے اس ہستی پر چھوڑ دیتے ہوں تو وہ اپنی اہلیہ، اولاد اور معاشرے کو چھوڑ کر حرا کی خلوتوں میں کئی کئی دن گزارتا ہو؟ صلی اللہ علیہ وسلم!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر کی وہ بیقراری حرا میں لے جاتی تھی۔ یہ کیفیت نورِ نبوت کو پانے کی جستجو کی تھی۔ غنچے سے پھول بننے کی تڑپ کو، اس کیفیت کو یہاں فرمایا گیا: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿٧﴾ ''اور آپ کو جستجو میں پایا تو سیدھا راستہ دکھایا۔'' لفظ ضَآلًّا ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ بھٹکے ہوئے، گمراہ کے لیے بھی یہی لفظ ہے۔ گمراہی کو بھی ضلالت کہتے ہیں۔ صحرا میں ایک درخت پایا جاتا ہے اسے بھی ضَآلًّا کہتے ہیں۔ یہ درخت صحرا میں مخصوص جگہوں پر ہوتا ہے۔ لوگوں کو پتا ہوتا ہے کہ جہاں یہ درخت ہے اس کے قریب چشمہ ہوگا، آبادی قریب ہوگی۔ اس طرح انہیں راستہ مل جاتا ہے۔

تراجم میں اس کا ترجمہ ''گمراہ'' کیا گیا ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ پایا تو ہدایت دے دی۔'' یہ بڑا غلط ترجمہ ہے۔ اللہ پناہ دے۔ معاف فرمائے۔ یہ ترجمہ کرنے والوں کی ناسمجھی ہے یا کمزوری ہے۔ اردو ترجمہ کرنے والوں کی یہ غلطی ہے کہ اس لفظ سے ایسا ترجمہ کیا۔ یہ اردو دانوں کی کمزوری ہے کہ صحیح مفہوم کو ترجمے میں نہیں لا سکے۔ ترجمہ کرنا اس لحاظ سے بہت مشکل کام ہے کہ لفظوں کا ترجمہ لفظوں میں کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ الفاظ میں جو مفہوم ہے اسے منتقل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ترجمے کا حق تب ادا ہوتا ہے جب ترجمہ کیا جائے تو عربی الفاظ میں جو مفہوم ہے، اردو کے الفاظ اس مفہوم کو آگے پہنچائیں۔ اگر وہ مفہوم فوت ہو جائے تو الفاظ وہی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ الفاظ، حروفِ تہجی سے بنتے ہیں۔ ان حروف سے الفاظ بنا کر کسی کو دعا دی جاسکتی ہے اور برا بھلا بھی کہا جاسکتا ہے۔ الفاظ کی تو کوئی حیثیت نہیں کیونکہ وہ ابجد سے بنتے ہیں۔ اچھائی کا مفہوم ادا کرنا ضروری ہے۔ اسی ابجد سے الفاظ بنا کر کسی مفہوم کو الفاظ میں مقید کر لیا جاتا ہے۔

یہاں ترجمہ کرنے والوں سے مفہوم پہنچانے میں بھول ہوئی ہے کہ انہوں نے ضَآلًّا کا ترجمہ 'گمراہ' کر دیا۔ اگر یہاں لفظ متلاشی لکھ دیتے۔ جستجو میں پایا لکھ دیتے تو یہ دھوکا نہ لگتا۔ درست یہ ہے کہ آپ کو جستجو میں پایا، اس تڑپ میں پایا تو فَهَدٰى ﴿۷﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت سے سرفراز فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کے ہادی و راہنما بن گئے۔

فرمایا: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾ ''اور تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کریم کے خاص انعامات کا ذکر جاری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی وسائل نہیں تھے۔ دولت تھی نہ ہی افرادی قوت۔ دنیوی اعتبار سے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نعمتیں دیں اور اس قدر دیں کہ اقتدار و اختیار اور مال و منال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں کی دھول بنا دیا۔ ایسا انقلاب آیا کہ کفر کا سینہ شق کر کے عدل و انصاف کا نظام جاری کر دیا۔ کھرا اور صاف ستھرا عقیدہ اور خوبصورت کردار برآمد ہوا۔ کفر کی تاریکیاں چھٹ گئیں اور اسلام کا نور پھیلتا گیا۔ سلاطینِ عالم اور دنیا کے بادشاہوں کو بھی جھکنا پڑا۔ ایک عظیم الشان سلطنتِ اسلامی وجود میں آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارہ ابرو پر زمانہ کروٹیں لینے لگا۔

فرمایا: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾ سو آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجیے۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ اور مانگنے والے کو نہ جھڑکیں۔

یتیم، ان نابالغ بچوں کو کہا جاتا ہے جن کے والد جو پرورش کا ذمہ دار ہے کا سایہ سر سے اٹھ جائے۔ بچے

ہوں، قوتِ کار نہ ہو، وسائل نہ ہوں، بے آسرا ہو جائیں۔ اسی طرح جب ریاستِ اسلامی وجود میں آتی ہے تو اس میں بے شمار مخلوق بے آسرا اور بے سروسامان ہوتی ہے۔ اس ارشاد سے مراد یہ ہے کہ جو ریاست آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دی اس میں کسی بے بس و بے کس کو، کسی مجبور کو اس کی مجبوری پریشان نہ کرے۔ بلکہ ریاست کا کام ہے کہ ہر مجبور و بے بس کی دستگیری کرے۔ اس تک زندگی کے وسائل پہنچائے۔ صحت، تعلیم اور روزگار کے مواقع فراہم کرے۔ اس کی جان، مال، آبرو کا ہر طرح سے تحفظ کرے۔

یہ آیات اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی احکام کی بنیادی اینٹ رکھ رہی ہیں اور خطاب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم، دنیا میں حکمران ہوگا، اس کی ذمہ داری ہے کہ پوری ریاست میں کوئی فرد خود کو بے آسرا نہ سمجھے۔

یہ بنیادی احکام ہیں لیکن آج مسلم ممالک زبوں حالی کا شکار ہیں۔ حکمرانوں نے کس طرح ناروا اور ناجائز طریقے سے عوام کا مال لُوٹا، وسائل لُوٹے اور لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے، انہیں تب پتا چلے گا جب عرصہ محشر میں مالک الملک کے سامنے حساب دینا ہوگا۔ حقوق و فرائض کی جانچ ہوگی کہ کس طرح تم نے میری مخلوق کو اپنا غلام سمجھ لیا تھا؟ دنیا میں لوگوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ خاص سواری ہوتی ہے۔ اپنی برتری کا اظہار کرنے کے لیے سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں۔ لوگ ایمبولینس میں مر جاتے ہیں۔ مریض بلکتے رہ جاتے ہیں اور حاکم کی سواری گزرنے کے لیے کئی سو گاڑیوں کا قافلہ گزرتا ہے۔

اسلام، حکمران سے جھگی نشین تک سب کو ایک جیسی حفاظت دیتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا دین ہے۔ اس میں سب کی جان ایک جیسی قیمتی ہے۔ سب کا مال اور آبرو ایک جیسا اہم ہے۔ حکم ہے کہ کسی محتاج کو جھڑکا نہ جائے۔ اس کی ضرورت پوری کی جائے اس کا احترام بھی ہو، عزتِ نفس بھی بحال رہے۔ آج عوام سے بے جا ٹیکس لیے جاتے ہیں بلکہ عوام کو رہن رکھ کر کافر ممالک سے قرض لیا جاتا ہے۔ اس غیر ملکی قرضہ کا بوجھ بھی عوام پر ہی ہے۔ حکمرانوں نے اپنے پاس سے اپنی ذاتی ملکیت سے تو نہیں دینا۔ پھر عوام کے لیے اگر کہیں کوئی سڑک پائپ بنوا دیا جاتا ہے تو اس کا احسان عوام پر کیوں دھرا جاتا ہے؟

آج کے مسلمان کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ ہم خود اللہ کا در چھوڑ چکے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی امیدیں مخلوق سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ ہم سے اللہ کی بارگاہ چھوٹ گئی ہے۔ ہم نے مذہب کو ایک رسم کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ حلال، حرام کی پروا نہیں بلکہ اس کے جواز تراشتے رہتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ غلط کر رہے ہیں لیکن

دُنیوی ملامت سے بچنے کے لیے جھوٹے فتوے خرید لاتے ہیں۔ بندہ جانتا ہے کہ غلط کر رہا ہے اسی لیے تو فتوے خریدتا ہے کہ لوگوں کا منہ بند ہو جائے لیکن کیا بندے نے حساب لوگوں کو دینا ہے؟ کیا یہ خریدے ہوئے فتوے قیامت کو کام آئیں گے؟

آج مسلمان کی دعا یہ ہے۔ "دعا کر دیں، نماز پڑھا کروں، ذکر و تلاوت کیا کروں"۔ میں پوچھتا ہوں کبھی آپ نے یہ نہیں کہا کہ دعا کریں، میں صبح اٹھ کر کپڑے بدل سکوں، ناشتہ کر سکوں؟ دنیا کے سارے کام خود کر سکتے ہیں، کر لیتے ہیں، کسی دعا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دین کی باری آئے تو بات دعاؤں پر چلی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کی منظر کشی کسی شاعر نے یوں کی ہے:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم جانتے ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ ہیں۔ اطاعت اللہ ہی کی کرنی چاہیے لیکن ہم عزت، لوگوں سے چاہتے ہیں۔ لوگوں کی رائے میں اچھا بننا چاہتے ہیں۔ ہمیں کوئی غرض نہیں کہ عنداللہ ہمارے بارے کیا رائے ہے؟ جب ہماری امیدیں لوگوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ہم مال سے سہولتوں تک۔ عزت سے آبرو تک لوگوں سے مانگتے ہیں تو لوگ عزت بھی نہیں دیتے۔ مال بھی نہیں دیتے۔ اچھا بھی نہیں کہتے! اس لیے کہ جن سے ہم امیدیں رکھتے ہیں انہیں اپنا آپ اچھا کہلوانے کی فکر ہوتی ہے۔ جن سے ہم مال لینے کی امید رکھتے ہیں کہ ہمیں عزت دیں وہ خود اپنے لیے عزت تلاش کر رہے ہوتے ہیں کیوں نہ یہ سب کچھ اس بارگاہ سے لی جائیں جو واقعی منعمِ حقیقی ہے۔ جو نعمتوں کا مالک ہے، جو دیتا ہے جو دے سکتا ہے؟ کیوں نہ ہم امورِ دنیا کو اس طرح انجام دیں کہ میرا اللہ راضی ہو۔ کسی سے نیکی کر کے اس سے شکریہ کی امید بھی نہ رکھی جائے کیونکہ ہم اللہ کی اطاعت میں نیکی کر رہے ہیں دوسرے پر احسان نہیں کر رہے۔

یہاں قانون ارشاد فرما دیا کہ کوئی کسی بے بس کو نہ جھڑکے۔ یہ صرف فرد کے لیے نہیں یہ اسلامی ریاست کے لیے بھی ہے۔ آج کوئی مجبور شخص تھانے جاتا ہے۔ وہاں اس کی دادرسی تو کیا ہو؟ اس کی بے بسی پر ظلم کیا جاتا ہے۔ لوگ ڈرتے ہیں، عدالت نہیں جاتے کہ وکیل کی فیس، جج کے سامنے طویل پیشیاں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ سرکاری اداروں میں نیچے نیچے ہی کام ہو جائے۔ رشوت دے کر ہو جائے۔ حق تو یہ تھا کہ سائل مجسٹریٹ کا دامن پکڑ لے کہ میرا حق مجروح ہو رہا ہے۔ مجھے میرا حق دلایا جائے۔ لیکن یہاں تو اسے جھڑکا جاتا ہے۔ ڈرایا دھمکایا جاتا

ہے، مال بھی ضائع ہوتا ہے، ذلیل بھی کیا جاتا ہے اور وقت بھی برباد ہو جاتا ہے۔ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ فرد سے لے کر اداروں تک، حکمرانوں تک کے لیے قانون ہے کہ کسی محتاج کو حقارت سے نہ دیکھا جائے۔ اس کی توہین نہ کی جائے، اسے جھڑکا نہ جائے۔

یاد رہے! اللہ نے کسی شخص کو مخلوق کا محتاج نہیں رکھا۔ ہر شخص کو وہ خود دے رہا ہے۔ ہمیں آزمانے کے لیے اللہ نے بعض لوگوں کا رزق کسی دوسرے کے مال میں رکھ دیا ہے کہ ان تک پہنچا دو۔ جس کے پاس وسائل، مال یا اختیار ہے تو یہ اس کے لیے امتحان ہے کہ وہ دوسروں کا حق ان تک باعزت طور پر پہنچاتا ہے؟ مال اللہ کا ہے۔ بندے نے محنت سے کمایا ہے لیکن وہ مالکِ حقیقی کا عطا کیا ہوا ہے۔ مالک کی مرضی کے مطابق ہی تقسیم کرنے کا پابند ہے۔ حکم دیا جا رہا ہے کہ لوگوں کا حق انہیں باعزت طریقے سے دو۔ احسان نہ کرو اور بدلے میں کسی بات کی توقع نہ رکھو۔ اپنا معاملہ، اپنا اجر اللہ کریم سے رکھو وہ بہترین اجر دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ محتاج کو اس کی عزتِ نفس مجروح کر کے نہ دیا جائے۔ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی ایک عزت ہے۔ ایک مقام اور ایک وقار ہے جو اللہ نے ہر ایک کو عطا کیا ہے۔ ان حقوق کا لحاظ رکھا جائے۔ کوئی مانگے اور دینے والے کے پاس نہ ہو تو اچھے طریقے سے معذرت کر لے۔ نہ اسے حقیر سمجھے نہ جھڑکے نہ کوئی ایسی بات کہے جو دلآزاری کا باعث ہو بلکہ اخلاق کے ساتھ معذرت کر لے۔

یہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول ہیں کہ ہر فرد کے حقوق اور عزت کا تحفظ ہو۔ آج دنیا پر تقریباً چھپن اسلامی ریاستیں ہیں یعنی وہاں کے حکمران بھی خود کو مسلمان کہتے ہیں اور عوام بھی مسلمان ہیں تو ہم کیوں پریشان حال ہیں؟ ہم اس لیے تکلیف میں ہیں کہ ہمارا دعویٰ اسلام کا ہے، ہمارا کردار کافرانہ ہے۔ نتائج کردار اور عمل پر مرتب ہوتے ہیں محض زبانی کہنے پر نہیں! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دین کا دُنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں یہ کوئی نہیں بتاتا کہ دین پر عمل کرو گے تو دنیا کی عزت بھی ملے گی۔ آخرت تو بطورِ انعام ملے گی۔ اصل اجر، بدلہ یا ثواب وہ ہے جو دنیا میں نقد ملتا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ کہتے ہیں آخرت میں بدلہ، اجر اور ثواب ملے گا۔ اتنے محل اور اتنی حوریں ملیں گی۔ حالانکہ قرآن کے سارے اصول جب عملاً اپنائے جاتے ہیں تو دنیا کے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ یہاں تکلیفوں سے نجات ملتی ہے، سکھ ملتا ہے!

ہمارا دین سے ایسا واجبی سا اور عجیب سا تعلق ہے کہ ہر نیک کام کے لیے ہم دعا ہی کرواتے ہیں۔ کوشش، عمل اور خلوص کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ برائی خود کر لیتے ہیں۔ ذاتی کام خود کر لیتے ہیں۔ کوئی دعا کروانے نہیں جاتا!

دراصل ہمیں آخرت پر یقین نہیں۔ اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی امید نہیں۔ باپ دادا سے سناسنایا رسماً سا اسلام ہے کہ مرنے کے بعد دیکھا جائے گا۔

اس کے نتائج آج کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ آج بھی اس کا علاج ایک ہی ہے۔ ہم حکومت کو، پچیس کروڑ لوگوں کو نہیں بدل سکتے لہٰذا ان کو کوسنے کا کیا فائدہ؟ لوگوں کو بدلنا مشکل ہے اپنے آپ کو بدلنا آسان ہے۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہم لوگوں کے اور حکمرانوں کے ذمہ دار نہیں ہیں البتہ اپنے وجود کے ذمہ دار ہیں۔ ہم اسے کیوں نہیں بدلتے؟ ہماری ذات پر تو ہمارا اختیار ہے، اپنے گھر پر تو ہمارا اختیار ہے۔ ہم اپنے آپ کو اسلام کے ضابطے میں لائیں۔ اپنے گھر کے معاملات کو اسلامی کرلیں۔ اگر ایک فرد اپنی ذات کو اسلام کے مطابق ڈھال لیتا ہے تو اللہ کریم اس کی حفاظت اس طرح فرماتے ہیں جس طرح ابراہیم علیہ السلام کی آگ سے حفاظت فرمائی۔ سارا معاشرہ دکھی ہو۔ وہ شخص سکھی رہتا ہے جو اپنے آپ پر اسلام نافذ کرتا ہے۔ آج کافر معاشرہ اسلام کے اصول اپنا کر دنیوی امور میں ترقی بھی کر رہا ہے اور امن وسکون بھی پا رہا ہے۔ ان قوموں نے ناپ تول پورا رکھنا، لین دین میں دیانت، لوگوں کے حقوق کا تحفظ۔ بے روزگاروں کو وظیفہ، علاج معالجہ کی سہولیات، بچوں کی تعلیم کی سہولیات، یہ سب کچھ اسلام سے لے لیا۔ اس کو اپنا لیا تو اس کے دنیوی نتائج، دنیوی برکات انہیں مل رہی ہیں جیسے ایک پیاسا ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو کافر ہو تب بھی اسے راحت ملتی ہے۔ پیاس بجھتی ہے۔

مومن کو ان اصولوں کو اپنانے سے صرف دنیوی سکھ ہی نہیں ملتا اس کی آخرت بھی سنورتی ہے۔ مومن کو الحمدللہ کہنے کا، اللہ کا شکر ادا کرنے کا اجر بھی ملے گا اور کافر کو صرف دنیا کی راحت ملے گی۔ ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہمیں آج یہ سکھ اور راحتیں کیوں نصیب نہیں؟ یہ مقامِ فکر ہے!

اللہ کی نعمتوں کا زبان سے اور حال سے اظہار:

فرمایا: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿11﴾ ''اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہیے۔'' اس سے مراد یہ ہے کہ بندے کی زبان سے بھی اللہ کا شکر ادا ہو اور بود و باش سے بھی۔ تمہاری ظاہری حالت بھی یہ بتائے کہ تم پر اللہ کا احسان ہے۔ اصول یہ ہے کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرو گے تو فضول خرچی ہے جو حرام ہے۔ اپنی حیثیت سے کم درجے پر بود و باش رکھو گے تو یہ ناشکری ہے لہٰذا گھر، گاڑی، رہائش، لباس اور ضروریاتِ زندگی پر خرچ ایسا ہونا چاہیے جیسی اللہ نے بندے کو حیثیت دی ہو۔ اس میں بھی نمود و نمائش اور فخر و غرور نہ ہو۔ اللہ کی نعمتوں کے شکر کا اظہار ہو۔

صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین پر تنگی اور فراخی دونوں ادوار گزرے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں صحابہ کرامؓ نے ازحد سختیاں برداشت کیں۔ ایذائیں برداشت کیں، مال و دولت نچھاور کیا، ہجرت کی، جائیداد چھوڑی، مہاجر ہوگئے۔ ریاستِ اسلامی بنی تو جانیں پیش کیں۔ کچھ شہید ہوئے کچھ غازی بنے۔ وہ دور عسرت کا دور تھا۔ اس تنگی کو صحابہ کرامؓ کبھی خاطر میں نہ لائے اور اسلام کے ہر حکم پر عمل کرتے رہے۔ جب ریاستِ اسلامی میں فتوحات کا دور آیا تو مدینہ منورہ کی گلیوں میں مال و دولت کے ڈھیر لگ گئے۔ انہی صحابہ کرامؓ کے بڑے بھاری وظائف مقرر ہوگئے۔ وہ جنہیں نانِ جویں دستیاب نہیں ہوتا تھا وہی حضرت علیؓ انتہائی مالدار ہوگئے۔ خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی زندگیاں قرآن کے مطابق تھیں۔ جب تنگ دست تھے تو ان کے حال سے تنگ دستی ظاہر ہوتی تھی۔ جب امیر ہوگئے، فراخی آ گئی تو فراخی کے مطابق زندگی بسر کی۔ رہائش، لباس، خوراک، ہر چیز سے اللہ کی نعمتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ اللہ کی عبادت میں نہ تنگی اور تنگ دستی آڑے آئی نہ امیری اور خوشحالی نے غافل کیا۔

یہی ارشاد ہو رہا ہے کہ جو نعمتیں اللہ نے دی ہیں ان پر اللہ کا شکر بجالاؤ۔ زبان سے شکرِ نعمت کرو لیکن فخر کے لیے نہیں۔ علم دیا ہے تو دوسروں میں تقسیم کرو۔ دولت دی ہے تو دوسروں کو بھی سہولتیں دو۔ حکومت ملی ہے تو عدل کرو پتا چلے کہ اللہ کریم نے اسلام کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور تمہاری نشست و برخاست سے پتا چلے کہ اللہ نے تم پر مال دنیوی میں کتنا فضل کیا ہے!

سورۃ الم نشرح رکوع 1 آیات 1 تا 8

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ② الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑤ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ⑦ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ⑧

کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا ﴿۱﴾ اور آپ پر سے آپ کا بوجھ بھی اتار دیا ﴿۲﴾ جس نے آپ کی پیٹھ توڑ رکھی تھی ﴿۳﴾ اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا ﴿۴﴾ ہاں ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے ﴿۵﴾ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے ﴿۶﴾ پس جب آپ فارغ ہوں تو محنت (عبادت) کیا کریں ﴿۷﴾ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کریں ﴿۸﴾

تفسیر و معارف

سورۃ اَلَمْ نَشْرَحْ ان سورتوں میں سے ہے جو مکّی حیاتِ مبارکہ میں نازل ہوئیں یعنی اس کا شمار مکّی سورتوں میں ہوتا ہے۔ اس سورت میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والے انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمتِ شان:

فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① "کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا۔" سینہ کھول دینا یا شرحِ صدر قرآن کی ایک اصطلاح ہے۔ یہاں استفہامیہ انداز میں فرمایا گیا کہ کیا ہم نے آپ کا سینہ وسیع نہیں کر دیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کی وسعت کیا ہے، یہ وہ جانے جس نے اسے وسعتیں دیں یا وہ جانیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کا سینہء اطہر ہے۔ ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ یہ ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں!

انسان کے پاس حصولِ علم کے دو ذرائع ہیں ایک ماڈی دماغ دوسرا روح۔ انسان کا وجود ماڈی ہے۔ ماڈی ضرورتوں کا ادراک کرنا۔ گرمی سردی کا احساس کرنا، بھوک پیاس کا احساس کرنا۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے ذرائع تلاش کرنا۔ ان ماڈی ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع جاننا اور ان کے لیے اسباب مہیّا کرنا۔ یہ سارا کام دماغ کا ہے۔ لیکن انسان صرف ماڈی وجود نہیں ہے۔ ماڈی وجود ایک آلہ ہے جس سے وہ کام لیتا ہے۔ اصل انسان روح ہے۔ اس ماڈی دنیا میں قیام کے لیے، اس دنیا کو استعمال کرنے کے لیے اس آلے کی اتنی زیادہ ضرورتیں ہیں کہ ان کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے اللہ کریم نے انسان کو اتنا اعلیٰ دماغ دیا ہے کہ آج انسان ماڈی ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ دنیا کے جس حصے میں جب چاہیں بات کر سکتے ہیں۔ دنیا میں کہیں کوئی واقعہ رونما ہو ہم یہاں بیٹھے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کی خبریں چھوٹے چھوٹے موبائل فون کی سکرین پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اگر اتنا عالی شان دماغ، ماڈی وجود کی ضرورتوں کے ادراک اور ان کی تکمیل کے ذرائع کے لیے عطا فرمایا ہے جو محض ایک سواری ہے جو روح کے دنیا کے قیام کرنے، دنیا کو استعمال کرنے کے لیے ہے تو جو اصل انسان ہے اس کی غذا دوا کے لیے کتنا اعلیٰ انتظام ہوگا! یہ ماڈی وجود ماڈے سے ہے اور روح عالمِ امر سے ہے۔ کہاں ماڈے کی ایک ادنیٰ صورت، کہاں عالمِ امر کی روح! جتنی عظمت روح کو حاصل ہے اتنی اس کی فضیلت ہے، اتنی ہی اس کی ضرورتیں بھی اعلیٰ، نازک اور حساس ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے بھی بڑی حساسیت کی ضرورت ہے۔

شرحِ صدر کا تعلق روح سے ہے:

بدن کی ضرورتوں کے احساس کے لیے اللہ کریم نے دماغ عطا فرمایا ہے تو روح کی ضرورتوں کے ادراک کے لیے قلب عطا فرمایا ہے۔ قلب ایک لطیفہء ربانی ہے جو ماڈی دل کے اندر ہے۔ جس قدر لطیف روح ہے اسی قدر لطیف اس کا نظام ہے۔ جس طرح روح دماغ سے زیادہ نازک، پاکیزہ اور لطیف ہے اسی طرح لطیف تر، پاکیزہ تر اور حساس تر قلب ہوگا! دماغ صحیح نہ ہو تو بدن کی ضرورتوں کا ادراک نہیں کرتا اور قلب بگڑ جائے تو روح کی ضروریات کا احساس کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اصطلاحاً اسے کہا جاتا ہے 'سینہ تنگ ہو جانا' اس کے مقابلے میں جب قلب زندہ ہوتا ہے، کام کرتا ہے، روح کی ضروریات کا ادراک کرتا ہے، ان کی تکمیل کے ذرائع جانتا ہے تو اسے اصطلاحاً 'شرح صدر' کہتے ہیں۔ یعنی سینہ وسیع ہو جانا۔ اس سے مراد جسمانی طور پر سینہ فراخ ہو جانا نہیں۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے۔

انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ دماغ بھی صحیح ہو اور قلب بھی درست ہو۔ تا کہ ماڈی اور روحانی ضرورتوں کا ادراک کرے۔ اگر قلب روح کی ضرورتوں کا ادراک کر رہا ہے اور دماغ بھی درست ہے تو وہ کھانا حلال

کھائے گا، پاکیزہ کھائے گا۔ جس سے بدن صحت مند رہے گا اور روح توانا رہے گی۔ اگر قلب کام نہیں کر رہا تو حلال حرام کی تمیز نہیں ہوگی، پاک ناپاک کا فرق نہیں رہے گا نہ ہی اس کا احساس رہے گا! اور اگر کسی کا دماغ بھی کام نہ کر رہا ہو تو پھر وہ کھائے گا ہی نہیں یا کھاتا ہی رہے گا یا بیکار اَلم غلَم کھاتا رہے گا۔

اللہ کریم اپنے اس احسان کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ استفہامیہ انداز ہے۔ فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ ''کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا۔'' جس ہستی نے بعثتِ عالی سے لے کر قیامِ قیامت تک آنے والی ساری اولادِ آدم کی روحانی اور مادّی ضروریات کا ادراک کر کے ان کی تکمیل کے وہ ذرائع متعین فرمانے ہوں کہ بدن بھی درست رہیں اور روحیں بھی پھلیں پھولیں۔ اس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہء اطہر کی وسعتوں کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شرح صدر کی انتہاؤں کو کوئی جان سکتا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہء مبارک کتنا وسیع ہوا؟ یہ علم مخلوق کی رسائی سے باہر ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ جانیں اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جانیں! مشاہیرِ عالم کی فہرست دیکھ لیں۔ بڑے سے بڑا شخص کسی ایک شعبے میں ہی مشہور ہوا۔ کوئی فلسفی تھا تو وہ فلسفے کے اصول وضوابط ہی بتاتا رہا۔ باقی اسے کسی شعبے میں مہارت حاصل نہ ہوئی۔ کوئی مؤرخ تھا تو تاریخ کی باریک بینیاں زیرِ بحث لاتا رہا، باقی امور سے بے خبر رہا۔ کوئی مشہور فاتح ہوا تو جنگی معاملات میں مہارت رکھتا تھا۔ دوسرے علوم سے بیگانہ رہا۔ تمام مشاہیرِ عالم کی شہرت کسی ایک شعبہء علم یا شعبہء حیات سے تھی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا سے انتہا تک زندگی کے ہر شعبے کی راہیں متعین فرما دیں اور ایسی اعلیٰ اور حتمی متعین فرمائیں کہ قیامت تک ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ حتمی ہیں اور دائمی ہیں۔ تو پھر سینہء اطہر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کا کوئی اندازہ کہاں کر سکتا ہے!

یہ دنیا رنگ برنگی ہے۔ علاقے، زبانیں، رنگ سب مختلف ہیں۔ یہ دنیا، انسانی آبادیاں، معمورہٴ عالم اختلاف سے مُزیّن ہے۔ اس میں ہر شے کا مختلف ہونا ہی اس کی خوبصورتی ہے۔ جہاں پودے مختلف ہوں وہ جگہ خوبصورت ہوتی ہے۔ جہاں پہاڑیاں مختلف طرح کی ہوں وہ بہترین نظارہ ہوتا ہے۔ جہاں مختلف طرح کے چشمے، جھرنے، ندیاں ہوں وہ جگہ بہترین ہوتی ہے۔ اونچے نیچے کھیت ہوں تو خوبصورت نظارے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر فرد میں مخصوص انفرادیت ہے۔ ہر ایک کی پسند مختلف ہے۔ ہر ملک اور علاقے کے موسم مختلف ہیں۔ لوگوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ دن رات کے اوقات مختلف ہیں۔ اس جہان کی رونق ہی اس اختلاف سے ہے۔ اختلاف ہونا خوبصورتی ہے لیکن مخالف ہونا بُری بات ہے۔

اس رنگ برنگی دنیا میں ساری انسانیت کے لیے ایک اصول دینا۔ اور وہ اصول ایسا ہو کہ ساری انسانیت پر اس کے لیے عمل کرنا آسان بھی ہو، ممکن بھی ہو اور قیامت تک اس میں تبدیلی کی ضرورت بھی پیش نہ آئے ایسا کوئی دانشور سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، کائنات میں کہیں نہیں ملتا۔ نہ ملتا ہے نہ ملے گا۔

جس پہلو سے بھی بات کریں، کرتے چلے جائیں، ہم اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں، جہاں تک ہماری نگاہ ہے۔ ہم وہاں تک دیکھ سکتے ہیں جتنی ہماری نظر دور تک دیکھ سکتی ہے لیکن آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کی وسعتیں ناپیدا کنار ہیں۔ ہمارے ذرائع علم محدود، ہماری استعداد محدود اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی وسعت لامحدود! محدود، غیر محدود کا احاطہ کب کر سکتا ہے؟ ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں! یہ طے ہے کہ اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا عطا فرمایا کہ جہان میں جہاں کوئی بھلائی ہوتی ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی راہنمائی ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے علماء، اہلِ حق اور بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں، یہ عالم اور ولی اللہ کیسے بن گئے؟ چند ذرّے، چند قطرے عظمتِ نبوت کے جسے نصیب ہو گئے وہ جہان میں روشن ہو گیا۔ عالم ہو گیا، ولی اللہ ہو گیا!

کفر کا سینہ چاک کر کے اسلام کا نور پھیلانا، کارِ عظیم:

فرمایا: وَوَضَعۡنَا عَنكَ وِزۡرَكَ ۝٢ ''اور آپ پر سے آپ کا بوجھ بھی اتار دیا۔'' فرمایا، وہ کمر توڑ بوجھ جس نے آپ کی کمر دوہری کر دی تھی وہ آپ سے ہٹا لیا گیا۔ وہ کمر توڑ بوجھ کیا تھا؟ ظلم کا ہاتھ روک کر اللہ کے دینِ حق کا نفاذ کرنا اتنا بڑا بوجھ تھا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر دوہری کر دی مگر اللہ کریم نے اسے آسان فرما دیا۔

روئے زمین پر انسانیت اللہ کے نام سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔ کہنے کو اہل کتاب موجود تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کہلانے والے یہودی تھے۔ عیسائی، عیسیٰ علیہ السلام کے امتی کہلاتے تھے۔ اُن کے پاس نام کی تورات اور انجیل تھی۔ جس کے بارے قرآنِ حکیم میں بتا دیا گیا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی۔ قرآنِ حکیم میں آتا ہے: وَقَالَتِ الۡيَهُودُ عُزَيۡرٌ ابۡنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ (التوبہ:30) ''اور یہود نے کہا عزیر (علیہ السلام) اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا مسیح (علیہ السلام) اللہ کے بیٹے ہیں۔'' یعنی یہود اور نصاریٰ انبیا علیہم السلام کو اللہ کا بیٹا مان کر مشرک ہو گئے، کفر میں چلے گئے ان کے علاوہ اہلِ کتاب کہلوانے والے اور کوئی نہ تھے۔ باقی مختلف قسم کے کافر، بت پرست اور مشرک تھے۔ روئے زمین پر موجود ہر معاشرہ اللہ کے نام سے ناآشنا تھا۔

تہذیب اور معاشرت عقیدے اور ایمان کا مظہر ہوتی ہے:

ہر معاشرے کا عقیدہ اور نظریہ مل جل کر رہنے کا ایک طریقہ بنا تا ہے۔ اس نظریے کے مطابق جو طریقہ وضع ہوتا ہے اسے تہذیب یا معاشرت کہتے ہیں۔ یہ تہذیب ہی عقیدے اور ایمان کا مظہر اور تصویر ہوتی ہے۔ بندے کی معاشرت دیکھ کر اس کے عقیدے اور ایمان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کفار و مشرکین اللہ کی عظمت سے آشنا نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ صرف دُنیوی نعمتیں حاصل کرنے پر تھا۔ اُن کے ہاں مذہب کے نام پر جو رسومات تھیں وہ بھی حصولِ دنیا کے لیے تھیں کہ فلاں بت کی پوجا کرو دولت مل جائے گی۔ فلاں مذہبی رسم ادا کرو یہ دُنیوی فائدہ ہوگا۔ اولاد ہو جائے گی، بیماری ٹھیک ہو جائے گی۔ انہیں آخرت کا تصور نہ انسانی عظمت کا ادراک نہ ہی عظمتِ الٰہی کا خیال تھا۔ عقائد کا یہ عالم تھا تو مل جل کر رہنے کا معاشرہ یہ تھا کہ ہر بندہ لینے پر تھا کہ میں کیا لے سکتا ہوں۔ سارا معاشرہ چھینا جھپٹی کا مظہر تھا۔ آپ تاریخ دیکھ لیجیے۔ ہر طاقت ور ہر کمزور سے چھین رہا تھا، زندگی چھینی جا رہی تھی، اولاد، عزت آبرو سب چھینا جھپٹی کا شکار تھے۔ یہاں تک کہ انسان دوسرے انسانوں کا شکار کر کے، پکا کر کھا جاتے تھے۔

اس عالم میں ایک آواز، صلی اللہ علیہ وسلم! ساری انسانیت کو کہے کہ تم غلط کر رہے ہو۔ تمہارا عقیدہ غلط، اس کا مظہر تمہاری معاشرت ہے۔ اسے بدلو۔ زندگی کے اصول بدلو۔ معاشرت بدلنے کے لیے عقیدہ بدلنا پڑے گا۔ عقیدہ بدلو۔ اللہ کو واحد و لاشریک مانو، کائنات کا مالک مانو۔ دنیا میں اللہ کی رضا کے لیے زندہ رہو۔ محض دولت جمع کرنے کے لیے نہیں۔ ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے کماؤ۔ ہر چیز حاصل کرو لیکن دوسروں سے نہ چھینو۔

یہ بات زبانی کہہ دینا اور بات ہے اسے نافذ کرنا دوسری بات ہے۔ بیٹھ کر ذرا سوچیں کہ اس کا کرنا کتنا مشکل کام تھا کہ ساری انسانیت کو کفر سے ہٹا کر حق کی راہ پر چلانے کا بیڑا اٹھایا جائے۔ کفر کی تاریکیوں کو پھاڑ کر اسلام کا نور پھیلانا کتنا بڑا بوجھ تھا۔ کتنا مشکل کام تھا!

ہم سے وہ بنیاد کھو گئی جو تہذیب کی مظہر ہے:

آج ہم کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں لیکن ہماری تہذیب کافرانہ ہے۔ ہماری بچیاں ناچ رہی ہوتی ہیں اور باپ، بھائی تالیاں بجا رہے ہوتے ہیں۔ ایمان اور عقیدے کا اظہار تہذیب اور معاشرت سے ہوتا ہے۔ ہمارا کمانا، خرچ کرنا، لین دین، اٹھنا بیٹھنا، جینا مرنا کیسا ہے؟ یہ کردار بتا تا ہے کہ اس کی بنیاد ہمارا عقیدہ ہے۔ وطن عزیز میں چند ٹکوں کے لیے مسلمان، مسلمانوں کو گدھے کا گوشت کھلا رہے ہیں۔ حرام کھلا رہے ہیں۔ چند ٹکوں کے لیے نقلی غذاؤں،

ملاوٹ والی غذاؤں، ناقص دواؤں سے لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان کا عقیدہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا؟ عقیدے کا اظہار کردار سے ہوتا ہے۔ آج اپنی معاشرت کو دیکھ لیں کافرانہ معاشرے کا کون سا کام ہے جو آج ہم نہیں کر رہے، کیوں کر رہے ہیں؟ وہ بنیاد جو معاشرت اور تہذیب کو ترتیب دیتی ہے وہ ہم سے کھوگئی ہے۔ ہم نسلی اور خاندانی مسلمان ہیں۔ ہم عقیدے کے مسلمان نہیں رہے۔ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں۔ حساب میں، مردم شماری میں، گنتی میں ضرور ہم مسلمان ہیں!

ساری دنیا کفر میں مبتلا تھی۔ اس کے خلاف ایک آواز اٹھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند فرمائی۔ ایک سے دو، دو سے چار، دس ہوتے ہوتے دین پھیلتا گیا۔ کتنا بڑا بوجھ تھا۔ ساری انسانیت کا بوجھ ایک ہستی پر! قربان جائیے اس عزیمت کے، اس عظمت کے، ارادے کی اس پختگی کے اور اس کے اظہار کے کہ ایک ہستی نے ایسا انقلاب پیدا کیا کہ کفر کا سینہ چاک کر کے رکھ دیا۔ تاریکیوں کا جگر چاک کر کے اللہ کے نور کی روشنی پھیلا دی۔ اور وہ معاشرہ جو لُوٹ کر کھانے کا عادی تھا اسے کہاں پہنچا دیا!

ایک غزوہ میں ایک مجاہد بیان کرتا ہے کہ میں زخمیوں کی دیکھ بھال پر تھا۔ مجاہد سخت زخمی تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی، اس نے پانی مانگا۔ میں پانی لے کر اس کے پاس پہنچا تو دوسرے کی آواز آئی۔ وہ پانی مانگ رہا تھا، جس کے پاس میں پانی لے کر گیا، اس نے کہا پہلے اسے دو۔ اس کے پاس پہنچا تو تیسرا زخمی پکارا۔ دوسرے نے نہیں پیا اور کہا پہلے اس کے پاس جاؤ۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ شہید ہو چکا تھا۔ دوسرے کے پاس آیا وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔ تیسرے کے پاس آیا، وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔

یہ وہ معاشرہ تھا جو چھین کر کھاتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں پہنچا دیا کہ نزع کے وقت بھی ایثار کر رہے ہیں۔ کن پستیوں سے اٹھایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور کن بلندیوں پر پہنچا دیا!

آج ہم زندہ لوگوں کی زندگی چھین کر اپنے لیے دولت جمع کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں! کفار کی تہذیب اور سودی معاشی نظام پر پرورش پا رہے ہیں اور ہم مسلمان ہیں! جو معاشرہ کفار کا اتباع اختیار کر لیتا ہے وہ اسلام کا دعویٰ کیسے کرتا ہے؟ اسلام تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا نام ہے۔

ریل کا سفر تھا۔ انگریز اپنے کتے کے ساتھ سفر کر رہا تھا، ریل کے اسی ڈبے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی سفر کر رہے تھے۔ وہ کتا مولانا کے قریب آ گیا تو آپؒ نے فرمایا کہ اپنے کتے کو اپنے تک رکھیں۔ اس انگریز نے طنزاً

کہا، یہ اللہ کی مخلوق ہے۔ آپ تو بڑے دینی راہنما ہیں۔ اور اسلام تو ہر جانور پر بھی رحم کرنے کا دعویٰ کرتا ہے؟ آپؒ نے فرمایا۔ تمہاری اس بات کا پہلا جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم فرمایا ہے کہ اس پر رحم کرو، خوراک دو، اسے تنگ نہ کرو۔ یہ ایک الگ بات ہے اور اسے ایسے اپنے ساتھ ساتھ لیے رکھنا۔ یہ دو الگ باتیں ہیں۔ یہ نجس ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے کپڑوں سے دور رکھنے کا ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے کپڑے ناپاک ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ہم اپنے کپڑوں کو پاک رکھتے ہیں۔ ان سے بچتے ہیں۔

لیکن یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تمہارا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے لہٰذا تمہارے سمجھنے کے لیے جواب یہ ہے کہ تم انگریز اسے اچھا سمجھتے ہو جو اپنی قوم کو کاٹتا ہو اور تمہارے آگے دم ہلاتا ہو۔ ہم ایسے بے غیرتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ تم کتے کو اس لیے اچھا سمجھتے ہو کہ یہ اپنی قوم کا دشمن ہے اور تمہارے پاؤں میں لوٹتا ہے۔ تمہارے سامنے دم ہلاتا ہے۔ ہم ایسوں کو اچھا نہیں سمجھتے کہ جو قوم کا دشمن ہو اور اس کا غلام ہو جو اسے روٹی ڈالے۔

اب اگر ہم بھی یہی کررہے ہیں تو پھر اس مسلمانی سے ہمیں کیا ملا؟ شرح صدر کی اس نعمتِ عظمیٰ سے جس پر قرآنِ کریم کے الفاظ بھی فخر کررہے ہیں، کہ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ۝١ یعنی اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! کتنی وسعتیں عطا فرمادیں ہم نے، کیا عطا کردیا! اس میں سے ہمیں کون سا ذرہ نصیب ہوا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کے لیے مثالی مجاہدہ ہے جس کے بارے فرمایا: وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ۝٢ الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ۝٣ اور آپ سے آپ کا بوجھ بھی اتار دیا جس نے آپ کی پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

جو مشکل آتی رہی، آتی رہی۔ کسی مشکل کو خاطر میں نہ لائے۔ اہلِ مکہ کے وفد آئے۔ بارگاہِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہوئے۔ عرض کی۔ آپ نے ہمارے بتوں کی توہین کی، انہیں باطل کہا، ایک ان دیکھا معبود بنالیا جو سامنے ہے نہ نظر آتا ہے۔ ویسے ہی ماننا پڑتا ہے۔ آپ نے یہ سارے نئے کام کررکھے ہیں۔ ہم نے بھرپور کوشش کی کہ آپ باز آجائیں۔ ہم آپ کو روک سکے نہ اس مذہب کو تو آپ ہمارے ساتھ سمجھوتہ کرلیں۔ ہم آپ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ آپ جو عقیدہ رکھتے ہیں، رکھیں جسے ربّ مانتے ہیں، مانتے رہیں، جیسا آپ چاہتے ہیں ایسی اس کی عبادت کریں۔ اپنے مذہب پر قائم رہیں لیکن ہماری معاشرت وتہذیب، لباس وحلیئے، بودوباش اور معاشرتی قوانین وضوابط کو نہ چھیڑیں۔ مکہ مکرمہ میں بے شمار مذہب اور عقیدے پہلے سے چل رہے ہیں لیکن ہم سب کی معاشرت ومعیشت ایک ہے۔ ہم سودی کاروبار کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، بدکاری کرتے ہیں۔ سارا معاشرہ اسے تسلیم کرتا ہے۔ کوئی اس پر لعن طعن نہیں کرتا۔ آپ اس معاشرت کو نہ چھیڑیں۔ اسے تبدیل کرنے کی بات نہ کریں بلکہ اس پر سمجھوتہ کرلیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا اس کا مفہوم ہے کہ معاشرت ہی ایمان کا مظہر ہوتی ہے۔ جب میرا اور تم لوگوں کا عقیدہ و ایمان ہی مختلف ہے تو معاشرت کیسے ایک ہوسکتی ہے۔ کفر اور اسلام کی معاشرت مشترک نہیں ہوسکتی کفر کے پودے پر کفر کے پھول، پھل لگیں گے اور اسلام پر جو لگے گا وہ اور ہوگا۔ کیکر کے پودے پر آم نہیں کیکر ہی لگے گا اور آم کے پودے پر آم ہی لگیں گے۔ جس طرح آم پر کیکر کے کانٹے نہیں اُگ سکتے اسی طرح کفر اور اسلام یکجا نہیں ہوسکتے ہم سمجھتے ہیں، ایمان اور اسلام کا تو آخرت میں پتا چلے گا اور اللہ پاک تو غفورٌ رحیم ہیں، خیر کریں گے۔ یاد رہے! وہ بے حد کریم ذات ہے اسی لیے اس نے دنیا کو آخرت کا مظہر بنا دیا ہے۔ نورِ ایمان ہی آخرت میں نجات کی شرط ہے۔ اعمالِ صالحہ ہی مطلوب ہیں۔ آخرت کا عکس چونکہ دنیا پر پڑتا ہے تو نورِ ایمان کا اظہار انسان کے حلیئے، اس کے میل جول، بول چال بلکہ کردار کے ایک ایک حصّے سے ہوتا ہے نورِ ایمان کی کمزوری اس کے چہرے مہرے سے ظاہر ہوتی ہے۔ بات کے انداز سے اور لباس سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ملک کے تعلیم یافتہ گھرانے قیمتی کتّے پالتے ہیں۔ انہیں اعلیٰ لباس پہناتے ہیں۔ بہترین غذا کھلاتے ہیں۔ ان کی بیٹیاں نیم برہنہ لباس پہنے ان کتوں کو بغل میں دبائے DOG SHOW کے لیے سٹیج پر سرِ عام نمائش کرتی نظر آتی ہیں اور دوسرے لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیونکہ غیر مسلم معاشرہ ایسا کرتا ہے۔ یہ ان جیسا بننا چاہتے ہیں۔

اسی ملک کے بڑے شہر میں لاکھوں ٹن غلّہ گل سڑ کر ختم ہوگیا اور تھر میں لاکھوں انسان بھوک سے مر گئے۔ کسی نے گوداموں سے لے کر ان تک نہ پہنچایا جو اُنہی کی خاطر آیا ہوا تھا۔ انسانوں کے ساتھ یہ سلوک اور کتوں کے ساتھ یہ سلوک!

اسی ملک میں وعظ و تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ اخبار، رسالے، ٹی وی ہر جگہ دینی پروگرام ہوتے ہیں۔ دینی معلومات دی جاتی ہیں۔ اس ساری تبلیغ کے بعد نتیجہ کیا ہے؟ ہم دن بدن کافروں کے شعار اپناتے جارہے ہیں۔ ہم پورا زور لگاتے ہیں لیکن معاشرے میں مسلمانوں سے رسومات نہیں چھڑا سکتے۔ ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا؟ ہماری آواز کی طاقت کیا؟ ہمارا تو کردار ایسا نہیں جو دوسرے کو متاثر کر سکے لہٰذا لوگ متاثر نہیں ہوتے۔ ہر آنے والا دن پہلے سے بدتر ہے۔ عورتوں میں حیا رہی ہے نہ مردوں میں غیرت اور پھر مسلمانی کا دعویٰ بھی ہے!

معاشرت و تہذیب عقیدے کی مظہر ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عقیدہ دیا جو معاشرت وجود میں آئی تو چھین کر کھانے والوں کو ایثار کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا کہ وہ نزع کے وقت بھی ایثار کرتے رہے۔

یہ کتنا بڑا بوجھ تھا۔ بعثتِ عالی کے بعد تیرہ سالہ حیاتِ مبارکہ جو مکہ مکرمہ میں بسر ہوئی اس کا ایک ایک لمحہ کتنا

بھاری تھا! بنوغفار ایک بڑا اور مضبوط قبیلہ تھا۔ بڑے جفاکش لوگ تھے۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے خبر ملی تو ابوذر نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ معلوم کرے کون ہیں؟ وہ مکہ مکرمہ گئے اور واپس آ کر خبر دی کہ وہ صابی (بے دین یعنی عقیدے کے منکر) ہیں۔ اور لوگ ان کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھائی سے کہا کہ یہ تو نامکمل معلومات ہیں۔ تم ان سے خود ملتے۔ ان کی دعوت خود سنتے۔ پتا کرتے لوگوں کو ان سے کیا اختلاف ہے۔ پھر وہ خود چل پڑے۔ مکہ مکرمہ پہنچے۔ وہ ایسا دور تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی لینے والے کو لوگ مارنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ ڈرتے ہوئے کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حرم میں بیٹھے رہتے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ خود بیان کرتے ہیں کہ میں زم زم پی لیتا۔ یہی میرا کھانا بھی تھا۔ اسی پر بسر ہوتی رہی۔ کئی دن بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھ لیا، کون ہو، اتنے دنوں سے یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ پردیسی لگتے ہو۔ کچھ کھایا پیا؟ میں نے عرض کی کہ زم زم پر ہی بسر ہے۔ اگر ناراض نہ ہوں تو اپنے یہاں آنے کی غرض بتاؤں۔ میں اس شخص کو ملنا چاہتا ہوں جس نے کوئی نیا مذہب بنا دیا ہے۔ ڈرتے ہوئے کسی سے پوچھا نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ جس گھر میں داخل ہوں گا وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں تمہیں اشارہ کر دوں گا تم اندر چلے جانا، تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ میں اندر گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، دعوتِ حق سنی، ایمان کی سعادت نصیب ہوگئی۔

ایک وہ ابوذر غفاریؓ جو کئی دن زم زم ہی پر رہے اور مارے خوف کے کسی سے نہیں پوچھا۔ ایمان لاتے ہی سیدھا بیت اللہ گئے اور اعلان کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں حق ہے اور مشرکین و کفار جو تم کہتے ہو وہ باطل ہے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہوں۔ مشرکین و کفار جمع ہو گئے۔ انہیں مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ کسی نے آ کر چھڑایا کہ تم لوگوں کو علم نہیں یہ بنوغفار سے ہیں۔ یہ بہت مضبوط قبیلہ ہے اور تمہارے سفر کے راستے میں ہے۔ اسے مار دو گے تو تمہارا تجارتی راستہ بند ہو جائے گا۔ اس ڈر سے انہوں نے آپؓ کو چھوڑا۔ آپؓ کسی ایذا کو خاطر میں نہ لائے اور اسلام پر ڈٹ گئے۔ یہ کیسا انقلاب آفریں پیغام تھا کہ بندے میں یکدم کتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ ہم میں وہ تبدیلی کیوں نہیں آتی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سورج دمک رہا ہے۔ قیامت تک چمکتا رہے گا۔ یہ ہمیں خود دیکھنا ہوگا کہ اس کی کرنیں ہمارے دلوں کو روشن کر رہی ہیں یا نہیں!

سیرتِ مطہرہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرامؓ کے حالات سب اس پر گواہ ہیں کہ اس عظیم ذمہ داری کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس تندہی سے انجام دیا اور صحابہ کرامؓ نے اس کے لیے کس قدر قربانیاں دیں۔ مسلمانوں پر مکّہ کی زمین تنگ کر دی گئی تو صحابہؓ کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت ملی۔ بعد ازاں مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کا حکم آ گیا۔ صحابہ کرامؓ جانا شروع ہو گئے۔ آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صدیق اکبرؓ کے ساتھ ہجرت فرما

گئے۔ سفرِ ہجرت کس قدر سخت تھا۔ ابوبکر صدیقؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی فکر تھی۔ اللہ کریم نے کس طرح اس سفر کو خیریت سے طے کروادیا اور وہ بوجھ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر دوہری کر دی تھی وہ بوجھ ہٹا دیا۔ نورِ توحید پھیلا، اسلامی ریاست بنی۔ عوام تو عوام پوری دنیا کے حکمران آپ کے قدموں میں جھک گئے۔ کفر وشرک کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی کفر کو دنیا سے سمٹتے اور بھاگتے ہی بنی!

''بول بالا ہے تیرا ذکر ہے اونچا تیرا'':

ان حالات میں کہ اُس دور میں، مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی ڈرتے ہوئے زبان پر کوئی نہیں لاتا تھا۔ کوئی نیا آدمی باہر سے آتا، ملنا چاہتا تو ڈرتے ہوئے کسی سے پوچھتا نہیں تھا۔ کوئی پوچھ بیٹھتا، کوئی نامِ نامی لیتا تو اسے تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس وقت ارشاد فرمادیا اور ہمیشہ کے لیے جاری فرمادیا کہ: وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝ ''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا''۔ کائنات بھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کو کلمے کا جزو اور اسلام میں داخلے کا راستہ بنا دیا۔ ہر مومن کے وردِ زبان کر دیا۔ نماز اعلیٰ ترین عبادت اور قربِ الٰہی کے لمحات سے پُر ہے۔ اس میں بھی نام نامی اور ذکرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل فرمادیا کہ ہر نمازی، ہر دو رکعت کے بعد آخری قعدہ میں تشہد اور التحیات پڑھتا ہے اور اس میں صلوٰۃ وسلام بھی بھیجتا ہے۔ السلام علیك ایها النبیّ۔۔۔ کے ساتھ سلام اور اللھم صلی علی محمد۔۔۔ کے الفاظ کے درود بھیجتا ہے۔ اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر کو اذان کا حصّہ بنا دیا۔ ہر مؤذن وَ اَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کہتا ہے۔ اذان ایک ایسا کلمہ ہے جو ابتدائے اسلام سے گونج رہا ہے اور قیامت تک ان شآء اللہ العزیز گونجتا رہے گا۔ یہ کلمہ کسی وقت رکتا نہیں۔ گردشِ لیل ونہار وقت کو چلاتی رہتی ہے۔ ایک جگہ صلوٰۃ کا وقت ختم ہوتا ہے تو دوسری جگہ اذان بلند ہوجاتی ہے۔ وہاں وقت ختم ہوا تو اسی لمحے زمین کے دوسرے حصّے میں اذان شروع ہوجاتی ہے۔ یوں روئے زمین پر اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے، وہاں وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان بھی گونجتا رہتا ہے۔ یہی فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔ ارشاد فرمادیا گیا کہ وہ غلبہ نصیب ہوگا کہ کائنات میں اللہ جلّ شانہٗ کے بابرکت نام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر تا قیامت فضاؤں میں گونجتا رہے گا۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی صاحب نے بہت خوبصورت شعر کہا:

وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے تیرا، ذکر ہے اونچا تیرا

کفر جتنی چاہے کوشش کرے، کرتا رہے۔ ظلمتیں زور لگاتی رہیں، معاشرہ کے بگڑے ہوئے عناصر کوشش

کرتے رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو کوئی روک نہیں سکتا!

اللہ کریم نے درود شریف کو اعلیٰ ترین دعا اور بہترین وظیفہ بنا دیا۔ درود کا معنی ہے مسلسل جاری رہنا، نہ رکنے والی، ہمیشہ جاری رہنے والی شے۔ ارشادِ باری ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (الاحزاب:56) بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پیغمبر پر۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور خوب سلام بھیجا کرو۔

اللہ کریم کا درود بھیجنا یہ ہے کہ اللہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر لحہ، ہر آن نئی رحمتیں نازل فرماتے رہتے ہیں۔ کوئی لحہ خالی نہیں جاتا کہ مزید رحمتیں نازل نہ ہو رہی ہوں۔ فرشتوں کا درود اور انسانوں کا درود، اللہ سے دعا ہے، اے اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے پناہ رحمتیں نازل فرما۔ اللہ کے فرشتے کتنے ہیں، کہاں کہاں ہیں؟ آسمانوں، زمینوں، فضاؤں، پانیوں، خشکی اور پہاڑوں پر کہاں کہاں ہیں؟ اللہ جلّ شانہٗ کے سوا کوئی گن نہیں سکتا۔ ربّ کریم کا ارشاد ہے: وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (المدثر:31) "اور آپ کے پروردگار کے لشکروں کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔" وہ سب ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ انسان تو غافل ہو جاتے ہیں لیکن فرشتے کسی لمحے غافل نہیں ہوتے۔ ان میں نفس نہیں، نیند، بھوک پیاس نہیں۔ نفس کے ساتھ جتنی چیزیں متعلق ہیں وہ ان میں نہیں۔ وہ ہمہ وقت اس کام میں لگے رہتے ہیں جس کا حکم اللہ کریم دیتے ہیں۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (التحریم:6) جو اللہ کی کسی بات میں نافرمانی نہیں کرتے جو وہ ان کو حکم دیتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔ یعنی جب اللہ نے فرشتوں کو درود کا حکم دیا تو وہ ہر لحہ درود بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ ان کے ذمہ ہے۔ جس کو اللہ کریم گواہی دے رہے ہیں۔

ہر خوش نصیب انسان جسے اللہ کی معرفت کا کوئی ذرہ نصیب ہے، جسے کلمہ طیبہ نصیب ہے، وہ اگرچہ خطا کار ہے، غافل ہے، جیسا بھی ہے لیکن جب اسے توفیقِ صلوٰۃ ہوتی ہے تو اس میں درود بھی ضرور ہے اور وہ درود پڑھتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ جو اس کے علاوہ بھی درود بھیجتے رہتے ہیں۔

تمام وظائف کا جامع وظیفہ:

ہمارے ہاں ایک بڑا رواج یہ ہے کہ کوئی بھی فطری اور قدرتی طریقے سے کسی کام کے کرنے کے لیے جو ضروری انتظار ہوتا وہ نہیں کرتا۔ ہر کوئی مختصر ترین راستہ یعنی SHORTCUT ڈھونڈتا ہے۔ ہر کام فوراً ہو جائے۔ کچھ خاص کرنا نہ پڑے اور دنیا کی بھی ہر چیز مل جائے اور آخرت بھی خود بخود اچھی ہو جائے۔ اس لیے ہر کام کے لیے الگ

وظیفہ کرتے ہیں۔ جتنے وظیفے تلاش کیے جاتے ہیں سب اسی لیے ہوتے ہیں۔ اگر واقعی سب سے اچھا وظیفہ چاہیے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا ہے کہ بہترین وظیفہ درود شریف ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ بہت عبادت گزار تھے۔ اللہ تعالیٰ سے عرض گزار رہتے تھے۔ ان کے دل میں خیال آیا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض گزار ہوئے۔

”عَنْ ابُنِ كَعْبٍ ۔۔۔۔۔ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنِّیْ اُكْثِرُ الصَّلٰوةَ عَلَيْكَ فَكَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلٰوتِیْ؟ فَقَالَ مَا شِئْتَ قَالَ قُلْتُ الرُّبُعَ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قُلْتُ النِّصْفَ قَالَ مَاشِئتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ قَالَ قُلْتُ فَالثُّلُثَيْنِ قَالَ مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ اَجْعَلُ لَكَ صَلٰوتِیْ كُلَّهَا قَالَ اذاً تُكْفٰی هَمَّكَ وَيُغْفَرُ لَكَ ذَنْبُكَ۔“ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ الترمذی سنن ترمذی ابواب صیعۃ القیامۃ والرقائق والورع)

ترجمہ: حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پر درود زیادہ بھیجا کروں۔ آپ مجھے بتادیجیے کہ اپنی دعاؤں میں سے کتنا حصہ صلوٰۃ (درود) کے لیے مخصوص کردوں؟ آپ نے فرمایا: جتنا چاہو۔ میں نے عرض کیا کہ: میں اس وقت کا چوتھائی حصہ آپ پر صلوٰۃ کے لیے مخصوص کردوں گا۔ آپ نے فرمایا جتنا تم چاہو اور اگر اور زیادہ کردو گے تو تمہارے لیے بہتر ہی ہوگا۔ میں نے عرض کیا تو پھر میں آدھا وقت اس کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جتنا تم چاہو کردو، اور اگر اور زیادہ کردو گے تو تمہارے لیے بہتر ہی ہوگا۔ میں نے عرض کیا: تو پھر میں اس میں سے دو تہائی وقت آپ پر صلوٰۃ (درود) کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جتنا تم چاہو کردو، اور اگر اور زیادہ کرو گے تو تمہارے لیے خیر ہی کا باعث ہوگا۔ میں نے عرض کیا: پھر تو میں اپنی دعا کا سارا ہی وقت آپ پر صلوٰۃ (درود) کے لیے مخصوص کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری ساری فکروں اور ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفایت کی جائے گی اور تمہارے گناہ وقصور ختم کردیے جائیں گے۔ (جامع ترمذی) (معارف الحدیث جلد ۵ صفحہ ۳۷۲)

اگر درود شریف کو ہی مستقل وظیفہ بنالیا جائے تو دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے کسی کام کے لیے کسی اور وظیفے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حدیث شریف میں بہت سے درود شریف آئے ہیں۔ بعض بزرگوں نے محبت میں

نعتیں کہی ہیں۔ بہت سے بزرگوں نے مختلف طرح سے پڑھنے اور پڑھے جانے کے طریقے بتائے ہیں۔ ٹھیک ہے آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ہی پڑھتے ہیں۔ ہر شخص کے کہنے کی اپنی تاثیر ہے۔ ایک شاعر کوئی شعر کہتا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ہے۔ اس کا ایک اثر ہے۔ کوئی عالم باعمل، نیک صالح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہتا ہے، اس میں اور اثر ہے۔ کوئی ولی اللہ، صاحب حال ایک جملہ کہتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کہتا ہے، اس کا اپنا اثر ہے۔ ساری دنیا اچھی باتیں بتائے لیکن جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے ہیں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ درودِ ابراہیمی مسنون درود شریف میں سے ہے۔ نماز میں پڑھتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسنون درود شریف ہیں۔ جتنے درود شریف مسنون ہیں ہر ایک کا اجر جدا جدا ہے۔ ایک یہ درود شریف ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَآلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم جو مختصر سا ہے لیکن اس کے اجر کا کوئی پیمانہ نہیں۔ یہ اللہ کی عطا پر منحصر ہے۔

اچھا ہے کہ سب وظیفوں کا جامع وظیفہ درود شریف پڑھا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ بیمار کی تندرستی کے لیے کافی ہے۔ ضرورت مند کی حاجت روائی کے لیے کافی ہے۔ ہدایت کے لیے کافی ہے۔ دین پر قائم رکھنے کے لیے کافی ہے۔ موت مابعد الموت، برزخ اور قیامت کے لمحات کی مشکلات کا علاج ہے۔ اللہ کے حضور سرخرو ہونے کے لیے کافی ہے۔ دونوں جہانوں کی مصیبتوں کا علاج ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات اس کائنات کی روح ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر بلند کر دیا گیا اور ابد الآباد بلند رہے گا۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کب قائم ہوگی؟ فرمایا: حَتّٰی لَا یُقَالَ اَللّٰہ اَللّٰہ جب کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا قیامت قائم ہو جائے گی۔ جب تک کوئی اللہ اللہ کہنے والا ہے اس نامِ مبارک کے زمزمے جاری رہیں گے۔ کائنات چلتی رہے گی جب یہ زمزمے رک جائیں گے۔ کائنات کی نبضیں رک جائیں گی قیامت قائم ہو جائے گی۔ بعثتِ عالی سے لے کر قیامِ قیامت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات اس کائنات کی روح ہے۔ شبِ معراج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔ جہاں تک اللہ نے چاہا وہاں تک تشریف لے گئے، جو اللہ نے چاہا دکھایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کے حالات بیان فرمائے۔ آسمانوں کے واقعات بتائے۔ سدرۃ المنتہٰی، ساتویں آسمان کی حد پر جبرئیل امین رک گئے۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تک تشریف لے گئے؟ یہ نہیں فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کو دیکھا، دوزخ کو دیکھا۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس

تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وضو فرمایا تھا، اس کا پانی رواں تھا۔ جس دروازے سے گزرے تھے اس کی کنڈی ہل رہی تھی۔ بستر مبارک گرم تھا۔

وضو کا پانی کتنی دیر رواں رہتا ہے، کنڈی کتنی دیر ہلتی رہتی ہے، بستر کتنی دیر گرم رہ سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو کائنات کا نظام رک گیا۔ جہاں تھا سب کچھ وہیں رُک گیا۔ علما کے مطابق اس سارے سفر کا عرصہ تیئس برس کے قریب تھا۔ تیئس برس کائنات کا نظام رکا رہا۔ واپس زمین پر قدم رکھا تو نظام پھر چل پڑا۔ گویا کائنات کی روح حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ جس طرح بدن سے روح جدا ہوتی ہے تو جو حرکت جہاں ہو وہ وہیں رک جاتی ہے اسی طرح اگر کائنات ایک جسم ہے تو اس میں روح ذکرِ خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ جب یہ رکے گا تو قیامت قائم ہو جائے گی اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رہتی دنیا تک کے لیے اپنا نبی و رسول بنا کر بھیجا اور رہتی دنیا تک کے لیے اذان میں اپنے نام کے ساتھ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی بلند فرما دیا۔ جب تک اللہ کی کبریائی اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی بلند ہوتی رہے گی دنیا قائم رہے گی جب یہ برکات نہیں رہیں گی تو کائنات بھی نہیں رہے گی۔ وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝٤ ''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔'' جس ذکرِ خیر کو کفر دبانا چاہتا تھا اس کو اللہ کریم نے دوام بخش دیا!

دورِ حاضر میں کفر کے حربے:

آج بھی کفر کی ساری کوشش یہی ہے کہ اس کو ختم کیا جائے۔ اُس عہد اس زمانے میں کلمہ پڑھنے سے بزور روکنے کی کوششیں کی گئیں۔ اب نیا حربہ ہے کہ کلمہ پڑھتے رہو، مسجدیں بناتے رہو۔ کلمہ، نماز کا جو نتیجہ کردار پر آتا ہے وہ نہیں آنا چاہیے۔

قدرتی طور پر ہر بات کا ایک اثر ہوتا ہے۔ ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ جو بات بے نتیجہ ہو جائے، اسے کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ جو بات کہنے کا کوئی نتیجہ نہ ہو، جس کام کے کرنے کا کچھ حاصل نہ ہوا سے فضول اور بے مقصد قرار دیا جاتا ہے۔

اسی طرح کلمے کا، اسلام کا، نماز روزہ، درود و سلام کا ایک نتیجہ ہے۔ مسلمان ہونے کا انسان کی زندگی پر، اس کے کردار پر، اس کی تہذیب پر، اس کے حلیئے پر، اس کے ملنے جلنے کے انداز پر، ہر ہر بات پر ایک اثر اور ایک نتیجہ آتا ہے۔ مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا ہے تو کہتا ہے، السلام علیکم۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ کافر کے پاس اس کی اپنی تہذیب کے الفاظ ہیں، ہائے! اور بائے! ملاقات اور رخصت ہوتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان

رخصت ہوتے وقت کہتے ہیں، مع السلام یعنی السلام علیکم فی امان اللہ، اللہ حافظ۔ اگر اسلام کے ان دعائیہ الفاظ سے یہ نتیجہ چھن جائے۔ یعنی مسلمان ایک دوسرے کے خیر خواہ نہ رہیں۔ سلامتی کے ضامن نہ رہیں تو اسلام بے مقصد ہو گیا۔

کفر کا نیا حربہ یہی ہے کہ اسلام کی مقصدیت ختم کر دی جائے۔ اسی لیے دیکھا جاسکتا ہے کہ کسی کافر ریاست میں۔ یورپ، امریکہ، افریقا، چین جاپان کہیں بھی کوئی روزہ نماز سے نہیں روکتا۔ اجازت ہے کہ یہ کرتے رہو لیکن اس کا جو نتیجہ کردار پر آنا چاہیے وہ نہ آئے۔ مسلمانوں جیسی شکل نہ بناؤ، میل جول، لباس، ماحول غیر اسلامی ہونا چاہیے۔ سودی نظام کا حصہ بنو، سود کھاؤ۔

وطنِ عزیز میں اس کی شکل یہ ہے کہ سود کھاؤ، حرام کھاؤ، رشوت لو، حق داروں کا حق دبالو۔ چوری کرو، ڈاکے ڈالو، ذخیرہ اندوزی کرو، دوسروں کا مال لوٹ لو۔ یہ سب کچھ کر کے عمرہ، حج کر آؤ۔ دیگیں پکاؤ، اسی مالِ حرام سے سخاوت کرو، اس کی شہرت کرو۔

یعنی کفر نے ایک نیا پانسہ پلٹا ہے۔ دورِ جدید میں جہاں چیزیں تبدیل ہوئی ہیں وہاں کفر کا ہتھیار بھی بدل گیا ہے۔ کفر نے دیکھ لیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال میں وہ مسلمانوں سے کلمہ نہیں چھڑوا سکے، نمازیں، روزے، حج عمرے نہیں چھڑوا سکے تو پھر ان عبادات کا جو نتیجہ ہے وہ ختم کروا دیا جائے۔ مسلمان کلمہ پڑھتا رہے، جھوٹ بولتا رہے۔ کلمہ پڑھتا رہے، حرام کھاتا رہے۔ کلمہ پڑھتا رہے ہماری تہذیب کو فخر سے اپناتا رہے۔ ظاہر سے باطن تک ہماری تہذیب کا نمائندہ رہے کفر نے آج مسلمان بچیوں کی بغلوں میں گتے دے دیے۔ مسلمان نوجوانوں کے حلیئے بھی کافروں جیسے کر دیے، ان کی سوچ کافرانہ کر دی، ان کا کھانا پینا حرام کر دیا۔ ان کے کاروبار، لین دین میں سود ڈال دیا تو اس کے نتائج وہی ہیں جو کفر کے ہوتے ہیں۔ پھر اسلام کہاں گیا؟ کردار کافرانہ ہے تو زبانی اسلام کا کیا حاصل؟ کوئی دوا کسی مرض کے لیے لی جاتی ہے، اگر اس کا اثر ختم کر دیا جائے تو پھر کھاتے رہیں۔ ایک دوا درد ٹھیک کرنے کی ہے۔ اس سے وہ اثر نکال دیں تو کھاتے رہیں درد بھی ہوتا رہے پھر دوا کا کیا فائدہ؟

کفر کا نیا حربہ یہی ہے اس کا سارا زور اس پر ہے کہ کلمہ، اسلام، ایمان کا جو نتیجہ عملی زندگی پر ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے لیے بہت کام کیا گیا ہے۔ کوئی داڑھی رکھے تو اسے دہشت گرد کہا جائے۔ عربی بولے، عربی پڑھے، عربی پڑھائے تو وہ دہشت گرد ہی نہیں دہشت گرد تیار کرنے والا کہلائے۔ مدارس کو دہشت گردی کا گڑھ سمجھا جائے۔ مساجد میں نفرتیں پھیلائی جائیں۔

کفر کے تمام حربوں کا نشانہ یہی نکتہ ہے۔ اللہ کریم نے مساجد کو اللہ کا گھر فرمایا ہے وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ

(الجن:18) ''اور یہ کہ مسجدیں (خاص) اللہ کی ہیں۔'' یہ تو اللہ کے بندوں میں محبت تقسیم کرنے کے مراکز ہیں۔ لیکن کیا مساجد میں زہر کو قند کہا جائے؟ زہر کو زہر ہی کہا جائے گا۔

مولانا تھانویؒ سے کسی نے عرض کیا تھا کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا، نہیں! مولوی کافر بناتے نہیں کافر بتاتے ہیں جو کافر ہوتے ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مولوی تو مسلمان بناتے ہیں۔ مساجد میں تو محبت کا درس دیا جاتا ہے لیکن نفرت پر محبت کا غلاف نہیں چڑھایا جاتا۔ برائی کو نیکی نہیں کہا جا سکتا۔

کفر کا ایک اور حربہ یہ ہے کہ اسلام چونکہ رواداری کا علمبردار ہے۔ اس لیے کفر اور اسلام سب ایک ہو جائے۔ ''بین المذاہب ہم آہنگی'' یہ ایک تحریک ہے جو سرکاری سرپرستی میں چل رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ پانی، شراب، دودھ اور پیشاب سب کو ملا دو۔ سب پیتے رہو۔ سب میں ہم آہنگی ہو جائے۔ کفر اور اسلام یکجا کرنے کی تحریک! یہ کون سی ہم آہنگی ہے؟

اسلام صاف ستھرا مذہب ہے۔ کفر پر جبر نہیں کرتا۔ کافر کو مارنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کافر کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے لیکن کفر کو اسلام میں مدغم نہیں کرتا۔ اسلام، اسلام ہے۔ کفر، کفر ہے۔ دن، دن ہے۔ رات، رات ہے جھوٹ بولتے رہو، حرام کھاتے رہو اور مسلمان بھی رہو۔ یہی کفر کا حربہ ہے جس کا نام ہم آہنگی ہے۔

ان سب حربوں کا جواب درود شریف ہے۔ کوئی مسلسل درود شریف پڑھتا رہے، اسے اللہ کریم کی حفاظت نصیب ہوگی۔ شیطان کے مقابلے کے لیے اکسیر ہے۔ دنیائے کفر کے مقابلے کے لیے بہترین ڈھال درود شریف ہے۔ وظیفے تلاش کرنے والوں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جس کا مفہوم ہے کہ سب وظائف کا جامع اور سب سے اعلیٰ وظیفہ درود شریف ہی ہے۔ کوئی سا بھی درود پڑھتے رہیں، درود، درود ہی ہے البتہ مسنون درود بہت بابرکت ہیں۔ درود کی برکات لامتناہی ہیں، بہت زیادہ ہیں اس لیے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے: وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝ ''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔'' اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر بلند رکھیں گے۔

کفر جسے مختلف حربوں سے دبانے کی کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہے گا وہ ذکرِ خیر بلند ہوتا رہے گا۔ ہمیں اس ذکرِ خیر کو بلند کرنے کی سعادت نصیب ہو، یہ ہر مسلمان کی آرزو اور کوشش ہونی چاہیے۔

یہ دو طاقتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی۔ نیکی اور بدی۔ روشنی اور تاریکی۔ شیطان کی دعوت بھی تا قیامِ قیامت رہے گی اور اللہ کی عظمت کے اعلان بھی ہوتے رہیں گے۔ جہاں عظمتِ الٰہی کا ذکر ہوگا وہاں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ نامی کا ذکرِ خیر بھی بلند ہوگا۔ وہ نامِ نامی کہ جس کا لینا مکہ مکرمہ میں ایک وقت میں جرم تھا وہ کائنات کی فضاؤں سے کبھی خاموش نہیں کیا جا سکے گا! ہر لمحہ، ہر وقت، کائنات کی فضاؤں میں گونجتا رہے گا، ہمیشہ بلند تر ہوگا۔

دنیا میں کبھی داناؤں کی، حکماء کی، اہلِ علم کی، مصلحین کی، مشاہیرِ عالم کی، فاتحین عالم کی، کامیاب ترین انسانوں کی کوئی فہرست بنے گی تو نام نامی صلی اللہ علیہ وسلم پہلا نام ہوگا۔ اور تاریخ، قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر گواہ ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ کے اس اعلان کی گواہ ہے کہ ایسی کوئی فہرست اگر کافروں نے بھی مرتب کی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کی جگہ کوئی دوسرا نام نہیں لکھ سکے گا۔ بات وہی ہے کہ

وَ رَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ کا ہے سایہ تجھ پر

بول بالا ہے تیرا، ذکر ہے اونچا تیرا

محنت کے ساتھ کامیابی ہے:

یہ فطرت کا ایک اصول ہے۔ قانونِ فطرت بدلا نہیں کرتے۔ انہیں کوئی تبدیل نہیں کرسکتا اور انہی کے مطابق نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ فرمایا: فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ؕ﴿۶﴾ ہاں ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ یقیناً محنت کے ساتھ کامیابی ہے۔ مشکلات کے بعد آسانیاں ہیں۔ دنیا کی زندگی مجاہدے کا نام ہے جس کا نتیجہ آخرت کی کامیابیاں ہیں۔ امورِ دنیا کے ہر شعبے میں اس کے طریقے اور سلیقے کے مطابق محنت کی جائے۔ مشکلات کے ساتھ آسانیاں ہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ مشکل امور طے کیے جائیں گے۔ محنت کی جائے گی۔ مجاہدہ کیا جائے گا۔ یہ خطاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے یہ اصول مسلمانوں کو عطا ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام کیا تھا؟ عالم کفر میں اللہ کا پیغام پہنچا کر اللہ کی مخلوق کو کفر کے، شیطان کے پنجوں سے نکال کر اللہ کی عظمت سے آشنا کرنا۔ خالص اللہ کی رضا کے لیے۔ سب سے کھرا سب سے خالص کام بہترین انداز لیے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ ہے۔ اس کے لیے بھی اصول ارشاد ہوا کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم محنت پر ہی پھل لگتا ہے۔ مشکلات طے کر کے ہی آسانیاں ملتی ہیں۔ کام اللہ کا ہے، کرنے والے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ خالص رضائے الٰہی کے لیے کر رہے ہیں۔ اللہ کا پیغام اللہ کی مخلوق کو پہنچا رہے ہیں۔ لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر نورِ معرفت سے آشنا کر رہے ہیں اور ارشاد ہو رہا ہے کہ محنت پر پھل لگے گا، مشکل کے بعد آسانیاں ملیں گی، مجاہدہ تو کرنا پڑے گا!

وظائف کی اپنی جگہ ہے:

آج ہر بندہ چاہتا ہے کہ اسے کچھ نہ کرنا پڑے اور نتیجہ مل جائے۔ کوئی فوری حل مل جائے۔ کوئی فوری عمل

کر کے راتوں رات امیر ہو جائیں۔ وظیفے کرتے ہیں، کام نہ کرنا پڑے، محنت کر کے انتظار نہ کرنا پڑے بس فوراً نتیجہ آ جائے۔ وظائف درست۔ اللہ کی آیات سے بیمار کے لیے شفا کا وظیفہ ہے، مشکلات کی آسانی کے لیے ہے لیکن وظیفے کا یہ مطلب نہیں کہ اس اصول کو چھوڑ دیا جائے جو اللہ نے دنیا کے کام کرنے کے لیے عطا فرمایا ہے۔ بیمار دوا لینا چھوڑ دے، علاج کرنا چھوڑ دے اور صرف وظیفہ پڑھتا رہے۔ یہ درست نہیں۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی تلاوت کے بہت فضائل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فضائل ارشاد فرمائے ہیں۔ سورۂ ملک، سورۂ یٰس پڑھنا اچھی بات ہے لیکن سارا قرآن چھوڑ کر چند سورتوں کا وظیفہ پڑھنا، کیا طریقہ ہے؟ صحابہ کرامؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورتوں کے فضائل ارشاد فرمائے تو کیا صحابہ کرامؓ نے صرف یہی سورتیں پڑھیں؟ وہ تو ترتیب سے قرآن پڑھتے۔ مکمل کر کے پھر ابتدا سے پڑھتے۔ یہ سورتیں وہ زائد پڑھتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں بعض صحابہؓ روز ایک قرآن پڑھ لیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دنیا کے سارے کام جو فریضہ ہیں انہیں اللہ کے حکم کے مطابق انجام دینا بھی عبادت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا کہ تین پارے روزانہ پڑھ لیے جائیں۔ اکثر صحابہؓ قرآن کے حافظ تھے۔ ان کی مادری زبان بھی تھی وہ جلدی پڑھ لیتے تھے۔ انہیں قرآن سے عشق تھا، محبت تھی۔ سارا قرآن پڑھتے تھے۔ جو آیت یا سورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقصد کے لیے بتائی، صحت کے لیے بیماری کے علاج کے لیے۔ انہیں وہ قرآن کی تلاوت کے علاوہ پڑھتے تھے۔

یہ نہیں کہ کسی بزرگ نے وظیفہ بتا دیا۔ بس وہی پڑھ رہے ہیں باقی قرآن چھوڑ رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ تعویذ جن کے بارے پتا ہی نہ ہو کہ ان میں کیا لکھا ہے وہ ناجائز اور حرام ہیں۔ وہ جھاڑ پھونک جن میں ایسے الفاظ ہوں جن کا معنی معلوم نہ ہو وہ بھی حرام ہیں۔

قرآن کی آیات پڑھ کر پھونک مارنا درست ہے۔ دم کرنے کا ثبوت ہے کہ حضرت مریم کے پاس جبرئیل امین کو دم کرنے بھیجا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دم ہی کرتے رہیں اور قرآن کا اصول بھول جائیں۔ قرآن حکیم تعویذ گنڈوں کی کتاب نہیں۔ یہ نصابِ حیات ہے۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اللہ کریم سے تعلق بناتی ہے۔ اللہ کی اطاعت کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ بتاتی ہے۔ اصولِ فطرت بتاتی ہے کہ کامیابی چاہیے تو محنت کریں۔ ایک طالب علم کورس نہیں پڑھتا۔ محنت نہیں کرتا۔ تعویذ گلے میں لٹکائے پھرتا ہے۔ سارا سال وظیفہ پڑھتا رہتا ہے تو وہ امتحان کے پرچے میں کیا لکھے گا؟ زندگی بھی ایک امتحان ہے۔ ہر بندہ کمرۂ امتحان میں ہے۔ جو کاشتکار زمین میں ہل نہیں جوتتا، بیج نہیں ڈالتا، پانی نہیں دیتا، حفاظت نہیں کرتا کھیتی کے سرہانے بیٹھا وظیفہ پڑھتا رہتا ہے تو کون سی فصل اگائے گا؟

وظائف سے مراد یہ ہے کہ اپنی کوشش پورے خلوص سے محنت کے ساتھ، کام کے طریقے اور سلیقے کے مطابق کی جائے اور دعا بھی کی جائے۔ وظیفہ بھی کیا جائے۔ اس آیہ مبارکہ میں دنیا وآخرت کی کامیابی کا اصول بتا دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا تو پھر اس دنیا میں کون ہے جو اس اصول کو چھوڑ کر کامیاب ہوگا!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی مشکلات کا سامنا کیا! تیرہ سالہ مکّی دور تو دکھوں، مصیبتوں، تکلیفوں، ابتلا، آزمائش اور امتحان سے بھرپور ہے اور دس سالہ مدنی دور غزوات وسرایہ سے بھرپور ہے۔ مکہ مکرمہ میں مشرکینِ مکہ سے مقابلہ رہا اور مدینہ منورہ آکر بین الاقوامی سطح پر دنیا کی حکومتوں سے ٹکرانا پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کیے، غزوات کی سربراہی فرمائی۔ امن وامان قائم کیا، طریقِ عدل جاری کیا۔ تمام امور سلطنت طے کیے۔ معاشرہ، اسلام کی بنیادوں پر قائم ہوا۔ کیا یہ کم محنت تھی؟ پھر دوسرا کون ہے جو بغیر محنت کے ناجائز ذرائع و وسائل سے کامیابی حاصل کرلے۔ ایسے لوگ ہمیشہ نامراد ہی رہتے ہیں۔ دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں خسارہ پاتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مجاہدہ شرط ہے۔ ہر شعبے میں، ہر حال میں محنت ضروری ہے یہ بنیاد ہے۔ جب آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی تاکید ہے تو پھر دنیا میں کون ہے جو بغیر محنت کے پھل چاہتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ ساری کائنات کے لیے حصولِ رحمت کا وسیلہ، ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، بات کرنا، خاموش رہنا سارا دین ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح وجنگ، سیاست، معیشت، معاشرت، زندگی کا ہر لمحہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کی تصویر ہے، ترغیب ہے، ترہیب ہے، تشہیر ہے۔ پھر بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ جب آپ کو فرصت ملے تو متوجہ الی اللہ ہو جایا کریں۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾ پس جب آپ فارغ ہوں تو محنت (عبادت) کیا کریں اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کریں۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری محنت دین کے لیے تھی۔ دین ہی بیان ہوتا تھا۔ دین ہی سکھایا جاتا تھا۔ دین پر ہی عمل ہوتا تھا۔ دنیا وآخرت کی بنیاد امورِ دینیہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے مشاغل دعوتِ حق سے متعلق تھے۔ ایک ملک کی حکومت، اسے دین کے مطابق ڈھالنا، پوری دنیا کو دعوت دینا، ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا۔ سارا مجاہدہ تھا۔ اوّل تا آخر دین کا کام تھا پھر بھی حکم ہوا کہ جب فرائضِ منصبی سے فارغ ہو جایا کریں تو علیحدگی میں اللہ اللہ کریں یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ جب حضورِ اکرم کو براہ راست حکم ہو رہا ہے کہ فرصت ملے

تو متوجہ الی اللہ ہو جائیے تو اور کون ہے جسے استثنیٰ ہو! بندہ اس طرح کام کرے کہ بات کر رہا ہو تو اس کی بات دین کا پتا دے رہی ہو۔ دنیا کی بات سے بھی دین کی خوشبو آئے۔ اس کے کام دین کے مطابق ہو رہے ہوں۔ اور جب فرائض سے فارغ ہو تو متوجہ الی اللہ ہو جائے۔ یہ نہ سمجھے کہ اس نے کتاب لکھ دی، تقریر کر دی، اب فارغ ہے۔ فراغت میں بھی متوجہ الی اللہ ہونے کا حکم ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجاہدہ کس قدر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات کا کمال یہ ہے کہ دنیا میں خاتم المرسلین، رحمۃ للعالمین بن کر آئے۔ بے مثل و بے مثال ہستی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا دوسرا اللہ نے بنایا ہی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا خاموش رہنا، حرکت و سکون، سے دین متعین ہو گیا۔ ویسا کرنا دین ہے اس کے باوجود حکم ہو رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی سارا دین سکھانا ہے۔ رموزِ زندگی سکھانے ہیں، امور سلطنت چلانے ہیں۔ یہ سب کام عملاً کر کے دکھانے ہیں۔ اس کے بعد جب بھی فرصت ملے تو متوجہ الی اللہ ہو جایا کریں۔ تو پھر دوسرا کون ہے جو متوجہ الی اللہ ہونے، یادِ الٰہی کرنے، اللہ اللہ کرنے سے مستثنیٰ ہے!

طالبانِ حق کے لیے لازم ہے:

لہٰذا طالبانِ حق کو اور راہ سلوک کے مسافروں کو خصوصاً اس طرف بہت زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ بہت زیادہ مجاہدہ کرنا چاہیے۔ صوفی آرام کے لیے بھی لیٹے تو ذکر کرتا ہوا سو جائے۔ آنکھ کھلے تو اللہ اللہ ہو رہی ہو۔ ہمارے بزرگوں میں کثرت انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے ظاہری علوم کے خزانے بھی لوٹے اور کمالاتِ باطنی بھی حاصل کیے۔

ایسی اعلیٰ ہستیاں بھی ہوئی ہیں جنہوں نے خلوصِ دل سے دین سیکھا، سکھایا۔ اللہ کریم نے انہیں بے پناہ ظاہری علوم عطا فرمائے۔ اور ان کی ظاہری زندگی بھی لحہ بہ لحہ دین کے مطابق بسر ہوئی۔ کسی وجہ سے وہ یہ راز نہ پا سکے کہ کیفیاتِ باطنی کا حصول ایک الگ شعبہ ہے۔ اس ضمن میں ایک تجربہ ہوا۔ عرض کرتا ہوں شاید بہت سے لوگوں کی راہنمائی ہو سکے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ٹرانسپورٹ کے وسائل آج کل کی طرح نہیں تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سفر فرما رہے تھے۔ میں خادم ہمرکاب تھا۔ راستے میں ہمیں دوسری بس کے لیے انتظار کرنا تھا جس میں کافی وقت تھا۔ چکوال میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کسی صاحب کے پاس رکے۔ وہاں بات چیت ہوتی رہی۔ میں بھی سنتا رہا جن کے پاس ہم بیٹھے تھے ان کے شیخ صاحب حال اور صاحب کشف تھے۔ انہی دنوں حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا وصال ہوا تھا۔ سیّد انور شاہ کشمیریؒ علمی و عملی اعتبار سے اس زمانے میں یادگارِ سلف تھے۔ بہت اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ تمام علومِ ظاہری میں انتہائی اعلیٰ

پائے کے محقق تھے۔ آپ کا ارشاد حرفِ آخر ہوا کرتا تھا۔ ان کی زمانے میں نظیر نہیں ملتی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ پہلے زمانے کے لوگوں میں سے رہ گئے تھے۔ ان کی عملی زندگی اس قدر نیکی اور پارسائی پر تھی کہ بغیر کیفیات حاصل کیے، بغیر قلبی ذکر، لطائف و مراقبات کیے انہیں مشاہدات ہوتے تھے۔ برزخ دیکھتے تھے۔ اس کے بھی کئی واقعات میرے حافظے میں ہیں لیکن بات لمبی ہوجائے گی۔

جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اُن کا وصال ہوئے چند ماہ گزر چکے تھے۔ چکوال کی اس محفل میں صاحبِ خانہ نے یہ واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا کہ وہ تین ساتھی ویزا لے کر ہندوستان گئے۔ انور شاہ کشمیریؒ کے خاندان سے تعزیت کی۔ ان کی قبر مبارک پر فاتحہ کے لیے حاضر ہوئے۔ ان تینوں میں سے ایک ساتھی صاحبِ کشف تھا۔ برزخ میں بات کرسکتا تھا۔ اس کی شاہ صاحبؒ سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ حضرت شاہ صاحب نے مجھے تین باتیں ارشاد فرمائیں ہیں۔ دو وہ ہیں جو انہوں نے فرمایا کہ میرے بچوں کو یہ کہہ دینا۔ وہ تو ان کی امانت ہے۔ میں ان کے بچوں کو ہی بتاؤں گا۔ ایک بات انہوں نے مجھے بتائی۔ فرمایا، میں دنیا میں یہ سمجھتا تھا یہ میرا گمان تھا کہ اللہ نے مجھے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پائے کا عالم بنایا ہے۔ اللہ نے مجھے اتنے ہی علوم اور درجات دیے ہیں جو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو دیے تھے۔ برزخ میں آکر پتا چلا کہ علومِ ظاہری میں تو میں ان کے ہم پلہ ہوں لیکن علومِ باطنی کے باعث وہ کن بلندیوں پر چلے گئے! مجھے تو علومِ باطنی کی سمجھ ہی نہ آئی۔ میں تو زندگی بھر یہی سمجھتا رہا کہ قال اللہ اور قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تصوف ہے۔ یہ سمجھ ہی نہیں آئی کہ کیفیات حاصل کرنا ایک اور کام ہے۔ ہم تو اس غلط فہمی میں ہی رہ گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نہ صرف بہت عظیم محدث، مفسر اور عالمِ دین تھے بلکہ ان کے فنافی اللہ اور بقاباللہ کے مراقبات بھی تھے۔ انور شاہ کشمیریؒ کا اس طرف رجحان نہیں تھا تو فرمایا کہ دنیا میں مجھے سمجھ ہی نہ آئی کہ کیفیات حاصل کرنا ظاہری تعلیم سے جدا شعبہ ہے۔

اگر اس پائے کے لوگوں کو جن کی عملی زندگی ایسی اعلیٰ تھی کہ انہیں ازخود برزخ کا مشاہدہ ہوجاتا تھا۔ پھر بھی انہیں اس کی الگ محنت کی ضرورت تھی۔ وہ دنیا میں نہ ہوسکی تو انہیں برزخ میں اس کا افسوس تھا۔ اسی لیے سالکینِ راہ تصوف کو تلقین کی جاتی ہے کہ محنت سے ہی پھل ہے۔ باوجود اس کے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے۔ مومن دنیا کا ہر کام اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کرتا ہے، حکمِ الٰہی ہے کہ ان تمام امور سے جو لمحہ فرصت کا نکلے تو اللہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔ اللہ سے مدد مانگو، اللہ کا ذکر کرو، اسے یاد کرو اسی کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔

واعظین، مصنفین، اہلِ حق، علمائے دین جو دین کا کام کر رہے ہیں۔ جن سے اللہ کریم دین کا کام لے رہے ہیں ان کے لیے خصوصاً سب سے زیادہ ضروری ہے کہ ان کا دل روشن ہو، سینے، برکاتِ نبوت سے منور ہوں۔ تعلیمات نبوت بانٹنے کے لیے دل میں برکاتِ نبوت کا ہونا اُن میں روح ڈالنے کے مترادف ہے۔ آپ دین کا ایک لفظ کسی کو دیتے ہیں تو وہ محض ایک لفظ ہے۔ اس کے ساتھ دین کی کیفیات بھی دیں۔ پھر بات بنتی ہے۔ کیفیات حاصل کرنا پڑتی ہیں تب ہی آگے دی جا سکتی ہیں۔ خود حاصل نہیں کرے گا تو دے گا کیا؟ علمِ ظاہر نہیں سیکھے گا تو آگے کسی کو کیا بتائے گا؟ اسی طرح کمالاتِ باطنی حاصل نہیں کرے گا تو آگے کیا دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی میں رہ جاتے ہیں کہ سارا دن دین ہی کا کام تو کرتے ہیں!

دین کا کام کرنا اللہ کی عطا ہے۔ پھر بھی حکم ہے کہ کام سے جب فرصت ملے تو متوجہ الی اللہ ہوا جائے لہٰذا برکاتِ قلبی حاصل کرنا، اس کے لیے مجاہدہ کرنا، ذکر کرنا، مراقبات کرنا یعنی برکاتِ قلبی حاصل کرنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ یہی فرمایا گیا کہ یقیناً مشقت، محنت اور تکلیف کے بعد آسانیاں ہیں۔ محنت کے بعد کامیابیاں ہیں۔ اس محنت ومجاہدے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے۔ جب بھی فارغ ہوجائیں پوری طرح متوجہ الی اللہ ہوجایا کریں۔

سورۃ التین رکوع 1 آیات 1 تا 8

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ ۙ‏ ﴿۱﴾ وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ ۙ‏ ﴿۲﴾ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ ۙ‏ ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ ۙ‏ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ‏ ﴿۶﴾ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّيۡنِ ؕ‏ ﴿۷﴾ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡكَمِ الۡحٰكِمِيۡنَ ﴿۸﴾

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی ﴿۱﴾ اور طورِ سینین کی ﴿۲﴾ اور اس امن والے شہر کی ﴿۳﴾ کہ یقیناً ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ﴿۴﴾ پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو پست سے پست کر دیا ﴿۵﴾ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے بے انتہا اجر ہے ﴿۶﴾ تو پھر (اے انسان!) تُو جزا کے دن کو کیوں جھٹلاتا ہے؟ ﴿۷﴾ کیا اللہ سب سے بڑے حاکم نہیں؟ ﴿۸﴾

تفسیر و معارف

وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ ۙ‏ ﴿۱﴾ وَطُوۡرِ سِيۡنِيۡنَ ۙ‏ ﴿۲﴾ وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِيۡنِ ﴿۳﴾ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طورِ سینین کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔

سورۃ التین بھی مکّی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے۔ انجیر کی قسم، زیتون کی قسم، اور طورِ سینا کی قسم اور اس شہرِ امین یعنی امن والے شہر کی قسم۔ عرض کیا جاچکا کہ قسم سے مراد ہوتی ہے جس کی قسم دی جارہی ہے یہ اس بات پر گواہ ہے۔ انجیر اور زیتون دونوں غذائیں بھی ہیں دوائیں بھی ہیں۔ انجیر پھل ہے، غذا بھی ہے، دوا بھی ہے۔ زیتون کا پھل بھی استعمال ہوتا ہے اور تیل استعمال ہوتا ہے جو غذا بھی ہے اور بہترین دوا بھی ہے، یہ دونوں معدے کی

درستی کرتی ہیں خون کو صاف کرتی ہیں اعضائے رئیسہ کو طاقت دیتی ہیں چہرے پر بشاشت لاتی ہیں گویا وجودِ ظاہری کی تروتازگی کا سبب ہیں اس کے سنوارنے کا سبب ہیں اس کی صحت کا سبب ہیں اس میں حسن و جمال پیدا کرتی ہیں۔ فرمایا، انجیر اور زیتون اس بات پر گواہ ہیں اور طورِ سینین اور وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ اور یہ شہرِ امن جس میں کبھی تلوار اُٹھانے کی اجازت نہیں۔ فتح مکہ کے دن ایک دن کے لئے حلال ہوا تھا لیکن اُس دن بھی تلوار استعمال نہیں ہوئی تھی۔ اہلِ مکہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آج ایک دن کے لئے شہر آزاد ہوا اور یہ دونوں جگہیں طورِ سینا بھی اور مکہ مکرمہ بھی مہبطِ تجلیات ذاتی ہیں۔ طورِ سینا وہ جگہ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام ذاتی طور پر کلامِ باری سے مستفید ہوتے تھے اور کلامِ ذاتی سے مستفید ہونا روحانی ترقی کی انتہائی بلندیاں ہیں جس پر فرشتے کی بھی رسائی نہیں اسی طرح یہ شہر امین مہبطِ تجلیاتِ ذاتی ہے یہاں بیت اللہ شریف ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ بیت اللہ شریف بھی تجلیاتِ ذاتی کا مہبط ہے۔

انسان چونکہ بدن اور روح کا آمیزہ ہے بدن مادی ہے روح عالمِ امر سے ہے جہاں عالمِ خلق ختم ہوتا ہے وہاں سے عالمِ امر کی ابتداء ہوتی ہے گویا دو چیزیں مادی وجود کو سنوارنے کی ہیں اور دو جگہیں روحانی تجلیات اور ترقی اور روح کی بلندی اور سنوارنے کی ہیں۔ زیتون اور انجیر سے ظاہری صحت درست ہوتی ہے اعضائے رئیسہ قوت پکڑتے ہیں چہرے پر بشاشت آتی ہے تازگی آتی ہے۔ حسن و جمال میں اضافہ ہوتا ہے اور طورِ سنین اور بلدِ امین یعنی مکہ مکرمہ پر تجلیاتِ ذاتی کا نزول ہوتا ہے جو روحانی ترقی کی انتہاؤں کو پہنچا دیتی ہے تو فرمایا یہ چاروں چیزیں گواہ ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿۴﴾ "کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔"

بہت ہی خوب صورت اندازے پر پیدا فرمایا۔ کوئی چیز جو حسن میں اضافہ کرتی ہے یا قوت میں اضافہ کرتی ہے یا جمال کو سنوارتی ہے تو اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ جس کا حسن نکھرتا ہے اُس میں یہ استعداد ہو کہ اُس میں حسن پیدا کیا جا سکتا ہو۔ اس کے باطنی کمالات کو سنوارتی ہے تو اُس میں بنیادی تخلیقی طور پر یہ استعداد ہونی چاہیے کہ اُس سے نعمت اُس کو سنوار جا سکے جسے کوئی کاریگر زیور بنانا چاہتا ہے تو اُس کے لئے دھات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ سونا یا چاندی ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ اُس کے آگے پتھر رکھ دیں تو پتھر میں تو ڈھلنے کی استعداد بھی نہیں تو کاریگر اچھا بھی ہو تو پتھر سے کیا بنے گا؟ یعنی اگر کاریگر اچھا ہے تو جس چیز کو وہ سنوارنا چاہتا ہے اُس میں سنورنے کی استعداد بھی ہونی چاہیے۔ چاندی ہوگی تو جتنی چاندی کی قیمت ہے اتنا قیمتی حسین زیور بنے گا۔ اگر دھات سونا ہوگا سونے کی قیمت کا بن جائے گا۔ اگر ہیرا مل جائے گا اُس میں ہیرا جڑے گا تو اُس کی سینکڑوں گنا قیمت بڑھ جائے گی خوبصورتی بڑھ جائے گی حسن بڑھ جائے گا تو جو چیزیں حسن و جمال کو یا قیمت کو یا قدر کو بڑھاتی ہیں اُن کا اثر بھی اُسی پر ہوتا ہے جس میں

بڑھنے کی وہ استعداد بھی ہو فرمایا جمالِ ظاہری کو دو چیزیں بڑھاتی ہیں دو جمالِ باطنی کو بڑھاتی ہیں تو تب ہی بڑھاتی ہیں کہ انسان میں وہ بڑھوتری قبول کرنے کی استعداد ہے۔ یہ اس بات پر گواہ ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾ ''کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔'' اس کے اعضاء و جوارح اس کے ہاتھ پاؤں اس کے اعضاء کا تناسب اس کا قد کاٹھ، اس کی شکل وصورت، ناک کان، آنکھیں انتہائی موزوں انتہائی خوبصورت انداز سے ہر عضو اس میں جڑا گیا ہے اس کی جلد اس کا وجود، اس کا خون، اس کے دل کی حرکت، اس کے پھیپھڑے اس کا معدہ، جس جس طرح کام کرتا ہے۔ غذا کھاتا ہے خون بناتا ہے یہ ساری چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ اس میں سنورنے کی استعداد ہے یہ سونا ہے اسے مختلف زیورات کی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے اس میں ہیرے بھی جڑے جا سکتے ہیں اسی طرح اس کی روح عالمِ امر سے ہے تجلیات باری کی امین ہے۔ قربِ الٰہی کے مختلف مدارج کو پانے کی سکت رکھتی ہے۔ ان چاروں میں سے دو جمالِ ظاہری کی ضامن ہیں اور دو جمالِ باطنی کی یہ اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان میں بننے سنورنے کی استعداد ہے۔

اسے بہت خوبصورت انداز پر پیدا فرمایا گیا ہے جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے انسان کے سوا کسی میں بھی عالمِ امر کی روح نہیں ہے۔ صرف روحِ حیوانی ہے۔ آپ جانور کو تو اللہ اللہ نہیں سکھا سکتے۔ اُس کا قلب تو ذاکر نہیں ہو سکتا۔ اُس میں کمالِ باطنی تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ اُس میں انسانی جمالِ ظاہری بھی نہیں پیدا ہو سکتا آپ جو جو زیب و زینت انسان کی کرتے ہیں وہ جانور کی کرتے رہیں اُسے لباس پہناتے رہیں اُسے زیورات پہناتے رہیں اُس میں وہ حسن تو نہیں آتا وہ ان چیزوں کو بگاڑے گا، اُن کو توڑے گا، خراب بھی کرے گا۔ فرمایا، انسان جو غذا سے دوا سے اور انوارات وتجلیات سے ترقی پاتا ہے یہ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کی تخلیق بہترین انداز میں ہوئی یعنی اس میں جمالِ ظاہری کو قبول کرنے کی استعداد بھی ہے اور کمالاتِ باطنی کے حصول کی استعداد بھی ہے ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴿۵﴾ ''پھر (رفتہ رفتہ) اس کی (حالت) کو پست سے پست کر دیا۔'' آہستہ آہستہ جب یہ گرتا ہے تو سب سے نیچے چلا جاتا ہے درندوں سے جانوروں سے، کُتے بلی سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ کوئی بھی چیز جس مقصد کے لیے بنائی جاتی ہے اگر اُس مقصد کو نہ پا سکے تو وہ کباڑ ہو جاتی ہے انسان بڑی قیمت خرچ کر کے گھر بناتا ہے خود بناتا ہے۔ اگر وہ رہائش کے قابل نہ ہو تو خود بھی اسے گرا دیتا ہے۔ قیمتی لباس اور زیور تیار کرتا ہے۔ وہ استعمال کے قابل نہ ہو تو خود ہی اسے ضائع کر دیتا ہے۔ کوئی بھی چیز جس مقصد کے لیے بنتی ہے اگر وہ اس مقصد کو پورا نہ کرے تو بے کار ہے۔ جیسے انسان گاڑی بنائے لیکن وہ نہ سٹارٹ ہو نہ چلتی ہو تو کیا کرے گا؟ توڑ کر کباڑ میں بیچ دے گا۔ یعنی جو چیز اس مقصد کو نہیں پاتی جس کے لیے اُسے بنایا گیا پھر وہ کباڑ ہی ہو جاتی ہے۔ سب سے نچلے درجے میں چلی جاتی ہے۔ انسان بھی

جب اپنے مقصد سے بھٹکتا ہے تو جتنا اس کا مقام بلند ہے اتنا نیچے چلا جاتا ہے، جتنی بلندی سے کوئی گزرتا ہے اُتنی زیادہ چوٹیں آتی ہیں جب یہ اُن عظمتوں سے گرتا ہے تو جانوروں اور درندوں سے بھی نیچے چلا جاتا ہے ہم دیکھتے ہیں درندے بڑے بے رحم ہیں۔ ہم شیروں، چیتوں، جنگلی کتوں کو دیکھتے ہیں۔ بے چارے بھولے بھالے جانوروں کو چیر پھاڑ کر ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ جانوروں کے ننھے بچوں کو مار دیتے ہیں۔ بڑوں کو مار دیتے ہیں کوئی جانور ذرا کمزور یا بیمار ہو جائے تو کوئی اس کی حمایت نہیں کرتا بلکہ اُسے مار کے کھا جاتے ہیں لیکن ایک بات یاد رکھیں درندہ ضرورت پوری کرنے کے لیے درندگی کرتا ہے۔ بھوکا ہوتا ہے تو شکار کرتا ہے۔ اُس کا پیٹ بھرا ہو تو ساتھ ہرن چلتے رہیں اُنہیں کچھ نہیں کہتا۔ انسان اس سے بھی گر جاتا ہے۔ یہ محض تماشا دیکھنے کے لیے لوگوں کو تڑپاتا ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ مارتا ہے۔ اُن کی عزتیں لوٹتا ہے۔ مال لوٹتا ہے یہ نہیں کہ اسے اُس کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہیں یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔ انجوائے کرنا چاہتا ہے۔ جب یہ ظلم کرنے پر آتا ہے تو پھر اتنا ظلم کوئی درندہ بھی نہیں کرتا جتنا یہ کرتا ہے۔ سب سے نچلی سطح پر چلا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی عجیب مخلوق ہے، اللہ نے انسانوں کو سنبھالنے کے لیے پیامِ امن دیا اللہ کا پیغام پہنچایا گیا لیکن اس نے اپنے پیمانے بنا لیے اس نے روکنا چاہا کہ اللہ کی حکومت کیوں ہو؟ میری حکومت ہو۔ جو میں چاہتا ہوں، سب لوگ ویسا کریں۔ لوگ ویسا نہیں کرتے وہ کہتے ہیں اگر تم آدمی ہو، ہم بھی آدمی ہیں۔ جو تم کرو گے، سو ہم کریں گے۔ جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بات نہ مانی تو ہر جگہ بدامنی ہوگئی۔ پھر قیامِ امن کے لیے ایسا اسلحہ بنایا، ایسی چیزیں بنائیں جس نے کروڑوں انسانوں کو تباہ کر دیا، موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کسی درندے نے ساری زندگی میں اتنے خون نہیں کئے ہوں گے جتنے چند لمحوں میں ایک انسان کر دیتا ہے۔ درندے کی خصلت ہے کہ اپنی غذا کے لیے ان جانوروں کا خون کرتا ہے جو اُس کی فطری غذا ہیں۔ انسان نے انسانوں کو کھانا تو نہیں ہوتا۔ یہ اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کو ایک ایٹم سے مار دیتا ہے۔ ابھی روئے زمین پر دیکھ لیں کیا ہو رہا ہے چند سالوں میں کتنے انسان مارے گئے تباہ ہو گئے اب آج کل کیا ہو رہا ہے خود وطنِ عزیز میں دیکھ لیں مساجد میں بم پھوڑے جا رہے ہیں عبادت گاہوں کو اُڑایا جا رہا ہے گلیوں بازاروں میں قتل ہو رہا ہے یہ کیا ہے؟ انسان انسان پر اپنی رائے مسلط کرنا چاہتا ہے تو دوسرا اپنے جیسے بندے کی رائے کو کیوں مانے گا؟ اللہ کے احکام کے خلاف من مانی کرنا انسانیت سے نیچے گرا دیتا ہے۔ پھر ہم اس کو سب سے نیچے پہنچا دیتے ہیں یعنی اتنی بلندی پر پہنچایا اس نے وہ احسان نہ مانا اُس کا ادراک نہ کیا اُس کو نہ سمجھا اور درندگی کی طرف گرا تو پھر ہم نے اسے درندوں سے بھی نیچے پھینک دیا۔

ذلت سے بچنے کا راستہ:

اس درندگی ووحشت سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ ”سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے بے انتہا اجر ہے“ جنہیں نورِ ایمان نصیب ہوجائے جو عظمتِ الٰہی سے آشنا ہوجائیں جنہیں صداقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہوجائے اور جو اطاعتِ الٰہی پر یکسو ہوجائیں اپنے جیسے بندے کو کوئی کیوں مانے اُس کی کیوں نہ مانے جو سب کا خالق ہے، مالک ہے جس کے سامنے جواب دینا ہے جس کی ساری نعمتیں استعمال کر رہا ہے۔ جب اُس پر ایمان لے آئے تو پھر عملی زندگی اس کے مطابق گزارے۔ ایمان کیا ہے، ایمان کا مفہوم کیا ہے، ایمان کا معنیٰ کیا ہے، ایمان کی شرح وتفصیل کیا ہے، کس چیز کو ہم ایمان کہیں گے؟ فرمایا، ایمان قبول کرنے کے بعد اعمال صالح کرے۔ انسان عجیب ہے ہر بندہ جو کام بھی کرتا ہے معاشرہ یا دوسرے لوگ اسے بُرا کہتے رہیں اُس کے پاس اُس کا جواز ہوتا ہے وہ کسی کو قتل بھی کر دیتا ہے تو کہتا ہے یہی اس کا علاج تھا ڈاکہ ڈالتا ہے تو کہتا ہے ان کا علاج یہی تھا۔ انہوں نے یہ زیادتی کی، وہ زیادتی کی۔ اس کے پاس جواز یہی ہوتا ہے۔ جب ہر ایک کے پاس اپنے فعل کا جواز ہے تو یہ کیسے متعین ہوگا کہ کون سا کام صالح ہے اور کون سا نہیں؟ جس پر ساری انسانیت متفق ہوجائے وہ قولِ فیصل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: 7) ”اور جو چیز تم کو پیغمبر دے دیں تو وہ لے لو اور جس چیز سے منع فرمائیں سو اس سے باز رہو“۔

یعنی بارگاہ رسالت سے جو عطا ہو اس کو حرزِ جاں بنالو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز سے روک دیں اسے چھوڑ دو۔ جو حکم، جو عمل، جو نعمت، بارگاہِ رسالت سے عطا ہو وہ صالح ہے۔ وہی اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ وہی انسانیت کی بہتری کا راستہ ہے۔ وہی دنیا وآخرت میں کامیابی کا سبب ہے۔ وہی دونوں جہانوں کی کامیابی کی کنجی ہے۔ وہ نہیں گرتے جو دامنِ رسالت تھام لیتے ہیں۔ نورِ ایمان قبول کرلیتے ہیں۔ عظمتِ الٰہی کے قائل ہوجاتے ہیں۔ اُس ایمان کا تقاضا یہ ہے پھر اُن کی عملی زندگی اطاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھل جاتی ہے۔ اگر کوئی زبانی کلمہ پڑھتا رہتا ہے اور دعویٰ مسلمانی کا کرتا رہتا ہے اُس کا کردار ٹھیک نہیں ہوتا تو یہ دعویٰ ہے۔ اس کی سچائی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ عمل ہی دعوے کی دلیل ہے اور جو ایمان لاتے ہیں اور پھر عملِ صالح یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں اُن کو وہ انعام دیے جاتے ہیں جن کی کوئی حد نہیں کوئی انتہا نہیں۔ یعنی درجاتِ روحانی یا ثواب یا اللہ کے انعامات کی کوئی حد نہیں ہے۔ دنیا میں جنہیں مقامات نصیب ہوئے ہیں، مراقبات نصیب ہوتے ہیں روحانی ترقی

نصیب ہوتی ہے اگر شیخ میں استعداد ہو تو وہ ساری عمر ترقی کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ ایمان درست اور عمل صالح رہے۔ اُن کے ایمان میں خلل آ جائے یا اُن کے عمل میں خلل آ جائے تو یہ قصور اُن کا ہے۔ عمل صالح رہے ایمان سلامت رہے تو ہمیشہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اتفاقاً کسی مقام پر کسی مراقبے پر شیخ نہیں رہا یا شیخ کا وصال ہو گیا یا آگے سبق دینے والا کوئی نہیں۔ ایک مقام پر رُک گئے تو وہاں بھی ہر لمحے کیفیات بدلتی رہتی ہیں اور پہلے سے بہتر ہوتی رہتی ہیں آخرت میں جنت میں اس کا ظہور یہ ہوگا کہ ہر نعمت کی لذت اور لطف ہر لحہ بڑھتا رہے گا یہ نعمتیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو ایمان پر قائم ہو جاتے ہیں اور اُن کا کردار صالح یعنی دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھام لیتے ہیں۔ اتباعِ رسالت اختیار کر لیتے ہیں ان کو نہ رکنے والا نہ تھمنے والا غیر محدود انعام دیا جاتا ہے جو ہر لمحے بڑھتا رہتا ہے۔ ترقی کرتا رہتا ہے جس کی مقدار بھی بڑھتی رہتی ہے جس کی لذت و شیرینی بھی بڑھتی رہتی ہے۔

فرمایا: فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ﴿٧﴾ ''تو پھر (اے انسان!) تو جزا کے دن کو کیوں جھٹلاتا ہے؟'' یہ استفہامیہ جملہ ہے۔ سوالیہ انداز میں فرمایا گیا ہے کہ انسان تُو خود ہی بتا کہ جزا کے دن کے انکار کی تیرے پاس کیا دلیل ہے؟ کس چیز نے تجھے اس بات پر روکا کہ تُو قیامت کا انکار کرتا ہے تُو مخلوق ہے تُو جو چیز بناتا ہے اُس سے کوئی نتیجہ چاہتا ہے۔ کوئی چیز ادنیٰ سے ادنیٰ چھوٹی سے چھوٹی تُو بناتا ہے تو کسی کام کے لیے ہے کسی نتیجے کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر وہ کام نہ کرے تو تمہارے نزدیک بھی وہ بے کار ہے کون ایسا ہے جو بے مقصد سارا دن کچھ بناتا رہے یہ دنیا بچوں کا کھیل تو نہیں ہے کہ آئے اور چور سپاہی بن گئے یا مٹی کے گھر بنا لیے اور پھر توڑ کر چلے گئے۔ ایسا تو نہیں ہے یہ تو حقائق کی دنیا ہے اس میں تو ذی روح بستے ہیں اُن میں قبولیتِ حق اور معرفتِ حق کی استعداد رکھی ہے پھر وہ نافرمانی کر کے اس استعداد کو ضائع کرتے ہیں تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا؟ تمہارے پاس اس پر کوئی دلیل ہے؟ کوئی عقلی، نقلی کوئی دلیل ہے کوئی ایسی بات ہے جس پر قائم ہو کر تم اس کا انکار کرتے ہو؟

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨﴾ ''کیا اللہ سب سے بڑے حاکم نہیں؟'' کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ کیا بڑے بڑے شہنشاہ اُس کی ایک حقیری مخلوق نہیں ہیں؟ بڑے بڑے طاقت ور جابر، دولت مند، لاؤ لشکر کے مالک دم توڑ نہیں دیتے؟ بیمار نہیں ہوتے؟ مجبور و بے بس نظر نہیں آتے؟ سب پر اُس کی حکومت نہیں ہے؟ تو جب سب پر حکومت اُس کی ہے اور اُس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست اُس کی بات تم تک پہنچاتا ہے تو تم اُس کا انکار کرتے ہو؟ تم روزِ حشر کیا دلیل پیش کرو گے کہ ہم نے اس لیے انکار کیا تھا کہ تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور سوائے اس ایک ذریعے کے کہ نورِ ایمان نصیب ہو ممکن نہیں، ایسا نورِ ایمان جو اتباعِ رسالت پر قائم کر دے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو انسان درندوں سے بھی بدتر ہوگا آپ کافروں کو تو چھوڑ دیں اپنی مسلمان حکومتوں کو دیکھ لیں جو لوگ

کلمہ بھی پڑھتے ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں حکمرانوں میں بھی ایسے ہیں کہ نماز روزہ کرتے ہیں لیکن جب عمل کی باری آتی ہے۔ نظامِ اسلام کے نفاذ کی باری آتی ہے تو اللہ کے احکام سے سنتِ نبوی سے دامن چرا جاتے ہیں اور کافرانہ نظام جاری کرتے ہیں۔ اُس کے نتائج کیا ہیں؟ کیا خلقِ خدا کے ساتھ ظلم نہیں ہوتا؟ انصاف کے نام پر ظلم نہیں ڈھایا جاتا؟ عدالتوں میں رسوائی نہیں ہوتی؟ ہسپتالوں میں زیادتی نہیں ہوتی؟ جہاں رحم ہونا چاہیے، مدد ہونی چاہیے، علاج ہونا چاہیے۔ وہاں جعلی دوائیں، جعلی علاج پیسے لے کر دھوکا نہیں دیا جاتا؟ درندے تو ایسا ظلم نہیں کرتے!

انسان بھی وہی انسانیت کے لیے اور اپنے لیے اور دوسروں کے لیے مفید ہے نافع ہے جس کا ایمان کامل ہو۔ ایمانِ کامل کی دلیل یہ ہے کہ اس کا کردار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کے مطابق ہو، اگر عمل صالح نہیں ہے تو دعویٰ ایمان کا بھی کوئی بھروسہ نہیں اور جو ایمان ہی نہیں رکھتے اُن سے کسی خیر کی کیا توقع! اُنہوں نے تو ملکوں کے ملک تباہ کر دیے اور بعد میں کہہ دیا Sorry ہماری اطلاع غلط تھی۔ برطانوی وزیر اعظم نے بھی یہی کہا، امریکہ نے بھی یہی کہا۔ لاکھوں انسانوں کو تباہ کر کے، شہروں کو اُجاڑ کے کہہ دیا افسوس ہے، غلطی ہو گئی۔

ایک ہی راستہ ہے جس میں نجات ہے کہ ایمانِ کامل ہو۔ ایمانِ کامل کی دلیل یہ ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا دامن تھام لے عملی زندگی میں اُس پر قائم ہو جائے پھر اُس کو جو درجات نصیب ہوتے ہیں اُن میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔ لذتیں، شیرینیاں بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ درجات بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی انسان کے پاس قیامت کے انکار کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہر لحہ یہ آشکار ہے کہ ہر متنفس پر حقیقی حکومت اللہ کی ہے اور ہر ایک کو اُس کے حضور جانا ہے اور جواب دہی ہونی ہے!

سورۃ العلق رکوع 1 آیات 1 تا 19

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ
الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾ كَلَّآ اِنَّ
الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؕ﴿۸﴾ اَرَءَيْتَ
الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۰﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۙ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ
بِالتَّقْوٰى ؕ﴿۱۲﴾ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ﴿۱۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ؕ﴿۱۴﴾ كَلَّا
لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۙ﴿۱۵﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾ فَلْيَدْعُ
نَادِيَهٗ ۙ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۙ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩﴿۱۹﴾

(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم !) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیں جس نے (عالم کو)
پیدا کیا ﴿۱﴾ انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا ﴿۲﴾ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا
کریم ہے ﴿۳﴾ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا ﴿۴﴾ انسان کو وہ باتیں
سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا ﴿۵﴾ خبردار! یقیناً انسان سرکش ہو جاتا ہے ﴿۶﴾
جب خود کو غنی دیکھتا ہے ﴿۷﴾ یقیناً (اسے) آپ کے پروردگار کی طرف ہی لوٹ
کر جانا ہے ﴿۸﴾ بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے ﴿۹﴾ ایک بندے کو
جب وہ عبادت کرنے لگتا ہے ﴿۱۰﴾ بھلا دیکھو اگر یہ راہِ راست پر ہو ﴿۱۱﴾ یا
پرہیزگاری کا حکم کرے ﴿۱۲﴾ دیکھو تو اگر اس نے (دینِ حق کو) جھٹلایا اور (اس
سے) منہ موڑا ﴿۱۳﴾ کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ دیکھ رہے ہیں ﴿۱۴﴾ دیکھو! اگر
وہ باز نہ آئے گا تو ہم (اس کو) پیشانی کے بالوں سے گھسیٹیں گے ﴿۱۵﴾ اس

جھوٹے خطا کار کی پیشانی کے بال ﴿۱۶﴾ تو وہ اپنے ہم مجلسوں کو بلا لے ﴿۱۷﴾
ہم بھی (اپنے) مؤکلانِ دوزخ کو بلائیں گے ﴿۱۸﴾ خبردار! اس کا کہنا نہ ماننا اور
سجدہ کرنا اور (اللہ کا) قرب حاصل کرتے رہنا ﴿۱۹﴾

تفسیر و معارف

نزولِ وحی کی ابتدا:

سورۂ علق مکی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی پہلی پانچ آیات وہ ہیں جن سے نزولِ وحی شروع ہوا۔ یہ قرآن کی سب سے پہلی نازل ہونے والی آیات ہیں۔

اب تو مکہ مکرمہ کی آبادی غارِ حرا کے پہاڑ سے آگے نکل گئی ہے۔ اس وقت مکہ مکرمہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اور آبادی حرم کے گرد اگرد ہی تھی۔ وہ پہاڑ کافی دور تھا جس کی چوٹی غارِ حرا ہے۔ وہاں پہنچنا آج بھی مشکل ہے ایک جوان ہی جا سکتا ہے۔ بہت مشکل چڑھائی ہے اور چڑھ جائیں تو اترنا بھی مشکل ہوتا ہے چوٹی پر سے ذرا آگے نکل کر پتھروں کی تنگنائی کے درمیان سے گزر کر غارِ حرا تک پہنچا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا غار ہے، حجاجِ کرام یہاں حاضری دیتے ہیں اور نوافل ادا کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاجِ مبارک میں ایک فطری بے تابی اور بیقراری تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت میں لے جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ستو اور پانی لے کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں فروکش رہتے تھے۔ ذکر وفکر، اللہ اللہ اور یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ نبوت کا نور جو مزاج عالی میں تھا۔ اس کا ظہور ہونے کو تھا جیسے غنچہ چٹکنے سے پہلے بیقرار ہو جاتا ہے جب چٹکتا ہے تو پتیاں کھلنا شروع ہو جاتی ہیں اور آخرکار پھول بن جاتا ہے۔ یہی اضطراب سا تھا جو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے سارے جھمیلوں سے الگ کر کے حرا میں بیٹھنے پر مجبور کر دیتا۔ جس کا ذکر سورۃ الضحیٰ میں کیا گیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ: 7) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیتاب و بے قرار پایا تو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو راستہ دکھا دیا۔

اسی مقام پر نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ جبرئیل امین حاضر ہوئے اور وحی الٰہی کا نزول ہوا۔

علم حاصل کرنے کے کئی ذرائع ہیں۔ کچھ علوم فطری طور پر عطا ہوتے ہیں۔ انسان اور دیگر ذی حیات میں

بعض علوم فطری ہیں مثلاً مچھلی کا بچہ، پانی میں پیدا ہوتا ہے اور تیرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے کوئی سکھاتا نہیں! جانوروں کے بچے جنگلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ تلاش کر لیتے ہیں اور غذا حاصل کر لیتے ہیں انہیں درندوں سے چھپنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔ ماہرین بتاتے ہیں کہ شتر مرغ کا بچہ انڈے سے نکلتا ہے۔ اسے نکلے ابھی دس سیکنڈ ہی ہوتے ہیں کہ قدم اٹھا لیتا ہے اور چند قدم چل لیتا ہے۔ اس دوران اگر قریب سے بھیڑیا گزرے تو فوراً چھپ جاتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ بھیڑیے سے چھپنا ہے اور کس طرح چھپنا ہے۔ اسی طرح انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں سینے سے لگاتی ہے تو دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔ اسے کوئی سکھاتا تو نہیں کہ دودھ کیسے حاصل کرنا ہے۔ اسے بھوک لگے یا نیند آئے وہ بول تو سکتا نہیں اسے لیے روتا ہے اور اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ علوم فطری طور پر ودیعت کیے گئے ہیں۔

انسان کو اللہ کریم نے ایسا عجیب اور خوبصورت روپ عطا کیا ہے کہ اس میں بہت سے علوم سیکھنے کی استعداد ہے اور اس کی بنیاد پڑھنے پر ہے۔ علوم وہی سیکھتا ہے جو پڑھتا ہے اور آگے منتقل بھی وہی کرتا ہے جو لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ انسان میں یہ ایک فطری استعداد ہے کہ وہ لکھ پڑھ سکتا ہے۔

فطری استعداد نہ ہو تو جتنی محنت بھی کی جائے پڑھنا محال ہوتا ہے۔ انسان کو یہ استعداد حاصل ہے جانوروں کو نہیں۔ آپ کسی بھی جانور کو پڑھانا لکھانا چاہیں تو وہ لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کتنی بھی محنت کر لیں اس میں اس کی فطری استعداد ہی نہیں ہے۔ انسان میں خالقِ کائنات نے حصولِ علم کی فطری استعداد رکھی ہے جس کی بنیاد لکھنا پڑھنا ہے۔ لکھنا کیا ہے؟ ٹیڑھی ترچھی لکیریں ہیں اور کیا ہیں؟ ہر زبان کے حروف تہجی چند لکیریں گولائیاں شوشے نقطے وغیرہ ہیں لیکن ان کو مقرر اور متعین کر دیا گیا ہے کہ اس لکیر کی یہ آواز اس گولائی کی یہ آواز ہو گی۔ ان جملوں میں وہ باتیں ہوتی ہیں جو ہم آگے منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ان حروف والفاظ کا اصل مقصود وہ پیغام ہوتا ہے جو ان کے اندر ہوتا ہے۔ انسان اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لا کر لکھتا پڑھتا ہے۔ اسی کے باعث گزشتہ قوموں کے تجربات اور ان کے جمع کردہ علوم کو بھی حاصل کر سکتا ہے اور اسی صفت کے باعث علوم کو منتقل بھی کر سکتا ہے۔

عظمتِ اسمِ ذات:

فرمایا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیں جس نے (عالم کو) پیدا کیا"۔ یہ پہلی وحی اس بات کی دلیل ہے کہ ہر کام کی ابتدا ربِ جلیل کے نامِ نامی سے ہونی چاہیے۔ تخلیقِ عالم کا خالق وہ واحد و لاشریک ہے، ہر شئے، ہر چیز، ہر کیفیت کو اس نے پیدا فرمایا۔ اس میں

اثرات اور ان پر نتائج بھی وہی مرتب فرماتا ہے۔ جب اس کے ذاتی نام سے کسی کام کی ابتدا ہوگی تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس میں بہتر اثرات اور اس پر اچھے نتائج مرتب فرمائے۔

دوسری خوبصورت بات یہ ہے کہ جب اللہ کے نام سے ابتدا کریں گے تو کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے اللہ کریم نے منع فرمایا۔ بندے کو از خود حیا آجائے گی کہ چوری یا برائی کر رہا ہے، کوئی غیر شرعی کام کر رہا ہے اور ساتھ بسم اللہ بھی پڑھ رہا ہے! اصلاحِ احوال اور امور میں برکت کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے نام سے بنیاد رکھی جائے۔

دنیوی امور انجام دینے کے لیے اللہ کریم نے ظاہری اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور دنیا کے کام انجام دینے کے لیے عقل وخرد عطا کی ہے۔ انسان کا دماغ مادّی ہے۔ عقل مادّی ہے وجود مادّی ہے اس کی ضروریات کا ادراک کرنا اور ان کی تکمیل کے ذرائع دریافت کرنا یہ دماغ کا کام ہے۔ تعلیم حاصل کرنا، تحقیق کرنا، نئی نئی مفید ایجادات کرنا یہ سب مادّی دنیا میں رہنے کے لیے ضروری ہے۔ علومِ ظاہری کے حصول کے لیے جہاں اللہ کریم نے انسان کو استعداد دی ہے وہاں مختلف طریقوں سے کام لینے کی قابلیت بھی عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اقوام تعلیم وتعلم کے نت نئے اور مفید طریقے اختیار کرتی ہیں وہاں مادّی ترقی ہوتی ہے۔ یہ ضروری امور ہیں اور انہیں پوری محنت سے سرانجام دینا چاہیے یہ بھی یاد رہے کہ علومِ ظاہری، ایجاداتِ ظاہری اور مادّی ترقی کتنی انتہاؤں کو پہنچ جائے اس کے سارے فوائد وجودِ ظاہری کو پہنچتے ہیں اور وجود ظاہری کیا ہے؟ روح کے لیے ایک آلہ ہے جس کے بغیر روح اس عالم میں کام نہیں کرسکتی۔

روح کی تعلیم، عالم مادّی سے بہت بالاتر ہے۔ چونکہ روح عالمِ امر سے ہے اور عالمِ امر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں عالمِ خلق ختم ہوجاتا ہے۔ تخلیق کی حدود ختم ہوجاتی ہیں۔ روح کے علوم کی ابتدا بھی مادّی علوم کی انتہا سے آگے ہے لہٰذا اس کی ابتدا ان ظاہری حسیات پر نہیں بلکہ اس کی ابتدا اسمِ ذات پر ہے۔ فرمان باری بھی یہی ہے کہ اپنے ربّ کے ذاتی نام سے پڑھیے۔ چونکہ روحانی علوم کی ابتدا اللہ کے اسمِ ذات سے ہے اس لیے روحانی علوم کی جتنی تربیت گاہیں ہیں ان کے ذکر کے انداز مختلف ہوں، اوقات مختلف ہوں لیکن ذکر، اسمِ ذات ہی کا ہوگا۔

علمِ نافع وہ ہے جو عظمتِ الٰہی پر دلالت کرے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝١ ''(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیں۔ جس نے (عالم) کو پیدا کیا۔''

ارشاد ہوا کہ اپنے پروردگار کے نامِ نامی سے پڑھیے جس خالق نے، جس مالک نے پیدا فرمایا۔ جس نے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ جس نے یہ خصوصیت عطا فرمائی اس کے نام سے پڑھیے۔ یعنی علم، وہ نافع ہوگا جو عظمتِ الٰہی پر دلالت کرے۔ اسی صلاحیت کو اگر اللہ کی نافرمانی میں استعمال کریں گے تو یہ زہر بن جائے گا۔ وہی علم نافع ہے جو اللہ کا احسان یاد دلاتا ہو۔ بندے کو اللہ کا مطیع بناتا ہو۔ جیسے ایک بہترین شربت ہو۔ خوشبودار، لذیذ، مفرح قلب ہو لیکن اس میں زہر ملا دیا جائے تو پھر؟ جو پیئے گا مر جائے گا۔ علمِ نافع وہی ہے جو اللہ سے دور نہ لے جاتا ہو، قربِ الٰہی سے محروم نہ کرتا ہو بلکہ عظمتِ الٰہی سے آشنا کرتا ہو۔

خالق، صرف اللہ جلّ شانہٗ:

خالق صرف اللہ جل شانہٗ ہیں۔ جو عدم سے وجود میں لاتے ہیں۔ دنیا بھر کی اشیا کے موجد کہلانے والے موجودات کو جمع کر کے چیزیں ایجاد کر لیتے ہیں۔ وہ موجد ہیں خالق نہیں کیونکہ خالق صرف اللہ ہے کہ کچھ نہیں تھا تو اس نے سب کچھ تخلیق فرما دیا۔ اس کے تخلیق کردہ چیزوں کو مختلف ترتیب سے جوڑ کر چیزیں بنا لینا تخلیق نہیں۔ اس نے کائنات کو تخلیق فرمایا اور انسان کو تخلیق فرمایا۔

فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ "انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔" فرمایا، اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو خون کی ایک پھٹکی سے پیدا کیا۔ اس کے پیچھے کتنی نفاست، نزاکت اور طویل (PROCESS) ہے کہ خاک ہے۔ اس میں مختلف چیزیں اُگتی ہیں۔ وہ سب خاک کی صورتیں ہیں۔ پانی برستا ہے، سورج طلوع ہوتا ہے، گرمی دیتا ہے۔ مختلف ستاروں، سیاروں کے اثرات زمین پر آتے ہیں۔ ان اثرات کے نتیجے میں زمین کے ذرّات میں مختلف تبدیلیاں آتی ہیں۔ وہ ذرّات کہیں غذا کی صورت اختیار کرتے ہیں، کہیں دوا کا روپ دھارتے ہیں۔ کہیں پھول کھلتے ہیں کہیں پھل بنتے ہیں۔ مادّے میں سب کچھ ہے۔ مختلف کیمیائی عمل سے گزر کر مادّہ، غذا اور دوا کی صورت میں انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ جس بدن کا حصّہ ہو اسی کو پہنچتا ہے۔ آگے قدرت کو اس سے جو نسل چلانا مقصود ہوتی ہے وہ انسان ہو، حیوان ہو یا چرند پرند، اس کی اولاد کے سیل (CELL) نطفہ بن کر شکمِ مادر میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر خون کی ایک پھٹکی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مختلف مراحل سے گزر کر اللہ کریم اسے ایک جیتا جاگتا انسان بنا دیتے ہیں۔ مکمل انسان، جس میں آنکھوں کے آئینے بھی ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں بھی ہیں۔ زبان ہے دل و دماغ بھی ہے۔ اعضائے رئیسہ ہیں۔ کتنے مربوط اور ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے اجزا ہیں۔ کتنا حسّاس دماغ دے دیا، کتنا حسّاس دل پیدا کر دیا۔ اس وجود سے عالمِ امر کی روح کا جوڑ لگا یا۔ پھر اس میں وہ ادراک پیدا کر

دیا کہ وہ عظمتِ باری کو پا سکے۔ کس بنیاد سے اٹھایا اور کہاں پہنچا دیا۔ فرمایا، اس سارے فلسفے کو جاننے کے لیے، ان حکمتوں کو پانے کے لیے، ان باریکیوں کو سمجھنے کے لیے اسی کے نام سے ابتدا کرو جو سب کا خالق ہے۔ اسی کے حوالے سے، اسی کے نام سے، اسی کی رحمت سے، اسی کی عطا سے جانا جا سکتا ہے۔ اس کے نام کے بغیر انسانی صفات اور انسانی وقار نہیں رہے گا۔ مادّی ترقی ہوگی، اقدار نہیں ہوں گی۔ زَر زَر اور مادّہ مادّہ۔ کوئی انسانی رشتہ اور رشتے کا تقدس نہیں ہوگا۔

اللہ نے انسان بنایا ہے۔ اس کی عظمت رکھی ہے۔ انسان، اُنس سے ہے۔ انسان یعنی سراپا محبت۔ ایک انسانی معاشرہ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں سب کی بہتری ہوتی ہے۔ اگر کسی انسان کو سزائے موت دے کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو ایسے ہے جیسے کسی ڈاکٹر نے آپریشن کر کے جسم سے پھوڑا صاف کر دیا ہو۔ اسی طرح انسانی معاشرے میں اگر قتل بھی کیا جاتا ہے تو اس فرد کا جو اتنا بگڑ چکا ہوتا ہے کہ باقی معاشرے کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس سزا میں بھی محبت کا پہلو ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں ہر فرد دوسرے کے حقوق کی دیکھ بھال کرتا ہے، اس کے لیے آرام چاہتا ہے۔

اور جس معاشرے میں یہ فضا پیدا ہو جائے کہ میں ہی سب کچھ لے لوں۔ دوسرا پیدل چلتا ہے تو چلتا رہے مجھے ہوائی جہاز مل جانا چاہیے۔ دوسرا علاج کے بغیر مرتا ہے تو مرتا رہے، میرے پاس دنیا کے بہترین معالج ہونے چاہئیں تو یہ غیر انسانی معاشرہ ہے۔ اس سے انسانیت رخصت ہو گئی۔ ایک فرد کو زکام ہو اور وہ چیک اپ کے لیے ملک سے باہر چلا جائے اور دوسرا بیمار ہو کر ہسپتال جائے اور وہ فرش پر ہی مر جائے تو اس معاشرے کو کیا کہیں گے؟ غیر انسانی معاشرہ ہی کہیں گے!

اللہ کریم نے ہر انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا ہے۔ کوئی بنی آدم کہیں اور سے بن کر نہیں آیا۔ کوئی صدر، وزیر اعظم، گورنر، جرنیل، رئیس کسی اور خمیر سے نہیں بنا۔ اس کی تخلیق بھی اسی میٹریل اسی مادّے سے ہوئی ہے۔ اللہ نے سب کو انسان بنایا ہے یعنی اُنس کرنے والا۔ ایک دوسرے کا بھلا چاہنے والا۔ ایک دوسرے کے حقوق کا محافظ! اللہ نے تخلیق میں یہی اصول رکھا کہ دولت مند ہے یا غریب، حکمران ہے یا رعایا، مالک ہے یا مزارعہ سب ایک ہی سے بنے ہیں۔ مساوات کا معنی یہ نہیں کہ کام سرکاری ہو گئے۔ سب کو سرکاری کھانا ملے گا۔ ایسا ممکن نہیں ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں برابر نہیں۔ ایک ہی وجود میں ہاتھ اور پاؤں کی جلد ایک جیسی نہیں۔ ہر عضو دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر شے میں تفاوت ہے تو پھر مساوات کیا ہے؟

مساوات یہ ہے کہ جس طرح بدن ڈھانپا جاتا ہے پاؤں کو بھی ڈھانپا جائے۔ پاؤں کو جراب سے، جوتے سے ڈھانپا جائے نہ یہ کہ جراب کو سارے جسم پر پہنا جائے۔ مساوات یہ ہے کہ پاؤں کو جوتا نصیب ہو، وجود کو لباس اور سر کو دستار نصیب ہو۔ جو جس کا اہل ہے وہ اسے بلا روک ٹوک ملے۔ غریب ہے تو اس کے حقوق اسے بلا تکلف ملیں۔ امیر کو اس کے حقوق ملیں۔ طاقتور ہے تو اپنا حق پا سکے کمزور ہے تو کوئی اس کا حق روک نہ سکے۔ یہ مساوات، اسلامی ہے، فطری ہے اور انسانی ہے۔ یہی اسلام نے سکھایا ہے کہ انسان سب انسان ہیں۔ سب کے انسانی حقوق ہیں۔ سب کے حقوق کی پاسداری کی جائے اور اس کے مقام کے حساب سے جو اس کا حق ہے اسے دیا جائے۔

بدن میں آنکھ سب سے نازک ہے تو اللہ نے اسے چہرے پر رکھا ہے۔ اسے زیادہ محفوظ مقام پر رکھا ہے۔ انسان کے وجود میں پاؤں ہیں ان کا اپنا کام ہے ان میں بدن کا بوجھ برداشت کرنے کی استعداد ہے۔ انسان میلوں چل لیتا ہے پتھروں پر بھی چل لیتا ہے۔ برہنہ پا بھی چل لیتا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرے میں مختلف شعبے ہیں، مختلف کام ہیں۔ مختلف استعداد ہے، قابلیت ہے۔ ہر انسان کے حقوق مقرر ہیں۔ امیر غریب، بیمار صحت مند سب کے اپنے اپنے حقوق ہیں۔ انسانیت، محبت اور مساوات یہ ہے کہ جو جس کا حق ہے اسے بلا تکلف مل جائے۔ اس کے لیے اسے تکلیف نہ ہو۔ ایک آدمی جائز وسائل سے کماتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔ بیمار ہوتا ہے اور بیرونِ ملک علاج کے لیے جائز وسائل رکھتا ہے تو جائے۔ اپنے اخراجات پر علاج کرائے، اور غریب اپنے وسائل کے مطابق علاج کروائے۔ یہ نہ ہو کہ غریب کے لیے ڈسپنسری بھی بند ہو یا دوائیں غائب ہوں۔

فرمایا، اپنے پروردگار کے نام سے اس کے اسمِ ذات **اللہ** سے ابتدا کیجیے جس نے ایک خون کی پھٹکی سے انسان بنایا۔ محبت کا پیکر تخلیق کیا۔ گویا جس شخص سے محبت کا عنصر کھو گیا اس سے انسانیت کھو گئی۔ جب انس نفی ہو گیا تو پھر وہ انسان نہ رہا۔ انس، محبت اور پیار یہ نہیں کہ جراب سر پر پہنا دو اور سر کی دستار پاؤں سے لپیٹ دو۔ محبت یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اس تک پہنچے۔ جراب اور جوتا پاؤں تک پہنچے اور دستار سر تک پہنچے۔ کسی کی غریبی، کمزوری یا بیماری کی وجہ سے اس کا حق نہ رُکے۔ کوئی صاحب اقتدار یا زور آور اپنے حق سے زیادہ نہ لے سکے۔ یہ ہوتا ہے انسانی معاشرہ!

فرمایا، اپنے پروردگار کے نامِ نامی سے پڑھیے جس نے درۂ بے مقدار سے انسان پیدا فرمادیا۔ اسی کا نام اس قابل ہے کہ ان کیفیات کو، ان علوم کو جو انسان کو عظمتوں سے آشنا کرتے ہیں اور معرفتِ باری کا دروازہ کھولتے ہیں، اسمِ ذات سے شروع کیا جائے۔ ہر خیر کی ابتدا اسی کے نام سے ہوتی ہے۔

جبرئیل امین کا بھینچنا، ایک سبب تھا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرا میں تشریف فرما تھے کہ جبرئیل امین حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کی: اِقْرَاْ۔۔۔ پڑھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ میں پڑھ نہیں سکتا۔ پھر جبرئیل امین نے سینہ سے لگا کر خوب زور سے بھینچا۔ پھر عرض کی اب پڑھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ اس پر پہلے کی طرح پھر بھینچا اور عرض کیا، پڑھیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا، مجھے تو پڑھنا نہیں آتا۔ پھر تیسری مرتبہ بھینچا اور عرض کی کہیے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵

(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیں جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

پہلی وحی یہ مکمل پانچ آیات ہیں۔ نزولِ وحی کے وقت تجلیات وانواراتِ باری، قلب اطہر صلی اللہ علیہ وسلم میں انڈیلے گئے۔ نورِ نبوت تھا جس کی ابتدا ہو رہی تھی۔ اللہ نے عطا کرنا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کرنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ازل سے اسی لیے ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ ساری مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور تخلیق ہوا۔ دنیا میں آخر میں تشریف لائے۔ لیکن یہ سب باتیں عالمِ امر کی تھیں۔ عالمِ خلق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت پر تشریف لائے۔ بعثتِ عالی اپنے وقت پر ہوئی اور وہ تجلیات وبرکات جو قلبِ اطہر میں سموئی گئیں، جنہوں نے روشن ہو کر قیامت تک کی انسانیت کی راہنمائی کرنی تھی اس کی ابتدا جبرئیل امین کے سینے سے لگا کر بھینچنے سے ہوئی۔ عطا ربّ العالمین کی تھی۔ جبرئیل امین کا بھینچنا ایک سبب تھا!

اللہ کریم نے دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے۔ ہر کام کسی سبب کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ مرد و عورت کے اختلاط سے اولاد ہوتی ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرما دیا۔ پھر بھی سبب کے بغیر پیدا نہیں فرمایا۔ وہ سبب تھا جبرئیل امین کا بی بی مریم کو دم کرنا۔ اللہ کے حکم پر جبرئیل امین نے حضرت مریمؑ کو دم کر دیا۔ دیکھا جائے کہ جب وہ بغیر باپ کے پیدا ہو رہے تھے تو جبرئیل امین کے دم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کر رہے تھے تو دم کے بغیر بھی پیدا ہو جاتے۔ لیکن اللہ کریم نے دنیا میں اسباب کو ملحوظ رکھا، ضروری رکھا ہے۔

شاہ عبدالقادر رائے پوری عہدِ حاضر میں متقدمین کی مثال ہوئے ہیں۔ محدث بھی تھے، مفسر بھی اور

فقیہ بھی۔ بہت نامور ہستی ہیں۔ فرماتے ہیں، میں نے اس بات پر بہت غور کیا کہ ہر کام کسی سبب کے نتیجے میں کیوں ہوتا ہے؟ اللہ جلّ شانہٗ کرتے تو خود ہیں پھر درمیان میں سبب کو لانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہوتا قدرتِ باری سے ہے تو سیدھی بات سامنے کیوں نہیں آتی کہ یہ کام اللہ نے کر دیا۔ درمیان میں کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ بہت غور کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر سبب کا پردہ ہٹ جائے۔ حجابات ہٹ جائیں تو کچھ باقی نہ رہے۔ دنیا، تجلیاتِ باری کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہر چیز تباہ ہو جائے، خاک ہو جائے اس لیے تجلیاتِ باری پر حجابات یعنی اسباب کا پردہ ہوتا ہے۔ کرتے اللہ ہیں، سامنے سبب ہوتا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام ایک سبب تھے۔ عطا، ربّ کریم کی اور وصول کرنے والی ہستی حبیبِ کبریاؐ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جبرئیل امین کے بھینچنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے لگے۔

صوفیا کے ہاں یہی مسنون طریقہ رائج ہے:

صوفیا کسی کو حلقہء ذکر میں لیتے ہیں تو یہی مسنون طریقہ ہے کہ تین مرتبہ توجہ دیتے ہیں، ایک مرتبہ لطائف کرائے پھر توجہ دی پھر کرائے، یہ وہی سنّت ہے کہ ابتدا میں تین بار توجہ دی جائے۔ چونکہ کچھ علوم فطری ہیں جو بغیر کسی کے بتائے حاصل ہو جاتے ہیں۔ کچھ علوم حصولی ہیں جو سیکھنے اور حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علوم فطری ہیں جو بچہ سیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ باقی علوم معاشرے سے، والدین سے، ماحول سے سیکھ کر حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیم سے اور تجربات کر کے جانتا رہتا ہے۔ یہ سارے ظاہری مادّی علوم ہر انسان کے لیے ہیں۔ ان میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ دماغ درست ہونا شرط ہے کیونکہ ان علوم کے حصول کا تعلق دماغ، عقل و خرد سے ہے۔ سارے ظاہری علوم دماغ کی سلامتی کے محتاج ہیں اور یہ سب بدن کے کام آنے والے علوم ہیں۔

اصل انسان روح ہے۔ بدن اس کے لیے ایک سواری ہے۔ اصل انسان کے تمام علوم اللہ کی عطا سے ملتے ہیں۔ جس طرح ظاہری علوم کے لیے دماغ درست ہونا ضروری ہے۔ ان علوم کے لیے دل کا سلامت ہونا ضروری ہے۔ یہ علوم قلبِ انسانی حاصل کرتا ہے اور قلب سے مراد یہ لوتھڑا نہیں جو خون پمپ کرتا ہے بلکہ اس کے اندر ایک لطیفہء ربانی ہے جسے قرآن کریم قلب کہتا ہے۔ یہ قلب ہر انسان کو پیدائشی طور پر عطا ہوتا ہے۔ اب یہ الگ بات کہ کوئی اسے تباہ کر دے اور یہ کہ کوئی اسے سلامت رکھے۔ جس کا قلب سلامت رہے وہ علومِ باطنی حاصل کرتا ہے۔

یہ علوم دو طرح سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح ظاہری علوم میں زبانی تعلیم و تعلّم بھی ہوتا ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے اور استاد پڑھاتا ہے کہ کھیتی باڑی کے یہ اصول اور طریقے ہیں لیکن اس کی اصل سمجھ اس وقت آتی ہے جب خود

کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یا استاد جمع تفریق اور حساب کتاب سکھاتا ہے لیکن اس کی صحیح سمجھ اسی وقت آتی ہے جب دفتر میں بیٹھ کر یا دکان پر بیٹھ کر حساب کتاب کیا جاتا ہے۔

قلبی اور باطنی علوم بھی اسی طرح زبانی بھی تعلیم کیے جاتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم تمام علوم کا مصدر ہے۔ حدیث پاک علوم کا خزانہ ہے لیکن سمجھ، 'توجہ' سے آتی ہے۔ جیسے جبرئیل امین کا بھینچنا کہ نورِ نبوت کی ابتدا اللہ کریم نے 'توجہ' سے فرمائی۔

قرآنِ کریم وہ نصابِ زندگی بتاتا ہے جس سے قلب زندہ ہوتا ہے اور قوت پاتا ہے۔ حدیثِ پاک قرآنِ حکیم کی شرح ہے۔ وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ زندگی اس طرح بسر کرو۔ دنیوی امور اس طرح انجام دو۔ کمانے، خرچ کرنے، دوستی، دشمنی بلکہ سارے آدابِ دنیا سکھاتی ہے کہ ہر کام اس انداز سے کرو کہ قلب میں تازگی، قوت اور فرحت نصیب ہوتی رہے۔ لیکن حقیقتاً وہ تازگی اور فرحت وقوت آئے گی کہاں سے؟ توجہ سے۔ کوئی ساری عمر دین پر کاربند رہے۔ اس کی نجات ہو جائے گی۔ ترقیٔ درجات البتہ سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی توجہ سے نصیب ہوتے ہیں اور صوفیا کے ہاں توجہ دینے کی بنیاد اس پر ہے کہ نورِ نبوت کی ابتدا اللہ کریم نے 'توجہ' سے فرمائی۔ جبرئیل امین کو 'توجہ' دینے کا حکم دیا۔ یہ نہیں کہ جبرئیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیخ بن گئے۔ نہیں۔ جبرئیل امین ان برکات کے امین تھے جو اللہ نے عطا فرمائیں۔ جبرئیل امین وہ برکات پہنچانے کا ذریعہ تھے۔ جس طرح سارا قرآن جبرئیل امین نے پہنچایا اس میں کوئی نقطہ تک جبرئیل امین کا اپنا نہیں ہے۔ کلامِ الٰہی، اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ پہنچانے کا سبب اور ذریعہ البتہ جبرئیل امین تھے۔

جب یہ پانچ آیتیں نازل ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بارِ رسالت کی بھاری ذمہ داری کے احساس سے لرزہ طاری ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے آئے اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ مجھے ڈھانپ دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ پھر آپؓ نے تسلی دی اور اپنے قریبی عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل انجیل کے عالم تھے کافی عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا اور عرض کی کہ اگر زندگی وفا کرے تو میں آپ کی رفاقت میں رہوں لیکن ان کا چند روز میں ہی انتقال ہوگیا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہی ناموسِ اکبر، اللہ کا عظیم فرشتہ نازل ہوا ہے جو پہلے موسیٰ وعیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کاش! مجھے عمر مہلت دے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کروں جب یہ قوم آپ کو شہر سے نکال دے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دے گی۔ زندگی نے وفا نہ کی اور اس ضعیف کا انتقال ہوگیا۔

یہ نزولِ وحی کی ابتدا تھی جس میں اللہ کی شانِ کبریائی سے آغاز ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ ''انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔'' انسان کی تخلیق کا ذکر۔ تخلیق کے مراحل میں گزرنے والی مختلف حالتیں کہ کس طرح خون کی پھٹکی سے ایک باصلاحیت انسان بنا دیا۔ یہ سب آپ کے ربّ کی عظمت کی نشانیاں ہیں۔ اور: اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پروردگار بڑا کریم ہے:

ارشاد ہے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پروردگار ایسا کریم ہے کہ اس کے کرم کی کوئی انتہا نہیں۔ کوئی بھی احساناتِ الٰہی کو گن نہیں سکتا۔ آپ کا ربّ خالق ہے۔ مالک ہے۔ عطا کرنے والا ہے۔ ابرِ کرم برسانے والا ہے۔ وہ ایسا دینے والا ہے جس کی عطا مسلسل چل رہی ہے۔ ہر لحظہ، ہر آن جاری ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ ایک مرتبہ دے دیا اور بات ختم۔ ربوبیت نام ایسے دینے کا ہے جس میں رکاوٹ نہیں آتی۔ اللہ کریم مسلسل دیتے رہتے ہیں اور مخلوق مسلسل لیتی رہتی ہے۔ ذرّاتِ خاکی کو کن کن تبدیلیوں سے گزارتا ہے۔ غذائیں، دوائیں، پھل، اجناس، گوشت، دودھ، پانی سب کو کہاں کہاں سے اکٹھا کر کے انسان کے وجود کی نشوونما کرتا ہے۔ وجودِ انسانی سیلز (CELL) کا مجموعہ ہے۔ بنتے رہتے ہیں، جھڑتے رہتے ہیں۔ ہر عضوِ بدن کے اپنی طرز کے سیلز (CELL) ہیں۔ ہر عضوِ بدن کی مخصوص ساخت ہے اور انتہائی باریک بینی سے بنایا گیا نظام ہے۔ بہت نازک ہے۔ قوتِ سماعت کو ہی دیکھیں۔ آواز لہر کی صورت میں کان کے اندر پردے سے ٹکراتی ہے۔ اس ارتعاش کی لہریں دماغ میں جاتی ہیں۔ مختلف تکنیکی مراحل سے گزر کر ہمیں آواز کی صورت سنائی دیتی ہے۔ یہ الفاظ، جملے اور ان کا مفہوم سمجھ آ جاتا ہے۔ گویا ہر انسانی وجود میں ہر آن پروردگارِ عالم کی شانِ ربوبیت جاری ہے۔ اور یہ عمل صرف نیک بندوں کے ساتھ ہی نہیں ہو رہا ہر بندے کے لیے جاری ہے جب تک زندگی ہے تب تک یہ عمل بھی جاری ہے۔ یہ سب کے لیے عام ہے۔ ربّ کریم نے خود فیصلہ فرما دیا ہے کہ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود: 7) ''اور زمین پر جو بھی کوئی چلنے پھرنے والا ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے''۔ صرف انسان ہی نہیں تمام مخلوقات کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے خود اٹھا رکھی ہے۔ اس نے رزق کی ترسیل کا نظام جاری فرما رکھا ہے۔ ہر انسان کے رزق میں اس کے ذمہ داری کے حساب سے دوسرے کا رزق عطا کیا ہے۔ اب یہ ذمہ دار کا کام ہے کہ اللہ کے عطا کردہ رزق کو اس کے بندوں تک پہنچائے جن کی ذمہ داری اسے دی گئی ہے اور اللہ کے نظام میں رخنے نہ ڈالے۔ گھر کا حکمران ہو یا ملکوں کے حکمران وہ اپنی ذمہ داری ادا کریں تو کوئی بھوکوں نہیں مرتا۔

زمین سے اُگنے والی چیزوں کو دیکھیں قدرت کا نظامِ ترسیل رزق کس طرح کارفرما ہے۔ جڑیں زمین میں ہیں۔ وہ زمین سے غذا لیتی ہیں تنے سے گزر کر پتوں میں پہنچتی ہے۔ وہاں شمسی توانائی سے پکتی ہے۔ اور وہیں سے پودے کے ہر حصّے کو تقسیم ہوتی ہے۔ جڑ کا حصّہ جڑ کو جاتا ہے۔ تنے کا تنے کو، شاخوں کا حصّہ شاخوں کو اور پتوں پھولوں پھلوں کا حصّہ ان میں سے ہر ایک کو ملتا ہے۔ یہ ترسیلِ رزق کا عمل شجر وحجر، حیوان وطیور اور ہر مخلوق میں جاری ہے۔ کون کر رہا ہے؟ اے انسان! تمہارا کریم ربّ کر رہا ہے۔ تمہیں تخلیق کرنا، پالنا، نعمتیں عطا کرنا، یہ سب میری ذمہ داری ہے۔ تمہارے ذمہ کیا ہے؟ صرف اتنا کہ تمہارے دل سے میرے احسانات کے لیے تشکر اٹھے۔ تم نے دلی طور پر معترف ہونا ہے کہ اے میرے ربّ کریم! یہ سب آپ کے احسانات ہیں۔ بس بات ختم! باقی سب میرے ذمہ ہے۔

تمہارا کام صرف میرا کہنا مان کر زندگی گزارنا ہے۔ لیکن انسان کیسا عجیب ہے کہ اللہ کی کائنات میں اپنا حکم چلانا چاہتا ہے۔ اور ہر سطح کا انسان یہی چاہتا ہے۔ جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ اعلان کر دیتا ہے کہ مجھے سجدہ کرو، میں ہی خدا ہوں۔ بندہ اللہ کو نہیں مانتا، اس کے بندوں پر ظلم کرتا ہے پھر خود کو ہی برتر سمجھتا ہے۔ اپنی رائے اور فیصلے کو ہی بہترین سمجھتا ہے۔ فرعون اس کی مثال ہے لیکن عام انسان بھی یہی چاہتا ہے کہ جو وہ کہے وہی ہونا چاہیے۔ یہی خدائی دعویٰ ہے۔ مولوی رومیؒ نے کہا تھا:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست

آں کہ اُو را عون ما را عون نیست

ترجمہ: ہمارا نفس فرعون سے کم نہیں ہے اس کے پاس قوت تھی ہمارے پاس نہیں۔ مقابلے کا پہلا میدان تمہارا اپنا نفس ہے۔ اس سے جنگ کر کے خود کو آزما لو کہ تم آزاد ہو یا غلام۔ اور یہی وہ میدان ہے جہاں ہم بارہا شکست کھا جاتے ہیں۔ ہمارا نفس فرعون سے کم نہیں۔ اس کے پاس طاقت تھی اس نے اپنی خدائی کا اعلان کر دیا۔ ہمارے پاس وہ طاقت نہیں ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے سامنے سجدوں پر جھکا سکیں لیکن چاہتے ہم بھی یہی ہیں کہ جو ہم کہیں وہی ہو۔ اللہ فرماتے ہیں کہ تم اتنی سی بات مان لو کہ اے اللہ! یہ کائنات آپ کی ہے۔ آپ اسے پال رہے ہیں۔ میں آپ کا بندہ ہوں۔ مجھ پر آپ کے احسانات ہیں۔ میں آپ کی عطا کردہ شریعت پر عمل کا عہد کرتا ہوں۔ اور بات ختم

شریعت کیا ہے؟ اس مثال سے سمجھیں کہ آپ کے ہاں کچھ مہمان آجائیں۔ آپ ان کے لیے دستر خوان بچھائیں۔ کھانا لگائیں۔ ایک مہمان اٹھے اور گوشت کی پلیٹ حلوے میں انڈیل دے۔ سویوں کی پلیٹ اٹھائے اور اسے چاولوں میں پلٹ دے۔ کچھ اور اٹھیں۔ ایک دوسرے سے پلیٹیں چھیننے لگیں۔ کھانا اِدھر اُدھر پھینکیں۔ تو آپ کیا

محسوس کریں گے؟

یہ دنیا ربّ العالمین کا دستر خوان ہے۔ اس پر ہمارے لیے بے پناہ نعمتیں ہیں۔ ہم دستر خوان پر ہیں۔ ہم ان مہمانوں کی طرح نہ کریں۔ حلال و حرام نہ ملائیں۔ کسی دوسرے کا حق نہ چھینیں۔ رشوت، چوری، ڈاکہ سے مال نہ کھائیں۔ جو اللہ نے سامنے رکھا ہے اسے جائز طریقے سے حاصل کریں۔ اپنا حق لیں۔ دوسرے کا حق دیں۔ چھینا جھپٹی نہ کریں۔ بدتہذیبی سے اس کے دستر خوان کو تباہ نہ کریں۔ تمیز اور تہذیب سے کھا کر اٹھ جائیں۔

یہ شریعت ہے۔ اس طرح اللہ کے حکم مانتے رہے تو تمہاری دنیا کی ضرورتیں احسن طریقے سے پوری ہو جائیں گی اور آخرت کے انعامات عطا ہوں گے۔ ایسے انعامات جو انسانی تصور میں بھی نہیں آسکتے۔ ایسا کریم ہے، آپ کا پروردگار!

کریم ربّ نے چند لکیروں میں علم کو مقید کرنا سکھا دیا:

فرمایا: الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ﴿۴﴾ ''جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا''۔ فرمایا، تمہارا پروردگار وہ کریم ہے جس نے انسان کو بے پناہ علوم کے حصول کی استعداد بخشی پھر قلم اور چند لکیروں کے ذریعے اسے تعلیم و تعلم کے قابل بنا دیا۔ انسان کو ایسا شعور بخشا کہ اس نے چند لکیروں زبان کی حرکات کے ساتھ ملا کر علوم کی شناخت کے لیے حروف اور آوازیں مقرر کر لیں کہ یہ لکیر اس طرح ہوگی تو اسے الف کہا جائے گا۔ دوسرے انداز سے لکیر لگائیں گے اس میں نقطہ ڈالیں گے 'ب' مراد ہوگی۔ اسی طرح حروف ہیں الفاظ ہیں، الفاظ سے جملے پھر عبارت اور عبارت کا مفہوم ہوگا۔ لکھنے پڑھنے کے لیے یہ حروف و الفاظ تو ذریعہ ہیں۔ مقصد تو وہ بات ہے جو ان کے ذریعے آگے پہنچائی ہے۔ جیسے کسی پیاسے کو پانی پینا ہو اور وہ سارا دن کاغذ پر 'پانی چاہیے' لکھتا رہے تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اٹھ کر پانی پی لے گا تو پیاس بجھ جائے گی۔ یعنی حروف و الفاظ مقصد نہیں۔ وہ پیغام مقصد ہے جو ان میں پنہاں ہے۔ اسی لیے علمائے حق فرماتے ہیں کہ کاغذ، ان پر سیاہی اور یہ حروف، قرآن نہیں ہیں۔ ان میں جو مفہوم ہے وہ قرآن ہے۔ بالکل اسی طرح کہ عربی حروف تہجی کو لکھتے رہیں۔ ان سے جملے بنا کر بات کرتے رہیں تو جب تک وہ مفہوم ادا نہ کریں جو بات کہنے والے کا مقصد ہے تو محض عربی الفاظ مقصد نہیں ہوں گے۔ یعنی قرآن کے الفاظ میں جو مرادِ الٰہی مقید ہے وہ قرآن ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کا پروردگار ایسا کریم ہے کہ اس نے قلم سے علوم کے خزانے منتقل کرنے کا ہنر سکھا دیا۔ یہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ قلم کے ذریعے علم حاصل کرنے اور آگے پہنچانے کا سلیقہ سکھا دیا۔ یہ انسانی اوصاف میں سے اعلیٰ وصف ہے۔

عطائے الٰہی اور ہماری بدنصیبی:

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ انگریز کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی نے ہمیں تباہ کر دیا۔ ہماری پانچ نسلیں اس کی نذر ہو گئیں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا تصویر کھینچی۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

انگریزی تعلیم و تربیت کے نظام کے زیرِ اثر آ جانے والے مسلمان نوجوان رسمِ شاہبازی سے عاری ہو گئے۔ انگریز کے استعماری دور میں اللہ کے بندے جہاد کرتے رہے۔ انگریز کی غلامی سے نکلنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اللہ ان کی محنتیں قبول فرمائے انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ وہ بلا ٹل گئی۔ اللہ نے ٹال دی۔ لیکن ہمیں آزادی نصیب نہ ہو سکی۔ ہم غلاموں کے غلام ہو گئے۔ انگریز جاتے جاتے ہم پر ان لوگوں کو مسلط کر گئے جن کے نام مسلمانوں جیسے تھے لیکن ان کی سوچ فکر اور کام انگریز جیسے تھے۔ اب پون صدی سے ہم انگریز کے غلام نہیں بلکہ انگریز کے غلاموں کے غلام ہیں۔ آزادی کے بجائے ہم ایک درجہ مزید نیچے چلے گئے ہیں۔ ہمارا تعلیمی نصاب اپنا ہے نہ اندازِ فکر اپنا ہے۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں نہ ہی حلال و حرام کی تمیز کر سکتے ہیں۔ ہمارا نظامِ سیاست ہے نہ نظامِ عدل۔ ہمارے نوجوان ایم اے کر لیتے ہیں تعلیم کا پتا نہیں کیونکہ انگریز نے جو نظامِ تعلیم یہاں کے لیے بنایا اس میں لکھنے پڑھنے، تعلیم حاصل کرنے کو نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ کہا گیا کہ فارسی مت پڑھو۔ قرآن مت پڑھو۔ تفسیر اور حدیث مت پڑھو۔ احادیث کا ذخیرہ یاد کر کے کیا کرو گے؟ اچھی ملازمت نہیں ملے گی۔ مُلّا بن جاؤ گے۔ مُردے نہلاتے رہو گے۔ وہ علم سیکھو جن سے اچھی نوکری ملے۔ ہم نے یہ اچھی طرح سے سمجھ لیا کہ پڑھنا صرف اس لیے ہے کہ نوکری مل جائے۔

اسلام میں علم برائے علم کا جو تصور ہے۔ وہ انگریز نے ہمارے لیے ختم کر دیا۔ پھر علم نہ رہا حصولِ معاش کا ایک حیلہ ہو گیا۔ تعلیمی نظام بھی ایسا بنایا گیا کہ رٹا لگا کر جماعتیں پاس کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا خواہ ٹھیک سے لکھنا پڑھنا بھی نہ آتا ہو، شعور ہو نہ سمجھ ہو۔

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ ''انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' ان وسائلِ علم سے ان ذرائع سے انسان کو وہ حقیقتیں سمجھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ کریم اگر حصولِ علم کے یہ وسائل و ذرائع عطا نہ فرماتا تو انسان ترقی نہ کر سکتا۔ انہی ذرائع علم کے باعث وہ جو کبھی پیدل چلتا تھا، اس نے گھوڑے کی سواری سیکھی۔ موٹر بنائی، ٹرین ایجاد کی، ہوائی جہاز بنایا۔ آج اس میں وہ جدت ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک پورا شہر فضا میں تیر رہا ہے۔

مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے۔ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر کئی سو لوگ بیٹھے، کھاتے پیتے، خوش گپیاں کرتے سفر کرتے ہیں۔ گویا ایک شہر آباد ہے جو فضا میں تیر رہا ہے۔ اگر قلم کا، اس ذریعے سے تعلیم و تعلم کا تصور نکال دیں تو ساری ترقی دھڑام سے گر جائے۔ قلم سے ہی علوم آگے منتقل ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ کیسا کریم ہے ربِّ دو جہاں کہ قلم سے علوم منضبط کرنا اور منتقل کرنا سکھایا۔

یہ سارا اہتمام بدنِ انسانی کے لیے کیا گیا۔ انسان کے مادّی وجود کے لیے کیا گیا۔ لیکن صرف مادّی بدن تو انسان نہیں ہے۔ بدن کے ساتھ روح بھی ہے۔ روح نکل جائے تو بدن بے کار ہو جاتا ہے۔ میّت بن جاتا ہے۔ روح کے نکل جانے سے سارے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ روح تھی تو کوئی بھائی کہتا تھا کوئی بیٹا۔ روح نکل گئی تو میّت کہلانے لگا۔ اسی لیے علمائے کرام کہتے ہیں کہ جب انسان کہا جائے تو اس سے مراد روح ہے۔ بدن تو روح کی سواری ہے۔ ایک آلہ ہے جس کو استعمال کر کے اس دنیا میں اپنے دن پورے کرتا ہے۔ اس کے لیے اتنا اہتمام ہے تو روح جو اس سے اربوں گنا اعلیٰ ہے۔ اس کے لیے کتنا اہتمام ہوگا!

اس کے لیے اللہ نے انبیاءؑ مبعوث فرمائے۔ اور اپنا ذاتی کلام نازل فرمایا۔ اس دنیا میں اللہ سے براہ راست رابطہ کرنا مخلوق کے لیے ممکن نہیں۔ تجلیاتِ باری سے اگر پردے ہٹ جائیں تو مخلوق جل کر ختم ہو جائے۔ مخلوق اسے برداشت نہ کر پائے! مخلوق اسے براہ راست برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اللہ نے خاص انسان تخلیق فرمائے۔ تخلیقی طور پر خاص وجود پیدا فرمائے جنہیں نبی علیہ السلام کہا گیا۔ نبیؑ بھی انسان ہوئے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد۔ سب ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے۔ وہ سب کھانا کھاتے، پانی پیتے۔ اسی ہوا اور روشنی کی انہیں بھی ضرورت رہی۔ گویا ان میں سارے بشری اوصاف تھے۔

انبیاءؑ کی چند خصوصیات ان سے مختص تھیں۔ اوّل یہ کہ نبیؑ تخلیقی طور پر معصوم تھے۔ ان سے گناہ کا صدور ممکن نہیں۔ ہر نبیؑ صادق اور امین تھا۔ اگر گناہ کا ہلکا سا شائبہ بھی ہوتا تو نقص آ جاتا اور استعداد ختم ہو جاتی۔ نبوت کی ایک اور صفت ہے کہ مخلوق کو خالق سے ہمکلام کر دیتے۔ اللہ کریم تو اپنے بندوں کی بات براہ راست سن لیتے ہیں۔ ہر بندہ اللہ کی بات نہیں سن سکتا۔ یہ استعداد صرف نبیوں میں رکھی گئی۔ نبیؑ اللہ سے سنتے اور اس کے بندوں کو پہنچا دیتے۔ ہر نبیؑ نے امانت و دیانت کا حق ادا کیا اور اللہ کا پیغام پوری دلسوزی کے ساتھ مِنْ وعَنْ پہنچایا۔ نبیؑ معصوم بنائے گئے اس لیے انبیاءؑ کے علاوہ کوئی اللہ کی بات اس دنیا میں براہ راست سن نہیں سکتا۔ جب یہ دنیا ختم ہوگی۔ آخرت شروع ہوگی تو ہر مومن اپنے ایمان و عمل صالح اور خلوص کے مطابق دیدارِ باری سے نوازا جائے گا۔ کلام باری بھی سن سکے گا۔ اس دن کافر اپنے کفر کی وجہ سے محروم رہے گا۔ نہ دیدار کر سکے گا نہ ہی کلامِ الٰہی سن سکے گا۔

کافر، انبیاؑ کا انکار کرتے ہوئے یہی کہتے تھے کہ یہ تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ عام انسانوں کی طرح چلتا پھرتا ہے تو یہ کیسے نبیؑ ہو گیا؟ نبیؑ بشر ہوتا ہے۔ بشری اوصاف کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کی بشریت ایسی پاکیزہ اور منور ہوتی ہے کہ اس پر وحی الٰہی اترتی ہے۔ اللہ نے نورِ نبوت عطا فرما کر انبیاؑ کو مختص کیا۔ ان کے ذریعہ انسانوں کو علوم پہنچائے۔ جس طرح قلم کو حصولِ علم اور انتقالِ علم کا ذریعہ بنایا اسی طرح انبیاؑ کو ان علوم کے منتقل کرنے کا ذریعہ بنایا جو بدن کے لیے بھی از حد ضروری تھے۔ اور روح کے لیے تو حیات کی حیثیت رکھتے تھے۔ قلم نے تو سارے ظاہری علوم منتقل کیے۔ مومن و کافر کی تخصیص کے بغیر کیے۔ مومن بھی پڑھ سکتا ہے اور کافر بھی لیکن وہ لطافتیں اور نزاکتیں جن کا تعلق ایمانیات سے ہے تجلیاتِ باری سے ہے ان کے لیے قلب میں جو پاکیزگی اور طہارت چاہیے تھی وہ نبیؑ کو عطا کی۔ پھر جو نبیؑ پر ایمان لاتا گیا اس میں اتنی لطافت آتی گئی کہ وہ برکاتِ نبی علیہ السلام قبول کر سکے۔

یہ فرق ہے نبیؑ اور اُمتی میں۔ اُمتی نبیؑ جیسا نہیں ہو سکتا۔ نبیؑ، اُمتی کی طرح نہیں ہوتا۔ یہ فرق لطافت و نزاکت کا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں انبیاؑ کا وجود بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ وہی اعضا یعنی چہرہ، ہاتھ پاؤں وہی ضروریات، سردی گرمی، لباس غذا۔ وجود ایک جیسا لیکن بڑا فاصلہ ہے! نبیؑ، نبیؑ ہوتا ہے۔ اُمتی، اُمتی ہوتا ہے۔ نبیؑ ازل سے نبی تخلیق کیے گئے۔ بظاہر ایک ہی طرح کے انسان ہوتے ہیں لیکن نبیؑ کی لطافت و پاکیزگی کا فرق ایسا ہے جو غیر نبی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ نبیؑ کلامِ باری وصول کرتا ہے۔ کلامِ باری میں کلام کی کیفیات ہوتی ہیں۔ کیفیات کا اندازہ ہر شخص کو ہے۔ آپ کسی سے ناراض ہوتے ہیں۔ غصہ میں کچھ کہہ جاتے ہیں۔ کیا وہ صرف الفاظ ہوتے ہیں؟ نہیں۔ غصہ کی کیفیت بھی ساتھ ہوتی ہے۔ دوسرے کو محسوس ہوتا ہے کہ اسے جھڑکا گیا ہے۔ اسی طرح کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اسے شاباش کہتے ہیں۔ کیا وہ صرف الفاظ ہوتے ہیں؟ الفاظ تو محض اظہار کے لیے ہوتے ہیں اصل تو وہ کیفیت ہے جو آپ کے چہرے کی بشاشت سے اور مسکراہٹ سے نظر آتی ہے۔

ہر متکلم کے کلام میں اس کی ذات کی کیفیت ہے تو اللہ کے کلام میں یہ کیفیات کس اعلیٰ درجے کی ہیں! انبیاؑ جب اللہ کریم سے تعلیمات و کیفیات وصول کرتے ہیں تو اللہ کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ جب انبیاؑ ارشاد فرماتے ہیں تو یہ کیفیات منتقل ہو جاتی ہیں۔ مومن وصول کر لیتا ہے۔ کافر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے کسی پاگل کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس سے غصہ کرتے رہیں یا مسکراتے رہیں۔ اسی طرح کلامِ الٰہی سے کافروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر وہ کہتے ہیں یہ ماننے والی بات نہیں کہ مردے زندہ ہوں گے۔ مومن جب کلامِ الٰہی سنتا ہے تو ایسا یقین پاتا ہے گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ مردے زندہ ہو رہے ہیں۔ کفر پاگل پن ہے۔ اس میں کیفیات نہیں آتیں۔

ایمان دل و دماغ کی درستگی ہے۔ اللہ کریم نے جس طرح قلم کو علوم ظاہری منتقل کرنے کا ذریعہ بنایا۔

علومِ باطنی، روحانی اور قلبی علوم کو منتقل کرنے کا ایک باطنی ذریعہ بنا دیا۔ تمام انبیائے کرام کو بارگاہِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہوا۔ انبیاؑ سے ان کے صحابہ کرامؓ نے پایا۔ صحابہؓ سے اللہ کے مقرب بندوں نے پایا۔ ان سے علمائے حق، اولیا اللہ پاتے ہیں اور آگے ہم جیسوں پر تقسیم فرماتے ہیں۔ آگے ہمارا اپنا کردار کہ ہم خود کو کتنا اس قابل بناتے ہیں کہ کلامِ الٰہی، پیغامِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہماری سمجھ میں آئے۔ ہم نے اپنے تک آنے والی تار پر کتنے جوڑ اور ٹانکے لگا رکھے ہیں۔ کتنے گناہ ہیں جو اسے دور روک دیتے ہیں۔

نفس کی لذّتیں اور خواہشیں جدا ہیں۔ بانسری کی لے ہو تو توجہ کھینچ لیتی ہے۔ سریلا گانا ہو تو بندہ سر دھنتا ہے۔ ڈھول بجے تو اچھا بھلا بندہ کودنے لگ جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ ایک صدا ہے، لے ہے جس میں توازن ہے جو توجہ کو سلب کر لیتی ہے۔ اگر اتنی لذّت نفس کو لبھانے والی آواز میں ہے تو روح کو سرور بخشنے والے کلام، کلامِ الٰہی میں نہیں! ارشاداتِ باری جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر سے مترشح ہو کر ارشاداتِ نبوی میں ڈھلتے ہیں، ان کو سن کر لذّت نہیں آتی! اس پر کہتے ہیں کہ یہ پرانی باتیں ہیں۔ مولوی چودہ سو سال پرانی باتیں لیے بیٹھے ہیں۔

جب دل سیاہ ہو گئے۔ گناہوں نے لذّتِ سماعت چھین لی تو مولوی کو الزام دیں گے۔ ارشاداتِ باری اور ارشاداتِ نبوی کی لذّت پانے کے لیے دل کو صاف کرو۔ عقیدہ درست کرو۔ غذا حلال کرو۔ کردار صحیح کرو۔ پھر پتا چلے گا کہ بات مُلّا کی نہیں بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

حاصلِ کلام:

اللہ کریم اپنے کرم کے انداز بیان فرما رہے ہیں۔ اس سورت کی یہ پہلی پانچ آیات وہ ہیں جو حرا میں پہلی وحی نازل ہو رہی ہے۔ پہلی وحی میں حصولِ علم کی، انتقالِ علم کی بات ہو رہی ہے۔ تعلیم و تعلّم کی بات ہو رہی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ معرفتِ حق کا دروازہ علم ہے۔ عظمتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے شناسائی کا دروازہ علم ہے، جاننا علم ہے، کتابیں چاٹنا علم نہیں!

صحابہ کرامؓ نے کتنی یونیورسٹیوں سے پڑھا۔ کتنے مدارس میں گئے۔ کتنی سندیں اور کتنی ڈگریاں حاصل کیں؟ صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم کے خزانے انؓ کے قلوب میں انڈیل دیے۔ ظاہری علوم بھی ایسے بٹے کہ مثالی عالم بنے۔ چند لوگ ہی پڑھے لکھے تھے باقی سب اونٹوں کے چرواہے۔ صحراؤں کے باسی۔ معیشت و معاشرت کے قواعد و ضوابط سے ناآشنا۔ معاشرے کے باغی بارگاہِ رسالت میں پہنچے تو نورِ ایمان سے سیراب ہو گئے۔ جو خود کبھی مُردہ تھے۔ ایمان کے بغیر تھے۔ اب انؓ کی نگاہوں سے زندگی بٹنے لگی۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

صحبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال تھا کہ کسی ادارے میں ٹریننگ حاصل کی نہ فوجی تربیت پائی۔ اونٹوں کا گلّہ چھوڑ کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ایک رات بسر کی۔ صبح لشکر جا رہا تھا۔ فرمایا، اس لشکر کا کمانڈر یہ ہوگا۔ تاریخ سے کہو ان جرنیلوں میں سے کسی کا نام بھلا کر دکھائے۔ انہیں سارا فوجی علم حاصل ہوگیا۔ سارے کورس طے ہو گئے۔ جو خزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر سے ان کے دل میں منتقل ہوا وہ علم تھا۔ وہؓ دنیا کے تمام علوم میں بہترین درجہ پا گئے!

باطنی اور روحانی علم تو ایسی عجیب نعمت ہے کہ جب یہ عطا ہوتی ہے تو ظاہری علوم از خود کھنچے چلے آتے ہیں۔ علمِ ظاہر میں یہ طاقت نہیں کہ علمِ باطن کو ساتھ کھینچ لائے۔ علم ظاہر سایہ ہے، علمِ باطن اصل ہے۔ سایہ اصل کے ساتھ چلتا ہے۔ سایے کے ساتھ اصل نہیں چلتا۔ جتنے لوگوں کو بھی کمالاتِ باطنی نصیب ہوں گے وہ دنیوی اور ظاہری معاملات میں بھی سب سے زیادہ معاملہ فہم ہوں گے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور بھی حقائقِ باطنی سے آشنا نہیں ہو سکتا جب تک ایمان نہ لائے۔ ہم حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ کیا لمحے تھے!

وہ عجیب لمحے تھے۔ ہر لمحہ قیمتی! کسی نے بات کی کہ ہندوستان کا وزیر اعظم مر گیا، بڑا دانشور، سیاسی مدبر اور اچھا حکمران تھا۔ ہمارے ساتھی قاضی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب سادہ سے آدمی تھے۔ قرآن کریم بغل میں لیے پھرتے تھے۔ جب فرصت ملتی نوافل پڑھتے۔ تلاوت کرتے ورنہ لپیٹ کر ساتھ رکھ لیتے۔ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ ضعیف ہو چکے تھے پھر بھی پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتے اور کہتے اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ زیادہ پڑھا نہیں جاتا۔ وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ہندو حکمران کی تعریفیں سنیں تو بول پڑے کہ عجیب بات ہے کہ تم ایسے شخص کو ذہین اور عقلمند کہہ رہے ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچان سکا۔ وہ عقلمند ہوتا تو مسلمان ہو جاتا!

کیا اندازِ فکر ہے! بندوں کو جانچنے کا کیا پیمانہ ہے! قاضی صاحب نے کسی مدرسے، سکول یا کالج سے روایتی طور پر نہیں پڑھا تھا۔ یہ تعلق کی بات ہے۔ ان نازک ترین کیفیات کو جو تعلق باللہ پیدا کرتی ہیں اس کے لیے اللہ کریم نے ہر دور میں انبیاؑ بھیجے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر یہ نعمت اپنے کمال کو پہنچی۔ مالک کے ساتھ مخلوق ہونے کا تعلق تو ہر ایک کا ہے لیکن محبت کا، فدا ہو جانے کا، فنا ہو جانے کا تعلق اسلام ہے۔ اسلام ان کیفیات کا نام ہے جو ان علوم کے ذریعے سمجھی سمجھائی جاتی ہیں۔ لیکن محسوس تب ہوتی ہیں جب قلوب سے قلوب میں آتی ہیں۔ دین کے احکام، طریقے، قاعدے وضابطے قلم کے ذریعے منتقل کر دیے۔ کیفیاتِ محبت اور تعلق باللہ کے لیے انبیاؑ کے قلوب کو ذریعہ بنا دیا۔ اس کی بنیادی شرط طہارت ہے۔ عقیدے کی طہارت، اعمال و کردار کی طہارت۔ نبیؑ اپنے وقت میں سب سے اعلیٰ ہستی ہوتا رہا۔ عقیدہ بھی صاف ستھرا، کردار بھی انتہائی پاکیزہ۔ وہ اللہ سے وحی حاصل کرتا اور بندوں تک پہنچاتا۔

ربّ کریم کے کرم کا ایک انداز توبہ کی توفیق ارزاں کرنا اور توبہ قبول کرنا ہے۔ وہ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ہے۔

بہت احسان کرنے والا۔ بندہ ساری زندگی گناہ پر گناہ کرتا رہے تو بھی کسی کو رد نہیں کرتا۔ فرماتا ہے۔ خلوص دل سے نادم ہو کر میری بارگاہ میں تائب ہو جاؤ۔ اصلاحِ احوال کر لو۔ میں نہیں پوچھوں گا کتنا عرصہ بھٹکتے رہے ہو۔ اس سے زیادہ کرم کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

فرعون جیسے متکبر کو بھی مہلت عمل دی جو خود کہتا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النّٰزعٰت: 24) کہتا تھا اوّل تو کوئی پروردگار ہے نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو مجھ سے چھوٹا ہوگا۔ میں تو سب سے اعلیٰ ربّ ہوں۔ قرآن نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ اللہ کے کرم کے انداز دیکھیں! اللہ نے اپنے دو نبی علیہ السلام اس کے پاس بھیجے۔ اور اپنے نبیوںؑ سے فرمایا: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ (طٰہٰ: 44) ''پھر اس کے ساتھ نرم انداز میں بات کیجیے گا ہو سکتا ہے وہ (غور کر کے) نصیحت حاصل کرے یا (عذاب سے) ڈر جائے۔''

اللہ نے اپنے پیارے دو نبیؑ بھیجے اور انہیں تاکید فرمائی کہ اس متکبر سے بھی بات نرمی سے کریں شاید کہ وہ اپنی اصلاح احوال کر لے۔ بھلا اس سے بڑی رعایت کوئی ہو سکتی ہے!

ربّ کے کرم کی کوئی انتہا نہیں۔ فرمایا: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝٥ ''انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' اگر ربّ کریم قلم اور دیگر وسائل نہ دیتے تو علوم کے خزانے نسلوں کو منتقل نہ ہوتے۔ باطنی علوم سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کا نظام نہ ہوتا تو ایمانیات اور یقین کی کیفیات قلوب سے قلوب کو نہ پہنچتیں۔

بغاوت اور سرکشی:

انسان جب وحیٔ الٰہی کی نگرانی سے باہر رہتا ہے، باہر رہنا پسند کرتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے۔ اسی بات کا ذکر ہو رہا ہے۔ فرمایا: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۝٦ ''خبردار! یقیناً انسان سرکش ہو جاتا ہے۔'' بغاوت اور سرکشی کیا ہے؟ حاکم کے دیے ہوئے قاعدے اور ضابطے کے خلاف کرنا۔ اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنا۔ جو جی میں آئے کرنا۔ کسی پابندی کی پروا نہ کرنا۔ خبردار کیا جا رہا ہے کہ اللہ کے حکم کے بجائے خواہشِ نفس پر عمل کرنا۔ اللہ کے ارشاد پر اپنی رائے کو مقدم سمجھنا سرکشی ہے۔

دنیا میں انسان جو بھی عمل کرتا ہے اسے اپنا کمال سمجھتا ہے۔ اگر وہ کمال ہے تو گناہ کیسے بن گیا؟ کوئی آدمی ہیرا پھیری کر کے پیسے جمع کر لیتا ہے تو اسے اپنا کمال سمجھتا ہے کہ اتنی دولت جمع کر لی۔ کوئی دوسرا لوگوں کو زیر کر کے حکمران بن جاتا ہے تو بڑا فخر کرتا ہے۔ کوئی بھی کام اپنی پسند سے کرتا ہے، اپنی مرضی پوری کر لیتا ہے تو اسے اپنا کمال سمجھتا ہے۔ تو پھر یہ جرم کیسے ہے؟ جرم یہ ہے کہ یہ کائنات انسان نے نہیں بنائی۔ اس میں جو نعمتیں ہیں وہ بھی انسان

نے نہیں بنائیں۔ اس میں جتنی مخلوق ہے، انسان نے انہیں تخلیق نہیں کیا تو اسے یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ ان پر اپنا تصرف کرے۔ یہ حق اسی ہستی کو ہے جو سب کا خالق ہے۔ جس نے مخلوق بنائی اس نے ان کے حقوق متعین کر دیے۔ ان حقوق کے مطابق زندگی بسر کرنا اطاعتِ الٰہی ہے۔ عبادت ہے۔ جہاں سے ان حقوق و فرائض کی خلاف ورزی ہوگی وہ سرکشی اور بغاوت ہے۔ جہاں حقوق پامال ہوں گے وہ بغاوت ہوگی۔ اسے گناہ کہا جائے گا۔ وہ جرم ہوگا۔

اتباعِ شریعت عبادت ہے:

انسان کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ کی کائنات میں وہ فطری امور کا پابند ہے۔ کچھ قوانین فطری ہیں جن میں انسان کو دخل نہیں۔ پیدا ہونا، مرنا، نیند، بیداری، نظامِ بدن، غذا دوا ان کی تاثیر یہ سب فطری ہیں۔ دن رات کا آنا جانا، سورج، ستارے، سیارے۔ موسموں کا تغیر و تبدل، ہواؤں کا چلنا، بارشوں کا برسنا، اشیا کا اگنا یہ سب قدرتی عمل ہے۔ انسان رات کو دن میں تبدیل کر سکتا ہے نہ دن کو رات بنا سکتا ہے۔ گرمی کو سردی میں نہیں بدل سکتا نہ گرمی کو سردی میں تبدیل کر سکتا ہے۔

ہاں! کچھ امور ایسے ہیں جہاں اللہ نے اسے اختیار دیا ہے۔ وہ بہت تھوڑے امور ہیں۔ اور وہی اس کی آزمائش ہیں۔ ان امور میں اللہ کریم نے حقوق و فرائض متعین کر دیے ہیں کہ یہ کرنا فرض ہے۔ یہ ذمہ داری ہے۔ ان میں ایسا توازن رکھ دیا ہے کہ ایک فرد کا فرض دوسرے کا حق ہے۔ جو اس کے ذمہ فرض ہے وہ دوسرے کا حق ہے۔ اگر ہر کوئی اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرے تو سارے معاشرے کو ان کے حقوق ملتے رہیں گے۔ اسی کو عبادت کہا گیا ہے۔

عبادت کے دو شعبے ہیں۔ ایک شعبہ یہ ہے کہ بندہ ذاتی طور پر اللہ سے لو لگاتا ہے جس کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے۔ تلاوت اور ذکرِ الٰہی ہے۔ اس کا حاصل کیا ہے؟ ساری عمر ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ثواب ہوگا۔ ثواب کی بدولت حوریں ملیں گی۔ سجدوں کے عوض محل ملیں گے۔ نماز، ذکر اذکار، عبادات کے بدلے حوریں اور محلات نہیں توفیقِ عمل ملتی ہے۔ جنت کے محل اور حوریں جنت میں جانے والوں کے لیے اللہ کے انعامات ہیں۔ انعام مالکِ حقیقی کی عطائے محض ہے۔ کوئی عوضانہ نہیں۔

قرآن کریم میں عبادات کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت:45) ''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔'' نماز کا ثواب، اجر یا بدلہ یہ ہے کہ عبادات بے حیائی اور برائی سے روکنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ عبادات سے اللہ کریم کے ساتھ ایک ذاتی تعلق بنتا ہے۔ وہ تعلق بندے کو اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور اللہ کی نافرمانی سے روکتا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا ثواب یہ

ہے کہ بندے کو توفیقِ عمل ارزاں ہوتی ہے۔ نیک عمل پر انعام ملتا ہے۔ انعام آخرت میں ہے۔ اسے خواہ آپ جنت کہیں، حور کہیں، محل کہیں۔ تجلیات باری کہیں، جمالِ باری کہیں، احسانِ الٰہی کہیں! جو نام چاہیں دیتے رہیں وہ انعام ہے، اجرت نہیں۔ انسان اپنے پیدا ہونے سے پہلے اجرت لے چکا! اللہ کریم نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے انسان کے لیے کائنات بنائی۔ زمین و آسمان، موسم بنائے۔ اتنے عالم آباد کیے۔ اس کی غذا و دوا کے لیے نعمتیں پیدا کیں۔ انسان کو حواس دیے۔ عقل و شعور دیا۔ اعضا و جوارح دیے۔ صرف نگاہ کی نعمت کو ہی دیکھ لیں۔ ساری زندگی بصارت استعمال کرتا ہے۔ ساری عمر سجدے میں پڑا رہے تو بھی اس کی قیمت پوری نہیں کر سکتا تو باقی نعمتوں کا کیا حساب! لہٰذا عبادت اس لیے کرو کہ ربّ سے تعلق بنا سکو۔

انسان کی سرکشی کا سبب:

انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک اپنی ہر ضرورت کے لیے ربِّ کریم کا محتاج ہے۔ اتنی محتاجی کے باوجود اور اللہ کریم کی اس قدر نعمتوں کو استعمال کرنے کے باوجود وہ سرکش کیوں ہو جاتا ہے؟ فرمایا: اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰی ﴿۷﴾ ''جب خود کو غنی دیکھتا ہے۔'' اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجۡعٰی ﴿۸﴾ ''یقیناً (اسے) آپ کے پروردگار کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔'' جب بندہ خود کو مستغنی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ اللہ کی عطا کو ذاتی کمال سمجھنے لگتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ اسے اللہ کی محتاجی نہیں، وہ خود کفیل ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود کر رہا ہے تو یہ احساس اسے اللہ سے باغی بنا دیتا ہے۔ جب اسے اللہ کے احسانات کا احساس نہیں رہتا، ادراک نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے میرے سارے کام میرے کرنے سے ہو رہے ہیں۔ یہ احساس اسے سرکش بنا دیتا ہے۔ جب اللہ سے بغاوت کرتا ہے تو اس ڈگر پر چل پڑتا ہے کہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتا ہے۔ اللہ کی راہ سے روکنے، سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ عملی زندگی میں اسلام نافذ کرنے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنا۔ اسلام کے نظامِ حیات کو معاشرے پر لاگو نہ ہونے دینا۔ یہی روش عہد نبوی میں کفار و مشرکین کی تھی اور یہی انداز آج اسلام دشمن قوتوں کا ہے۔ خواہ وہ غیر مسلم ممالک ہوں یا مسلمانوں پر مسلط وہ حکمران جو نظامِ اسلام کے نفاذ کے خلاف ہیں۔

انسان کی سرکشی کا سبب اپنے آپ کو اللہ سے مستغنی سمجھنا ہے۔ بندہ جب خود کو اللہ سے مستغنی سمجھ لے تو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے آڑے آ جاتا ہے۔ مال، دولت، اقتدار جو اللہ کی عطا ہے اسے ذاتی کمال سمجھ کر اس پر اتراتا ہے۔ اکڑتا ہے اور اللہ کی کائنات میں من مانی کرنا چاہتا ہے۔ نہ صرف خود اسلام سے دور رہتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی اسلام سے روکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی مسلمان کو اسلامی طرزِ حیات اور قوانینِ شریعت سے روکا جاتا ہے۔ نماز پڑھنے

سے کوئی نہیں روکتا۔ روئے زمین پر پھر کر دیکھ لیں کسی ملک میں نماز پڑھنا منع نہیں ہے۔ نمازیں تو اسرائیل میں بھی ہو رہی ہیں۔ چین، جاپان، یورپ، امریکہ میں بھی پڑھی جا رہی ہیں۔ کہیں کوئی ملک ایسا ہے جہاں نماز پر پابندی ہے؟ روزہ رکھنے سے کوئی نہیں روکتا۔

روئے زمین سے لوگ حج کے لیے آتے ہیں لیکن نفاذِ اسلام اور اسلامی قوانین پر عمل کرنے کی کہاں کہاں اجازت ہے؟ مسلمان ملکوں میں بھی نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی نہیں ہے۔ لوگ خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں وہ ہوگا۔ سیاست وحکومت ہو یا معیشت وعدالت کا کوئی قاعدہ۔

فرمایا: اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ؔ ''جب خود کو غنی دیکھتا ہے۔'' اچھی طرح سن لو! انسان باغی اور سرکش ہو جاتا ہے جب وہ احساناتِ الٰہی کو بھول جاتا ہے۔ اللہ کے دیے ہوئے مال و دولت کو اپنا سمجھتا ہے۔ مال کی وجہ سے غنی ہو جاتا ہے۔ پھر سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی ہے اور وہ خود مالک ہے۔ یہ وہ جملہ ہے جو آج نسل کے نوکِ زباں ہے۔ کسی نوجوان بچے بچی سے کہیں کہ یہ کام ایسے نہ کرو تو کہتا ہے، ''میری اپنی زندگی ہے، میں جیسے چاہوں کروں''۔

زندگی تو اللہ کی عطا ہے۔ ایک نعمت ہے۔ زندگی جس کی عطا ہے اس کی مرضی سے گزارو گے تو اچھی گزرے گی۔ اچھے حالات ہوں گے۔ آخرت میں انعامات ملیں گے۔ اس میں سراسر انسان کا ہی فائدہ ہے لیکن انسان جب اللہ سے بگاڑ لے تو اس کا شعور بھی مسخ ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجۡعٰى ؕ ''یقیناً (اے) آپ کے پروردگار کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔'' فرمایا، مت بھولو کہ تمہیں واپس اللہ کی بارگاہ میں آنا ہے۔ اس کی بارگاہ میں، جس نے تمہیں پیدا کیا جو تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ اتنی وسیع کائنات سجا کر تمہیں اجازت دی کہ اسے استعمال کرو۔ ہر شے تمہارے لیے مسخر کر دی۔ تم عدم سے آئے تھے لیکن اب تمہیں فنا نہیں ہونا۔ دنیا ایک آزمائش کا دور ہے۔ امتحان اور ابتلا کا دور ہے۔ دنیا سے واپس جا کر اس دنیا میں جو کیا اس کا نتیجہ دیکھنا ہے۔ آزمائش یہی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر تم نے اس کی عظمت کو پایا یا خود خدا بن بیٹھے۔ دو میں سے ایک کام ہوا۔ اپنی مرضی نافذ کرتے رہے یا اللہ کی پسند سے جیے۔ اس کی پسند نافذ کی تو انعام پاؤ گے ورنہ سزا پاؤ گے۔ یہ تقاضائے ربوبیت ہے کہ تم واپس جاؤ۔ قانونِ فطرت تمہیں بتا رہا ہے کہ واپس جانا ہے۔

قرآن کا نزول خاص ہے، حکم عام ہے:

فرمایا: اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يَنۡهٰى ؕ ''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے۔ عَبۡدًا اِذَا صَلّٰى ؕ ''ایک بندے کو جب وہ عبادت کرنے لگتا ہے۔'' فرمایا جا رہا ہے کہ کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جو اللہ کے بندوں

کو اللہ کی اطاعت نہیں کرنے دیتے۔ اللہ کے عطا کردہ ضابطوں کے مطابق زندگی نہیں گزارنے دیتے۔ اپنے قوانین نافذ کرتے ہیں اور ضوابطِ الٰہی سے روکتے ہیں۔

ہم اس آیت پر سے بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ اسے خود پر لاگو نہیں کرتے۔ بلاشبہ اس آیت کا شانِ نزول ایک خاص واقعہ ہے لیکن حق یہ ہے کہ قرآن کا نزول اگرچہ خاص ہے لیکن حکم عام ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے اور مشرک روکتے تھے وہ دور تو بیت گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دارِ دنیا سے پردہ فرما گئے۔ کفار و مشرکین مر گئے۔ اس آیت کا کیا حکم ہے؟ قرآن قیامت تک کے لیے ہے۔ اس کے احکام قیامت تک کے لیے راہنما ہیں۔ اس آیت میں اصول ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نماز سے روکنا گویا اسلامی طرزِ حیات سے روکنا ہے۔ اللہ کی کائنات پر اللہ کے احکام نافذ کرنے سے روکنا ہے۔ جو شخص بھی انفرادی طور پر ایسا کر رہا ہے یا حکمران قومی سطح پر ایسے اقدامات کیے ہوئے ہیں جن میں اسلامی قوانین، اسلامی طرزِ تعلیم، اسلامی معیشت کو نافذ ہونے سے روکتے ہیں۔ وہ سب اس آیت کا مصداق ہیں کہ جو شخص اسلامی اقدار اور اللہ کی اطاعت پر زندگی گزارنا چاہتا ہے اسے روکا جاتا ہے۔ روئے زمین پر دیکھا جاسکتا ہے کہ امریکہ سے جاپان تک، آسٹریلیا اور یورپ کہیں بھی نماز سے نہیں روکا جاتا۔ اسلامی قوانین سے ہی روکا جاتا ہے۔ صلوٰۃ کا اصلی معنی ہے خلوصِ دل سے اطاعتِ الٰہی! نماز اس کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اطاعتِ الٰہی کی اعلیٰ ترین صورت خلوص، خضوع اور خشوع سے نماز میں قیام، رکوع اور سجود بھی ہے۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد ادائیگی صلوٰۃ بھی ہے اور ہر لمحہ اللہ کی اطاعت کرنا بھی۔ یعنی نمازی شخص جہاں نمازوں کا پابند ہو وہاں اس کے معاملات احکامِ الٰہی کے مطابق ہوں۔ اس کے تعلقات اللہ کے قانون کے مطابق ہوں۔ اس کا لین دین کاروبار اللہ کے ارشاد کردہ جائز وسائل کے مطابق ہو۔ اس کی معاشرت اور ذاتی زندگی پاکیزہ ہو۔ کمانے اور خرچ کرنے کا طریقہ وسلیقہ وہ ہو جو اللہ نے تعلیم فرمایا ہے۔ ان ضابطوں کی پابندی کرتا ہو۔ جو طریقے اللہ نے تعلیم فرمائے ہیں ان میں ساری مخلوق کے حقوق کا تحفظ ہے۔ جو طریقے انسان بناتے ہیں وہ چند انسانوں کو بڑا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ باقی سب کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں۔ کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو اللہ نے بتایا ہو۔ ملک میں عدالتی نظام انگریز کا بنایا ہوا ہی جاری ہے۔ اس میں یہ حال ہے کہ جو لوگ جیلوں میں فوت ہو چکے ان کی وفات کے دو سال بعد عدالت کا حکم آیا کہ وہ مقدمے میں بری کر دیے گئے ہیں۔ پچھلے چند ماہ میں غالباً یہ چھٹا مقدمہ ہے کہ ملزم جیلوں میں مر گئے اور عدالت نے سال ہا سال بعد انہیں بری کر دیا۔ یہ کون سا انصاف ہے؟ کاروبار میں سودی نظام جاری ہے۔ اپنی مرضی کے ٹیکس ہیں۔ زکوٰۃ کے نام پر جمع کر کے سیاسی رشوت دی جا رہی ہے۔ پڑھتے رہو نمازیں کیا ہوگا؟ نمازیں تو اللہ سے تعلق بنانے کے لیے ہیں۔ نماز فرض ہے، اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اللہ سے راز و نیاز کی سعادت ہے لیکن اس کا وہ نتیجہ بھی ہو جو قرآن نے بتایا ہے!

راہِ راست پر ہونے کا معیار:

اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی ﴿۱۱﴾ ''بھلا دیکھو! اگر یہ راہِ راست پر ہو۔'' اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی ﴿۱۲﴾ ''یا پرہیزگاری کا حکم کرے۔''

فرمایا، اگر یہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ نہ ہوتے۔ اگر یہ صحیح راستے پر ہوتے تو تقویٰ یعنی خلوصِ دل سے اللہ کی اطاعت کرتے اور لوگوں کو بھی تقویٰ کے راستے پر چلاتے۔ کہتے کہ آپس کے تعلقات ایسے رکھو جیسے اللہ کریم بتاتے ہیں، کاروبارِ حیات ایسے چلاؤ جیسے اللہ کریم نے حکم دیا ہے۔ پھر تو اسلام نافذ ہوتا۔ قانون، اسلامی ہوتے۔ معاشرت اسلامی ہوتی۔ تعلیم و تعلم اسلامی ہوتا۔ تحقیق اور ریسرچ انسانوں کی بھلائی کے لیے ہوتی!

بندے کے نیک یا باغی ہونے کا پتا ہی اس وقت چلتا ہے جب عملی زندگی وہ اللہ کی پسند کے مطابق گزارتا ہے یا اللہ کی پسند کے خلاف! یہ صرف حکمرانوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ ہر فرد کے لیے ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ عالی ہے:

کُلُّکُمۡ رَاعٍ وَ کُلُّکُمۡ مَسۡئُوۡلٌ عَنۡ رَعِیَّتِهٖ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن) یعنی ہر بندے کا ایک دائرہ اختیار ہے۔ کوئی ملک کا حکمران ہے۔ کوئی کسی صوبے کا۔ کوئی قبیلے کا یا محلے برداری کا اور اپنے گھر کا۔ اپنے آپ کا تو ہر کوئی حکمران ہے۔ اور ایک سے اس کی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا۔ اگر بندے کا حکم صرف اس کی ذات پر چلتا تھا تو اپنی ذات کا ہی حساب دے گا۔ چند لوگوں تک چلتا تھا تو انہی کا جواب دے گا۔ ملک کے حکمران سے ساری عوام کا۔ پیر صاحب، مولوی صاحب سے ان تمام لوگوں کا جو ان کی بات سنتے تھے۔ دنیا میں مقدس بن کر جیتے رہے پتا تب چلے گا جب بارگاہ الٰہی میں جواب دینا پڑے گا کہ لوگوں کو اسلام کے مطابق جینا سکھایا تھا؟ عظمتِ الٰہی بتائی تھی، کیا لوگوں کو تلقین کی تھی کہ دنیا میں اللہ کے بنائے ہوئے ضابطے کے مطابق رہو۔ خود خدا نہ بنو۔

آج گھر گھر جھگڑا ہے۔ میاں بیوی، اولاد، والدین، بھائی، بھائیوں میں جھگڑا ہے۔ ہر جگہ لوگ خدائی کا دعویٰ لیے پھرتے ہیں۔ کوئی چھوٹا خدا ہے کوئی بڑا۔ جتنے کسی کے پاس اختیارات ہیں اتنا ہی بڑا اس کا خدائی کا دعویٰ ہے۔ ہر کوئی کہتا ہے، جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ جو میں چاہتا ہوں وہ ہو۔ سارے فساد کی جڑ یہی ہے۔ اگر دونوں یہ کہہ دیں کہ جو اللہ چاہتے ہیں وہ کریں تو جھگڑا ختم۔

یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ جو ہدایات پر ہوتا ہے وہ نیکی ،تقویٰ پر خود کار بند ہوتا ہے اور دوسروں کو اپنے عمل سے ترغیب دلاتا ہے۔ اپنے دائرہ کار میں اللہ کی بات ماننے کا کہتا ہے۔ اس میں آپ کی سبکی نہ میری سبکی۔ آپ کی بڑائی نہ میری بڑائی۔ عظمت صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں ہم ویسا کریں جیسا وہ چاہتا ہے۔

تقویٰ کا نتیجہ ،مخلوق کی بہتری:

فرمایا، جو بندہ صحیح راستے پر ہو وہ تقویٰ کا حکم کرتا ہے۔ تقویٰ ایک کیفیت ہے۔ اللہ کریم کے احسانات کا احساس لیے ہوئے بندے کو بندہ ہونے کا اور اللہ کریم کے مالک ہونے کا یقین ہو جائے تو خلوص کے ساتھ اللہ کریم سے ایسا تعلق پیدا ہو جائے کہ پھر بندہ ڈرے کہ کہیں اس تعلق میں بال نہ آ جائے۔ اس کیفیت کو تقویٰ کہتے ہیں۔ تقویٰ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ تمام امور میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب اللہ جلّ شانہٗ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کے تمام کاموں میں مخلوقِ الٰہی کی بہتری ہوتی ہے۔

نیکی کا صرف یہ تصور نہیں ہے کہ بندہ ذاتی طور پر نیک ہو گیا۔ اس نے فرائض کے بعد نوافل، تسبیحات اور عباداتِ نافلہ کر لیں اور نیکی میں کامل ہو گیا۔ نہیں۔ نیکی کا تصور یہ ہے کہ اس کے وجود سے اللہ کی دوسری مخلوق کو آرام پہنچے، فائدہ ہو، سکون ملے۔ جیسے بلب میں بجلی آئے تو وہ روشن ہوتا ہے۔ اس کی روشنی سے پورا کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔

نیکی یہ ہے کہ بندہ جب نیکی اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، بھلائی کا کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے تو اس سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ نیکی سے صرف انسان ہی نہیں بلکہ چرند پرند، درخت، پودے، تمام مخلوقات متاثر ہوتی ہیں۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جو قومیں عذابِ الٰہی سے ہلاک ہوئیں انہوں نے اگر بت پرستی کی تو اپنے وجود پر ظلم کیا۔ اللہ کی ناراضگی مول لی۔ چوری چکاری کی۔ قتل و غارت کیا، عذاب الٰہی آیا تو کچھ بھی نہ بچا۔ پہاڑ گر گئے، درخت گر گئے، زمین اور اس پر سبزہ و چارہ اور جانور سب تباہ ہو گئے۔ یعنی ساری کائنات متاثر ہوئی۔ اسی طرح جب خلوصِ دل سے اللہ کی رضا کے لیے اتباعِ شریعت کیا جاتا ہے تو رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے۔ کسی کی نیکی کا اثر اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا ساری کائنات تک پہنچتا ہے۔

کسی کے نیک یا راہِ راست پر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خلقِ خدا اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ نہ یہ کہ خلقِ خدا کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ دنیا میں ہر شخص کہتا ہے وہ صحیح راہ پر ہے۔ ہر کوئی کہتا ہے، میں جو کر رہا ہوں وہ ٹھیک کر رہا ہوں یہ انسانی مزاج ہے کہ وہ جو غلطی بھی کرے اس کے لیے اس نے کوئی جواز اور دلیل تیار رکھی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ میں نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ اللہ کریم نے معیار یہ دیا ہے کہ جو نیک ہے، جو صحیح کر رہا ہے اس

کے کردار کے باعث اس کے ماحول میں سلامتی آتی ہے، بہتری آتی ہے، لوگوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے سبب سے کائنات کو امن، سلامتی، اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں تو کفار و مشرکین کہتے تھے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، درست ہے اور جو دعوت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام دے رہے ہیں یہ نیا فساد پیدا کر رہے ہیں تو اللہ کریم نے فرمایا کہ جس کردار سے مخلوق کو نفع پہنچ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیغام کی دعوت دی جس طرزِ حیات کو جاری فرمایا اس نے روئے زمین کے ظلم و جور کو ختم کر کے دنیا کو امن وسکون کا گہوارا بنا دیا۔ قیامت تک کے لیے جاری فرما دیا۔ آج دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی امن وسکون، عدل و انصاف، محبت وشفقت، دیانت و امانت پائی جاتی ہے تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی ہے۔ جتنے امور مخلوق کے لیے ایذا کا سبب ہیں وہ سارے وہ امور ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ یہ معیارِ حق ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس بات کو ترجیح نہیں دی کہ کوئی دنیا کو چھوڑ کر غاروں میں چلا جائے تو بڑا اولی اللہ بن جائے گا۔ ایسا نہیں ہے۔ ولایت نام ہے شریعت میں فنا ہونے کا۔ کام خلاف شریعت ہو تو ولایت کیسی؟ دوسری بات یہ ہے کہ دنیا چھوڑ کر ایک گوشے میں بیٹھ جانا بڑا آسان ہے۔ ایسا تو از خود ہو جائے گا۔ جب زندگی ختم ہوگی اور قبر میں اتار دیں گے۔ اس کے لیے جیتے جی اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کریم نے دنیا رہنے کے لیے بنائی ہے۔ اس میں رہنا اور معاملات کرنا مقصود ہے۔

جن اولیائے امت کو جنگلوں میں رہنا پڑا ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ بایزید بسطامیؒ جیسی ہستیاں تھیں جنہیں بادشاہوں نے آبادیوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ انسانوں کی ان سے عقیدت و احترام اور جانثاری دیکھ کر ان کی مقبولیت سے ڈر گئے۔ انہیں حکومت کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے انہیں آبادیوں سے نکال دیا اور لوگوں پر پابندی لگا دی کہ ان ویرانوں میں بھی کوئی ان تک نہ پہنچ سکے۔

جب انگریز نے برصغیر پر قبضہ کیا تو جو مجاہدین اور علمائے حق ان کے خلاف جہاد کرتے تھے انہیں جزائر مالٹا اور کالے پانیوں میں قیدیں کاٹنے بھیج دیا۔ تو کیا کالے پانی جانا ولایت کی شرط بن جائے گا؟ نہیں۔ وہ تو مجبوری تھی۔ حضرت جیؒ کی تحقیق کے مطابق جن اولیاء اللہ کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا تھا جب وہ مخلوق سے کٹ گئے تو ان کی آگے ترقی نہیں ہوئی۔ بہت اعلیٰ منازل تھے لیکن جہاں تھے وہیں رک گئے کیونکہ ترقیٔ منازل کا تعلق معاملات سے ہے۔ معاملات، مخلوق کے ساتھ مل کر ہوتے ہیں۔ لین دین، کھانا پینا۔ کسی کا حق دینا،

انصاف سے معاملات کرنا۔ یہ سب تنہائی میں تو نہیں ہوتا۔ اطاعتِ الٰہی کے مواقع، مخلوق میں مل جل کر ملتے ہیں۔ میدانِ عمل میں دونوں چیزوں کی ضرورت ہے تقویٰ یعنی اللہ سے تعلق درست ہو اور اس تعلق کا اثر کردار پر ہو جس سے مخلوق کو فائدہ پہنچے۔

نظامِ اسلام سے روکنے والوں کا انجام:

اس سورۂ مبارکہ کی آیت 6 تا 19 تک ابوجہل کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں وہ بارگاہ رسالت پناہی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں گستاخی کا مرتکب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں ادائیگی سے صلوٰۃ سے روکنے کا مرتکب ہوا۔ اگرچہ یہ آیات اس واقعہ پر نازل ہوئیں لیکن ان کا مفہوم عام ہے کہ جو بھی نظامِ اسلام کو روکے گا وہ دیکھ لے کہ اس کا انجام کیا ہوگا! فرمایا: اَرَءَیْتَ اِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۱۳﴾ ''دیکھو تو اگر اس نے دینِ حق کو جھٹلایا اور (اس سے) منہ موڑا۔'' یعنی اسلامی طرزِ حیات سے روکنے والا نہ صرف جھٹلاتا ہے بلکہ منہ بھی موڑتا ہے۔

اسلام میں صلوٰۃ ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس لفظ سے مراد ہے اللہ کے روبرو کھڑا ہو کر قیام، رکوع اور سجود ایسے کرنا جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے۔ اس عبادت کا اثر عبادت گزار کے تمام اعمال و افعال تک پہنچے جو اتباعِ رسالت سے ہی ممکن ہے۔ یعنی ایمان کا دائرہ صرف بندے کی ذاتی عبادات تک محدود نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد ایمان، تعلق باللہ اور اتباعِ رسالت ہے۔ اس کا نتیجہ فلاح و بہبودِ انسانیت ہے۔ جس کام کا نتیجہ رک جائے اس کے کرنے کا کیا فائدہ؟ جب انسانی کردار سے دوسرے انسانوں کو فائدہ نہ پہنچ رہا ہو تو وہ کرنا نہ کرنا برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے تنہائی، گوشہ نشینی اور جنگلوں میں رہنے سے ترقی نصیب نہیں ہوتی۔

دیکھیے! اگر یہ انکار کرتے ہیں، روگردانی کرتے ہیں، نہیں مان رہے تو ان کے پاس دلیل ختم ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کرنے پر انسانوں میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اسلام اتباعِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں رہنے کا نام ہے۔ یہ لوگ جو روگردانی کر رہے ہیں تو اللہ نے وقتی طور پر انہیں اختیار دیا ہے کہ انکار یا اقرار میں سے چُن لیں: اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ﴿۱۴﴾ ''کیا اس کو معلوم نہیں کہ اللہ دیکھ رہے ہیں۔'' یعنی انکار کرنے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ کریم کے روبرو کر رہے ہیں۔ اللہ کے سامنے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے روگردانی کر رہے ہیں تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

دنیا میں کوئی بادشاہِ وقت کی نافرمانی کرتا ہے تو کہیں چھپ بھی سکتا ہے۔ کوئی شکایت کر دے تو بادشاہ کے کارندوں کے ہاتھوں پکڑا بھی جا سکتا ہے لیکن جو عین دربار میں کھڑے ہو کر بادشاہ کے روبرو گستاخی کرتا ہے

اس کا کیا ہوگا؟ اللہ جلّ شانہٗ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں ہیں کہ دورِ افتادہ کسی جگہ پر تم بادشاہ کی نافرمانی کرو اور اسے خبر ہی نہ ہو۔ یا اس کے کارندے پکڑنے آئیں تو تم پکڑائی نہ دو، کہیں بھاگ جاؤ۔ ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ کے روبرو کر رہے ہو، عین دربارِ الٰہی میں کر رہے ہو۔ تمہاری یہ سرکشی اس ذاتِ عظیم کے روبرو ہے۔ دیکھ لو! اس کی سزا کتنی سخت ہوگی؟ كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ ''دیکھو! اگر وہ باز نہ آئے گا تو ہم (اس کو) پیشانی کے بالوں سے گھسیٹیں گے۔'' نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ ''اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی کے بال۔'' ابوجہل دنیا میں بھی ذلیل ہوا اور آخرت میں کیسے کیسے ہولناک عذابوں سے گزرے گا، کس ذلت اور رسوائی کا سامنا کرے گا اُس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ دنیا میں ابوجہل قتل ہوا تو واقعی اس کا سر گھسیٹتا ہوا لایا گیا۔ آخرت میں اس جھوٹے نافرمان کو پیشانی کے بالوں سے گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ جس کے عذابوں کی سختی کا اندازہ ممکن نہیں۔

ربّ کریم کیسی کریم ذات ہے۔ فرمایا، ''اگر وہ باز نہ آئے گا'' یعنی یہ گنجائش پھر بھی رکھی کہ باز آ جاؤ تو میں معاف کر دوں گا۔ تم نے کتنے ہی جرائم اور گناہ کیے۔ میرے روبرو کیے، کتنی بڑی گستاخی کی پھر بھی میری بارگاہ میں مغفرت ہے۔ مرنے سے پہلے توبہ کر لو۔ گناہوں پر دلی طور سے نادم ہو جاؤ۔ اقرار کر لو کہ جو کیا غلط کیا۔ وعدہ کر لو پھر نہیں کروں گا۔ آئندہ مت کرو تو میں معاف کر دوں گا۔ کیسی کریم ذات ہے اتنی خرابی کے بعد بھی انسان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا۔ یاد رکھو! زندگی بار بار نہیں ملے گی۔ بار بار یہ موقع نہیں ملے گا۔ شرک، چوری، برائی جو کر چکے ہو اب باز آ جاؤ۔ توبہ کر لو۔ آئندہ کے لیے برائی چھوڑ دو۔ جو تلافی ہو سکتی ہے کر لو۔ کسی کا مال چھینا ہے واپس کر دو۔ کسی کا دل دکھایا ہے، معافی مانگ لو۔ جو ازالہ ہو سکتا ہے، کر لو۔ جو نہیں کر سکتے اللہ سے دعا کرو۔ اللہ! میں نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ نہیں کروں گا۔

فرمایا، اگر باز نہ آئے تو پھر پیشانی کے بالوں سے پکڑے جاؤ گے یعنی ایسی گرفت آئے گی جس سے بھاگ نہ سکو گے۔ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ ''اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی کے بال۔'' جنہوں نے زندگی جھوٹ پر بسر کی۔ اسلام کے خلاف جیے۔ وہ جھوٹے بھی تھے اور بدکار بھی۔ یعنی سچائی ہی اسلام ہے۔ اسلام سے باہر جھوٹ ہے، خطا کاری ہے، بے دینی ہے۔ غیر مسلموں کا الزام ہے کہ اسلام، سچائی پر اجارہ داری رکھتا ہے۔ ساری سچائی اسلام میں ہے۔ باقی غلط کہتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اسلام کی سچ پر اجارہ داری نہیں ہے۔ اسلام ہے ہی سچائی کا نام۔ سچائی ہی اسلام ہے۔ اس لیے کہ اسلام اللہ کا عطا کیا ہوا دین ہے۔ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا ہوا اللہ کا ذاتی کلام ہے۔ اصدق الصادقین صلی اللہ علیہ وسلم کا پہنچایا ہوا

دین ہے۔ جہاں سچائی میں کمی آتی ہے وہاں اسلام اپنا دامن چھڑا لیتا ہے۔ جس کردار، جس عقیدے، جس نظریے میں سچائی میں کمی ہو جائے وہ دین نہیں ہے۔ بے دینی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اسلام کے خلاف جتنی قوتیں ہیں وہ ایک عقیدے پر متفق نہیں ہوتے۔ ہر عقیدے کے بارے ہر فرد کا ایک چھوٹا سا اختلافی نظریہ ہوتا ہے۔ بت پرستی ہے تو کئی بت ہوں گے۔ عیسائیت اور یہودیت میں کئی اختلافی نظریات ہیں اور ان پر وہ تقسیم در تقسیم ہو چکے ہیں۔

اسلام میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسلام میں جو لوگ اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اسلام کی خدمت نہیں کر رہے۔ اسلام قیامت تک کے لیے آیا ہے۔ اصول میں، ساری امت ان پر متفق اور متحد ہے۔ تشریحات کے انداز مختلف ہیں۔ چاروں اماموں نے چار تشریحات کی ہیں تو چاروں درست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک یہ ثابت کرتا ہے کہ اُن کی تشریح افضل ہے۔ دوسروں کی تشریح کو غلط نہیں کہتے۔ فرق افضلیت کا ہے۔ جیسے کچھ مسلمان ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھاتے ہیں کچھ صرف تکبیرِ اولیٰ پر اٹھاتے ہیں۔ اس میں اصول پر سب متفق ہیں۔ یعنی نماز کے لیے تکبیر کہی جائے تو ہاتھ کانوں تک اٹھائے جائیں۔ یہ اصول ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اس کی تشریح میں احناف کہتے ہیں پہلی تکبیر پر ہاتھ اٹھا لینا، حکم کی تعمیل ہے، کافی ہے۔ امام مالکؒ کے پیروکار کہتے ہیں ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھانا افضل ہے۔ دونوں طرح درست ہے۔ غلط کوئی بھی نہیں۔ پھر یہ اختلاف تو نہ ہوا؟ ترجیح کا فرق ہے اس لیے یہ اختلاف نہیں۔ لہٰذا ان باتوں کو اختلاف بنانا۔ کفر کے فتوے لگانا، نفرتیں پیدا کرنا، اسلام کی خدمت نہیں۔

اسلام اللہ کی اطاعت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا کا عہد ہے۔ ایک بندہ جب یہ عہد کرتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ میں اللہ کا فرمانبردار ہوں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وفادار ہوں تو پھر میں اور آپ اس کے جج نہیں بن سکتے یہ حق اللہ جلّ شانہٗ کا ہے۔ میدانِ حشر میں وہ خود بتا دے گا کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا! ہم اس کے بارے کیسے زبان کھول سکتے ہیں۔ ہم نے کب اس کا دل چیر کر دیکھا ہے؟ اللہ ہر ایک کو، اس کے نظریے اور کردار کو خود ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے روبرو کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ پکڑے جائیں گے۔ جھوٹے، خطاکار ایسی گرفت میں آئیں گے کہ بچنے کا کوئی حیلہ، کوئی راستہ اور کوئی سبیل نہ ہو گی۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ ''تو وہ اپنے ہم مجلسوں کو بلا لے۔'' پھر اسے کہیں گے کہ جو لوگ تمہیں گناہ کی طرف بلاتے تھے۔ جو تمہارے گناہ کے ساتھی تھے۔ جنہوں نے برائی کی طرف مائل کیا، انہیں بلا کہ اب تیرے کام آئیں۔ تجھے اللہ کی گرفت سے بچائیں۔ عذابِ الٰہی سے چھڑانے میں تیری مدد کریں۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾ ''ہم بھی (اپنے) مؤکلانِ دوزخ کو بلائیں گے۔'' فرمایا، جب خطا کار پکڑا جائے گا تو ہم ان اہل کاروں کو بلائیں گے جو خطا کاروں کو وصول کرنے پر مقرر ہیں۔ اس وقت ان کا کوئی بس نہ چلے گا۔

دنیا سے رخصت ہوتے وقت دو منظر ہوتے ہیں۔ انسان جب دنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے۔ امتحان اور آزمائش کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو دنیا سے لے جانے کے لیے اللہ کے فرشتے اس کی روح قبض کرنے آ جاتے ہیں۔ جو اللہ کے اطاعت گزار بندے ہوں، ان کے لیے جنت سے فرشتے آتے ہیں۔ جنت کے لباس، خوشبوئیں لاتے ہیں۔ بڑے احترام سے لے کر جاتے ہیں۔ کفر اور نافرمانی ایسی مصیبت ہے کہ اس کے لیے جہنم کے فرشتے آتے ہیں۔ سخت ڈراؤنی شکلیں، لہجہ کرخت اور روّیہ سخت ہوتا ہے۔ زنجیریں اٹھائے، جہنم کا لباس لیے وارد ہوتے ہیں۔ برزخ کُھل جاتا ہے اور آخرت نظر آنے لگتی ہے۔ اس وقت کافر کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایمان بالغیب مطلوب ہے۔ جہنم دیکھ کر یا جنت کے انعامات کو سامنے دیکھ کر کون انکار کر سکتا ہے۔ ایمان وہی مطلوب و مقبول ہے جو دنیا میں اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار کرتے ہوئے، یقین کرتے ہوئے، اعتماد کرتے ہوئے لایا جائے۔ ایمان کی حقیقت، اعتماد علی الرسول ہے۔

یوں تو غرق ہوئے وقت فرعون بھی توبہ کرنے لگ گیا تھا اور کہتا تھا کہ میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں تو ارشاد ہوا: آٰلْـٰٔنَ ''اب (ایمان لاتا ہے)؟ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ حالانکہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (یونس:91,92) سو آج ہم تیرے بدن کو نجات (سمندر سے نکال) دیں گے تاکہ تُو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت ہو۔''

دوسروں کے لیے عبرت کا سامان رہے کہ یہ شخص خود کو خدا کہلواتا تھا۔ اللہ کی شان کہ ابھی تک قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا (المؤمن:46) ''آگ، کہ (برزخ میں) صبح اور شام اس کے سامنے لائے جاتے ہیں۔'' فرعون اور اس کے ماننے والوں پر صبح و شام تازہ آگ بھیجی جاتی ہے۔ دیکھنے میں تو بظاہر اس کا جسم پڑا ہوا ہے لیکن آگ کا عذاب تو برزخ کا معاملہ ہے۔

علمائے حق فرماتے ہیں کہ ایمان کی برکات میں سے یہ بھی ہے کہ مسلمان دنیا میں خطا کار بھی ہو لیکن اس کا ایمان ہو۔ وہ گناہ کو گناہ سمجھتا ہو۔ برزخ واضح ہو جائے اور مومن اس وقت بھی توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول کرلی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ اس وقت بہت کم لوگوں کو توبہ نصیب ہوتی ہے۔ یہ بندے کے کردار پر منحصر ہے کہ اس میں خوفِ خدا کی کچھ رمق باقی ہو۔

اللہ کریم کے اپنے معاملات ہیں۔ وہ ہی بہتر جاننے والے ہیں۔ توبہ بہرحال ضروری ہے۔ توبہ کے ساتھ رجوع الی اللہ بہت ضروری ہے۔ کسی کو بھی اپنی نیکی یا پارسائی کے گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر مومن کو ہمہ وقت توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے کہ استغفار پڑھا جائے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ (میں اللہ سے تمام گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں جو میرا ربّ ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں) یعنی زبانی استغفار کرنا اور عملاً رجوع الی اللہ کرنا۔ کہنا کہ میں ہر جرم سے توبہ کرتا ہوں اور اللہ کی بارگاہ میں معافی کا طلبگار ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے ہم سے کہاں سے خطا ہوگئی۔ اگر ہم سے کوئی نیکی ہو بھی جائے تو ہم اللہ کے احسان کو اپنا کمال سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا نیکی کر کے بھی استغفار پڑھنا چاہیے۔

کافرانہ نظام قبول نہ کیا جائے:

فرمایا: كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ ۔۔۔ خبردار! ''اس کا کہنا نہ ماننا۔'' اگرچہ یہ آیات اسی واقعے کے تحت بیان ہوئی ہیں لیکن ان کا مفہوم عام ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کی پیروی نہ کی جائے جو اللہ کی بات نہیں مان رہا۔ بھلا مسلمان اس کی بات کیسے مان سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مان رہا۔ فرمایا، ہرگز بدکار کی پیروی نہ کی جائے۔ اس کی بات نہ مانی جائے جو اللہ کا نافرمان ہو۔

اسلام کیا ہے؟ کفر کی ضد ہے۔ مولانا شبلی نعمانی ؒ نے سات جلدوں میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی۔ غالباً چھ جلدیں انہوں نے مکمل کر لیں اور ان کا وصال ہو گیا۔ ساتویں جلد کو ان کے شاگرد مولانا علی حسن ندویؒ نے مکمل کیا۔ اس میں انہوں نے ایک بڑی عجیب بحث چھیڑی ہے کہ برصغیر میں بھی دینی جماعتیں کام کرتی رہیں۔ ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان اور ہندوستان میں بھی قانون، طرزِ حکومت، معیشت اور عدالت سب ہی کچھ وہی کافرانہ تھا۔ جو انگریز چھوڑ گیا تھا۔ دینی جماعتیں کیوں کامیاب نہیں ہوئیں؟ نفاذِ اسلام کیوں نہیں ہوا؟ وہ فرماتے ہیں، اُن دینی جماعتوں نے سنّت کے خلاف کام کیا۔ سنّت، قرآن کے تابع ہے۔ قرآن نے اصول دیا لَا تُطِعْهُ یعنی کافرانہ نظام کے تابع مت ہو۔ اس کی مخالفت کرو اور دینی جماعتیں اس نظام کا حصہ بن گئیں۔ انہوں نے بھی اسی نظام کے تحت ووٹ لیے، اسمبلیوں میں گئے۔ وزیر بن گئے۔ تنخواہیں اور مراعات لیں۔ اولادیں ملازم کروائیں اور اسی نظام کی ڈگر کو قبول کر لیا تو کفر کو کون توڑتا؟

سنت طریقہ یہ تھا کہ کفار جیسا نہیں ہونا۔ ان کے نظام کی پیروی نہیں کرنی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور

صحابہ کرامؓ نے دکھ جھیلے، ہر تکلیف اور ایذا برداشت کی۔ بالآخر گھر بار، جائیداد، شہر، وطن چھوڑ دیا۔ دوست رشتہ دار چھوڑ دیے۔ خالی ہاتھ مسافرت اختیار کر کے ہجرت کر لی لیکن اس نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس ایثار اور قربانیوں کے نتیجے میں اسلامی ریاست بنی۔ اسلام عملاً روئے زمین پر پھیلا۔ اسلامی نظام نافذ ہوا۔ اس کی برکات سے مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی مستفید ہوئے دینی جماعتیں اس نظام کی مخالف نہ ہو سکیں۔ اس کا حصّہ بن گئیں۔ جس عمارت میں انہوں نے خود رہنا شروع کر دیا، اس عمارت کو کیسے گرائیں گے۔ یہ صرف جماعتوں اور قوموں کی بات نہیں۔ فرد کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ کافر کی، بدکار کی بات مت مانو۔ اس کے اندازِ زندگی مت اپناؤ۔ اس کے اندازِ معاشرت نہ اپناؤ۔ اس جیسا مت بنو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نصیب ہو جائے تو ہر کام سجدہ بن جاتا ہے:

فرمایا: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ ''اور سجدہ کرنا اور (اللہ کا) قرب حاصل کرتے رہنا'' یاد رہے یہ آیتِ سجدہ ہے۔ ہر پڑھنے والے پر اور سننے والے پر ایک سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ سجدۂ تلاوت کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ باوضو ہو، قبلہ رو ہو پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں چلا جائے۔ ایک سجدہ کرے۔ تین بار سبحان ربی اللہ الاعلیٰ پڑھے اور اللہ اکبر کہہ کر فارغ ہو جائے۔

اسلام یہ ہے کہ مومن کا جینا مرنا سجدہ بن جائے۔ قرآن کی تشریح قرآن میں دوسری جگہ ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوا: تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (الفتح:29)'' (اے مخاطب)! تو ان کو دیکھے گا (کبھی) رکوع کر رہے ہیں (کبھی) سجدہ کر رہے ہیں۔'' اس آیت کے مصداق صحابہ کرامؓ ہیں۔ کیا صحابہ کرامؓ ہمہ وقت رکوع و سجود ہی کرتے رہے؟ صحابہ کرامؓ نے ایک عالم فتح کیا۔ تجارت کی، شادیاں کیں اولادوں کی تربیت کی، عدل کیا۔ زندگی کے سب کام اس طرح انجام دیے کہ ایک عظیم اور مثالی حکومت بنا دی جو عین اسلام کے مطابق تھی تو پتا چلا کہ سجدہ سے مراد ہے ہر کام اطاعتِ الٰہی کے اندر ہو، پورے خلوص سے ہو۔

سب سے زیادہ قربِ الٰہی سجدے کی حالت میں نصیب ہوتا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ہر کام اس خلوص سے کرو جس طرح سجدہ کیا جاتا ہے۔ بندہ سارے اختیارات اللہ کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ پیشانی زمین پر رکھ کر کہتا ہے، یا اللہ! تو ہی بڑا ہے! جب زندگی کے سارے امور میں اپنی رائے ختم ہو جائے۔ خلوصِ دل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نصیب ہو جائے تو ہر کام سجدہ بن جاتا ہے۔ یہی فرمایا گیا کہ سجدہ کر اور قربِ الٰہی حاصل کر! اللہ نے جتنی زندگی دی ہے، خلوصِ دل سے زندگی کے امور انجام دیتا جا۔ صرف نماز ہی سجدہ نہیں ہے۔ صلح و جنگ بھی سجدہ ہے، کاروبار بھی سجدہ ہے، کاشتکاری اور خرید و فروخت بھی سجدہ ہے۔ معروف ذرائع سے رزق حاصل کرنا، شادی کرنا، گھر بنانا، اچھی

سواری رکھنا اور یہ سب کام اللہ کے حکم کے مطابق کرنا، سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مطابق کرنا سجدہ ہے، قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ گویا اسلام بھرپور عملی زندگی کا نام ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں بھرپور عملی زندگی گزارنے کا نام ہے۔

یہ آیہءکریمہ بتا رہی ہے کہ **واقترب** یعنی اللہ کا قرب حاصل کرتا رہ۔ اس کا مطلب ہے کہ قربِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں۔ تصوف، سلوک اور ولایت قربِ الٰہی کے حصول کا راستہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی بزرگ نے ایسا فرمایا ہو کہ میں نے سارا سلوک مکمل کرلیا۔ یہ بات ان سوانح نگاروں کی لکھی ہوئی ہے۔ جنہوں نے اہل اللہ کے حالات لکھے۔ یہ سوانح نگار خود صوفی نہیں تھے۔ تصوف کی ابجد بھی نہیں جانتے تھے۔ جن چیزوں کو صوفیا کمزوری سمجھتے تھے وہ ان لوگوں نے کرامات کے زمرے میں لکھ دیں اور جو اُن کی کرامات تھیں ان پر ان کا خیال بھی نہیں گزرا۔

کسی ولی اللہ کی کرامت کیا ہوتی ہے؟ اس کی برکت سے دین پھیلتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ لوگ جرائم سے توبہ کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی ولی اللہ کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ پانی پر چلنا یا ہوا میں اڑنا کمال نہیں۔ پانی کی مخلوق پانی میں بستی ہے۔ ہوا کی مخلوق اڑتی ہے۔ یہ کیا کمال ہوا؟ گلاب کے پھول کا کمال یہ ہے کہ وہ جہاں ہو وہاں ماحول معطر ہو۔ اس کے گرد فضا بھلی لگے۔ دیکھ کر لطف آئے۔ ولی اللہ کا کمال یہ ہے کہ اس کے وجود کے سبب نیکی پھیلتی ہے۔ لوگ رجوع الی اللہ کرتے ہیں۔ زمانے میں انقلاب آجاتا ہے۔ زمانہ بے دینی، برائی چھوڑ کر نیکی پر گامزن ہو جاتا ہے۔ یہ اصل کرامت ہے جس کے بارے سوانح نگاروں نے نہیں لکھا۔ اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو کرامت بنا دیا۔ وہ عام آدمی سے ہو تو کرامت نہیں اور پیر صاحب سے منسوب کر کے کرامت بنا دیا، یاد رہے! سلوک تمام نہیں ہوتا۔ قربِ الٰہی کی منزلیں ختم نہیں ہوتیں۔ کوئی ایسا مقام نہیں آتا جہاں اللہ کریم محدود ہوں اور بندہ وہاں پہنچ کر کہے کہ سلوک ختم ہوگیا۔ سالک کی ترقی زندگی میں ہوتی رہتی ہے، برزخ میں بھی ہوتی ہے، آخرت میں بھی اور جنت میں بھی۔ جنتیوں کی ترقی ابدالآباد ہوتی رہے گی۔ کہیں کوئی انتہا نہیں آئے گی۔

فرمایا، پورے خلوص سے ہر کام میں حصّہ لو لیکن اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق کرو۔ اسے اپنا کمال نہ سمجھو۔ اللہ کی عطا سمجھو تو یہ سجدہ ہے۔ جو کام بھی اللہ کے حکم، سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مطابق اللہ کی رضا کے لیے کرو گے وہ ترقیء درجات کا سبب بنتا رہے گا، منازل بڑھتے رہیں گے۔ قربِ الٰہی عطا ہوتا رہے گا۔ ہزاروں زندگیاں بھی ملیں تو قربِ الٰہی کی انتہا نہیں ہے وہ بڑھتا ہی رہے گا لیکن یہ اس انسانی کردار پر منحصر ہے جو سجدے کا درجہ رکھتا ہو۔ اس میں لوگوں کی واہ واہ کا دخل نہ ہو، مالی منفعت کا دخل نہ ہو، اتباعِ رسالت میں ہو اور پورے خلوص کے ساتھ ہو۔

سورۃ القدر رکوع 1 آیات 1 تا5

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ‌ۚ ۝١ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ؕ ۝٢ لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ ۙ
خَيۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَهۡرٍ ؕ ۝٣ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ وَالرُّوۡحُ فِيۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ‌ ۚ مِنۡ
كُلِّ اَمۡرٍ ۛ ۝٤ سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ۝٥

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا ﴿۱﴾ اور تمہیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے؟ ﴿۲﴾ شبِ قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے ﴿۳﴾ اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں ہر کام (کے انتظام) کے لیے ﴿۴﴾ یہ (رات) طلوعِ صبح تک (امان اور) سلامتی ہے ﴿۵﴾

تفسیر و معارف

سورۃ القدر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں قرآنِ حکیم کی عظمت کا اظہار ہے۔ حدیث شریف کے مطابق، رمضان المبارک ایسا بابرکت مہینہ ہے جو مہینوں کا سردار ہے اس میں انسانوں میں ملکوتی اوصاف یعنی فرشتوں جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ کم کھانا، کم سونا، زیادہ عبادت کرنا، جھوٹ نہ بولنا، سچ کی کوشش کرنا، نہ صرف برائی سے بچنا بلکہ برائی سننے سے بھی بچنا۔ برائی دیکھنے سے بھی بچنا۔ یہ ساری صفات فرشتوں کی ہیں۔ حدیث شریف کے ارشاد کے مطابق چونکہ رمضان میں، انسانوں میں اوصافِ ملکوتی پیدا ہو جاتے ہیں اس لیے جتنی بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں وہ سب اسی ماہِ مبارک میں نازل ہوئیں۔

قرآنِ حکیم اس ذات کا ذاتی کلام ہے جو کائنات کا خالق ہے، مالک ہے، وحدہٗ لاشریک ہے۔ جس کی عظمت کو کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے ذاتِ باری کے بارے سوچنا منع ہے۔ انسان خود مخلوق ہے۔ اس کی عقل مخلوق ہے۔ اللہ کی ذات خالق ہے۔ مخلوق کے احاطہءِ علم میں جو شے آئے گی وہ مخلوق ہوگی۔ مخلوق کو تو سوچا جا

سکتا ہے، خالق کو کوئی سوچ نہیں سکتا۔ ہاں! صفاتِ الٰہی پر تفکر ہوسکتا ہے اور ہر کوئی اپنی اپنی فہم کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ ہماری تخلیق سے لے کر زندگی، صحت، غذا، دوا تک اور بیماری سے موت تک ہر چیز میں اس کی صفات کا اظہار ہے تو ان پر غور کر کے ہم اس کی عظمت کا ادراک اپنی حیثیت کے مطابق کر کے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

اللہ کا کلام، قرآن حکیم نہ صرف تمام پہلی الہامی کتابوں کا جامع ہے بلکہ قیامت تک کے مسائل کو جامع ہے۔ پہلے جتنے کلامِ الٰہی نازل ہوئے وہ چونکہ مخصوص قوموں کی طرف تھے، خاص زمانوں کے لیے تھے لہٰذا ان میں جتنی ہدایات نازل فرمائی گئیں وہ اقوام کے حالات کے مطابق تھیں۔ ہر قوم کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ رنگ، زبان، قد کاٹھ، رہن سہن، سوچ کا انداز تک مختلف ہوتا ہے۔ تو دین کے احکام بھی ان کی استطاعت اور مزاج کے مطابق تھے اور اس عہد کے لیے ہی تھے۔ اس نبیؑ کی نبوت کے عرصہ تک کے لیے تھے۔ جب نئی نبوت آجاتی تو نئی کتاب اور نئے احکام آجاتے۔ ایک وقت میں ایک قوم میں ایک ہی نبیؑ رہے۔ دوسری قوم میں دوسرے نبیؑ رہے۔ یوں ایک ہی وقت میں مختلف قوموں اور علاقوں میں متعدد انبیا علیہم السلام مبعوث ہوئے۔

جب قرآنِ حکیم نازل ہوا تو یہ ساری انسانیت کے لیے آیا، سارے زمانوں کے لیے آیا، قیامت تک کے لیے آگیا۔ یعنی نزولِ قرآن سے لے کر قیامِ قیامت تک انسانی معاشرے کو معیشت، معاشرت، سیاست وعدالت، تعلیم و تعلم، تعلقاتِ باہمی غرض ہر شعبہء حیات کے بارے جو سوال بھی پیدا ہوگا اس کا جواب قرآنِ کریم ہی عطا فرمائے گا۔ عام آدمی کی، فرد واحد کی انفرادی زندگی ہو، قبیلے، خاندان کی ہو، قوم یا اقوام عالم کی ہو، ممالک کی ہو یا بین الاقوامی زندگی ہو، ہر سوال کا شافی جواب صرف قرآنِ حکیم میں ملے گا۔

نزولِ قرآن کے لیے اہتمام:

اس عظیم الشان کلام کے نزول کے لیے اللہ کریم نے خصوصی اہتمام فرمایا۔ مہینوں میں مہینوں کا سردار رمضان المبارک منتخب فرمایا۔ راتوں میں راتوں کی سردار لیلۃ القدر منتخب فرمائی۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۞ ''بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔''

جس رات میں قرآن حکیم نازل ہوا اس رات کے فضائل یہاں بیان ہونے والے ہیں۔ جس ہستی پر نازل فرمایا گیا وہ ہستی ساری مخلوق میں بے مثل و بے مثال، انبیاورسل علیہم السلام میں سردار اور اُنؑ کے امام۔ انسان ہوتے ہوئے انسانوں میں آپ جیسا دوسرا نہیں۔ انسانیت کے سر کا تاج، خاتم الانبیا، امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم!

اس کلامِ الٰہی کو لانے والا فرشتہ، فرشتوں کا سردار، بہت عظیم، بڑی عظمت والا فرشتہ جس کے بارے ارشادِ باری ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ o ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ o مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (التکویر: 19,20,21) بے شک یہ قرآن فرشتہء عالی مقام کی زبانی پیغام ہے۔ جو بہت قوت والا عرش کے مالک کے ہاں مرتبے والا ہے۔''اس کی بات مانی جاتی ہے (اور) امانت دار بھی ہے''۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ کریم اس کی امانت پر گواہ ہے کہ جو فرشتہ قرآنِ حکیم لایا وہ فرشتوں کا سردار اور عنداللہ امانت دار ہے۔ کیسا اہتمام فرمایا کہ بے مثل رات میں اتارا، جس ہستی پر نازل فرمایا وہ بے مثل و بے مثال، جس مہینے میں نازل فرمایا وہ مہینوں کا سردار، جس شہر میں نازل ہوا وہ روئے زمین کی آبادیوں کا سردار! اب اندازہ کیجیے کہ کس قدر عظیم کلام ہے تو اس کا پڑھنا کتنا عظیم کام ہوگا! جنہیں اس کی حفظ کی سعادت نصیب ہوئی ان پر اللہ کا کتنا احسان ہے۔ جن سینوں میں، جن ذہنوں میں، جن دلوں میں یہ محفوظ ہے وہ کتنے خوش نصیب ہیں۔ اس کی قراءت کا حسن، اس کے حروف الفاظ کی ادائیگی، لہجے کا زیر و بم، ان باریکیوں کو جاننا کتنا عظیم کام ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا تو مقصدِ حیات ہے۔

فرمایا: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ اور تمہیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے؟

فرمایا، اے مخاطب تجھے کیا خبر قدر کی رات ہے کیا! اس کی عظمت انسانی اندازوں سے بڑھ کر ہے۔ انسان کسی بھی چیز کی خوبی، اچھائی اور کمال کے جس قدر بھی اندازے لگا لے، اس رات کی فضیلت اندازوں سے بالاتر ہے۔ اس کی فضیلت سمجھنے کے یہی کافی ہے۔ فرمایا: لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۥ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ شبِ قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ یعنی کوئی ہزار مہینے کوئی اور کام نہ کرے صرف عبادت ہی کرتا رہے، سجدے ہی کرتا رہے، ذکر ہی کرتا رہے تو بھی اس کی عظمت بڑھ کر ہے۔ ہزار مہینوں کے تقریباً تراسی برس سے کچھ اوپر بنتے ہیں۔ اگر کوئی تراسی برس کی عمر پائے اور اس کی ساری عمر عبادت اور سجدے میں بسر ہو جائے تو اس کا سارا ثواب جمع ہو کر بھی ایک لیلۃ القدر کے اجر کو نہیں پا سکتا۔ یہ اس سے بہتر ہے۔ کتنی بہتر ہے؟ اللہ بہتر جانتے ہیں۔ اس طور اندازہ کیجیے کہ جس رات میں قرآنِ کریم نازل ہوا، اسے اتنی فضیلت ہوگئی۔ جس ہستی پر نازل ہوا اس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتیں بے پایاں۔ جس شہر میں نازل ہوا وہ روئے زمین کی افضل ترین آبادی، جس مہینے میں نازل ہوا وہ افضل ترین مہینہ، جو فرشتہ لایا وہ فرشتوں کا سردار تو خود اس کلام کی عظمت کا کیا عالم ہوگا! پھر جس نے اسے مانا، ایمان لایا، اسے سنا، اسے سمجھا، اس پر عمل کیا اس کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ!

اگر دل کی نگاہ سے، روح کی نظر سے دیکھیں تو لوٹنے کی دولت تو یہ ہے۔ اسے پڑھے، سمجھے، اس کے معانی میں غوطہ زن ہو، اس کی ہدایات کو حرزِ جاں بنائے، اس کے مطابق عمل کرے تو زندگی بھی سنور جائے،

موت زندگی سے بھی زیادہ خوش کن ہو۔ فرشتے استقبال کو آئیں، جنت کی خوشبوئیں لائیں، لباس اور سواریاں لائیں اور عزت واحترام سے لے کر جائیں۔

جو انسان محض مادّی اور حسّی زندگی جیتا رہے تو مادّی حسّیں تو جانوروں میں بھی ہیں۔ جانور بھی سبز اور خشک چارے میں فرق کر لیتے ہیں۔ حیوان بھی اپنی غذا کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ بچے پال لیتے ہیں۔ گرمی سردی سے بچاؤ کا انتظام کر لیتے ہیں۔ اگر انسان بھی محض اسی میں لگا رہا کہ دولت جمع ہو جائے، مکان بن جائے، گاڑی مل جائے۔ آسائش بھری زندگی گزار لے تو بالآخر کیا ہوگا؟ حیوانی سطح پر زندگی گزار کر مر جائے گا۔ ایسے لوگوں کے بارے ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (الاعراف:179) ''یہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔'' جانوروں کو تو تخلیقی طور پر جانور پیدا کیا گیا تھا۔ یہ تو انسان پیدا ہوئے تھے۔ یہ انسانی عظمت ضائع کر کے جانوروں کی سی زندگی گزار گئے۔ یہ جانوروں سے بدتر ہیں۔

انسان کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ وہ لیلۃ القدر کی اہمیت کا ادراک کرے۔ زندگی کی مہلت کو بہترین شے کے حصول کے لیے استعمال کرے۔ اس مہلت کا فائدہ اٹھائے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے مستفیض ہو۔ اس عظیم رات میں رحمتِ باری لٹائی جاتی ہے۔ فرمایا: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ ''اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں ہر کام (کے انتظام) کے لیے۔'' مفسرین کے مطابق، انتظامِ عالم کے ایک سال کے تمام امور فرشتوں کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ ہر شخص کی صحت، بیماری، اولاد، رزق، زندگی، موت تمام امور کی ذمہ داری دے دی جاتی ہے۔ ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ والروح سے بعض حضرات نے روح الامین مراد لیا ہے اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو لوگ دنیا سے جا چکے ہوں اور نجات میں ہوں۔ ان نجات پانے والی روحوں کو بھی اس رات رخصت ملتی ہے کہ وہ زمین پر آئیں۔ مفسرین نے اس کی تفصیل میں لکھا ہے کہ وہ روحیں زمین پر آ کر اپنے گھروں، اپنے خاندان، اپنی اولادوں کو دیکھتی ہیں۔ اگر وہ نیکی پر کاربند ہوں تو خوش ہوتی ہیں، دعا کرتی ہیں۔ اگر وہ نیکی چھوڑ چکے ہوں تو دکھی اور بیزار ہو کر چلی جاتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ہمارے بعد ہمارے گھر روشن ہیں یا ویران ہو چکے ہیں۔ گھروں کی روشنی اطاعتِ الٰہی سے ہوتی ہے۔ وہ روشنی انوارات الٰہی کی ہوتی ہے۔ اطاعتِ الٰہی اور اتباع رسالت کی ہوتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو پھر بجلی کے قمقموں اور مادّی روشنیوں کے باوجود تاریکی ہی ہوتی ہے۔ اگر ارواح کو بھی اللہ کریم اجازت دیتے ہیں تو وہ بھی انسان کا امتحان ہی ہے۔ روحیں زمین پر آ کر کسی کا کچھ سنوار نہیں جاتیں، وہ سنورا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ زندگی میں ہی بزرگوں سے بیزار ہو جاتے ہیں، مرے ہوؤں کا انتظار کون کرتا ہے! زندگی میں حال پوچھنا، کھانا، دوا دینا مشکل ہوتا ہے، مرجائیں تو دکھاوے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر کے رسومات کی جاتی ہیں، ختم پڑھوائے جاتے ہیں، دعوتیں کھلائی جاتی ہیں، یہ سب کچھ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے ہوتا ہے۔ مرنے والے سے دلچسپی ہوتی تو اس کی بیماری میں خدمت کی جاتی۔ عزت دی جاتی، احترام سے پیش آتے۔ دنیا میں ہر طرح کے روّیے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض بزرگوں سے نرمی محبت، احترام سے پیش آتے ہیں۔ اللہ ان کی اچھائی قبول فرمائیں۔ بُروں کو ہدایت دے۔

یہ بات یقینی ہے کہ روح الامین بھی تشریف لاتے ہیں۔ اللہ کا وہ فرشتہ جو قرآن لایا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لاتا تھا اب وہ وحی لے کر نہیں آتا۔ وہ انتظام وانصرامِ عالم کو دیکھنے آتا ہے۔ جب یہ اہتمام ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت بندے کو کس حال میں ہونا چاہیے؟ غافل ہو، نافرمانی کر رہا ہو، گناہ کر رہا ہو تو اچھا لگے گا؟ یا یہ اچھا لگے کہ حلال کھا رہا ہو، عبادت کر رہا ہو! اس لیے اللہ کے بندے کوشش کرتے ہیں کہ اس رات کو عبادت میں گزاریں۔ اللہ کے فرشتے آئیں تو اللہ اللہ کرتے ہوئے پائیں۔

لیلۃ القدر ہر رمضان میں آخری عشرے کی طاق راتوں میں آتی ہے یعنی اکیسویں رات کو بھی آسکتی ہے، تیئسویں، پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں میں بھی آسکتی ہے۔ علما کا ارشاد ہے کہ جو شخص عشاء با جماعت ادا کرتا ہے اور فجر با جماعت ادا کر لیتا ہے تو اسے شب بیدار سمجھا جاتا ہے۔ جو راتوں کو ذکر کرتے ہیں، نوافل پڑھتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، وہ تو ہیں ہی شب زندہ دار لیکن جو عشاء با جماعت پڑھ کر سو گیا، اٹھ کر فجر با جماعت پڑھ لی اسے بھی شب زندہ دار تصور کیا جاتا ہے۔ گویا اس نے بھی لیلۃ القدر پالی۔ اس کی برکات اسے نصیب ہوگئیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس میں عجائب وغرائب نظر آئیں تو ہی یہ لیلۃ القدر ہوئی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایک ہی رات لیلۃ القدر ہو۔ ہر علاقے میں بدل بدل کر آتی ہے۔ ایک علاقے میں اکیس رمضان کو ہو، دوسرے علاقوں میں تیئس کو ہوسکتی ہے، کہیں پچیس کو اور کہیں دوسری طاق راتوں میں۔ اسی طرح ممالک میں بھی فرق ہوتا ہے۔

یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر طاق رات لیلۃ القدر ہوتی ہے کسی نہ کسی جگہ! یہ میری سمجھ کی بات ہے، میں نے کہیں پڑھا نہیں۔ ہوسکتا ہے میں صحیح نہ سمجھا ہوں لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ رمضان کے آخری عشرے کی ہر طاق رات لیلۃ القدر ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا ظہور کہاں ہوتا ہے! یعنی یہ ضروری نہیں کہ اگر ہمارے علاقے میں اکیس رمضان کو لیلۃ القدر ہے تو کسی دوسرے علاقے وغیرہ میں بھی اکیس کو ہی ہو۔ اس رات رحمتِ الٰہی کو لٹایا جا رہا ہوتا

ہے۔ اللہ کریم، بے حد کریم ہیں۔ وہ ہر رات میں کرم فرماتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں لیلۃ القدر ہوتی ہے۔ اللہ کے بندوں کو یہ ساری طاق راتیں نصیب ہوجائیں، ان میں شب بیداری نصیب ہوجائے تو کتنی اعلیٰ بات ہے!

اس رات میں روح الامین اللہ کے حکم سے اترتے ہیں اور ہر ذمہ دار فرشتے کو اس کے موقع پر اس کی ذمہ داری سمجھا دی جاتی ہے۔ سال بھر کے امور ان کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ ''یہ (رات) طلوع صبح تک (امان اور) سلامتی ہے۔'' رات کا وقت غروبِ آفتاب سے شروع ہو کر طلوعِ فجر پر ختم ہوجاتا ہے۔ دن طلوع ہوجاتا ہے۔ ساری رات ان برکات کا یہی عالم رہتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جس کلام کے نزول کے لیے اتنا اہتمام فرمایا جارہا ہے اسے ہم نے کتنا پڑھا، کتنا سمجھا اور اسے کتنا اپنا چکے ہیں۔ یا ہم اس سے کتنے دور جا رہے ہیں۔

حق تو یہ تھا کہ بنیادی علم قرآن ہوتا۔ ہر بچہ بچی، ہر پڑھنے والا پہلے قرآن پڑھتا پھر باقی علوم سیکھتا، مختلف زبانیں سیکھتا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھتا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے تمام نظام کافروں کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں قرآن کی گنجائش نہیں۔ جب نئی روشنی کے اندھیرے نہیں پھیلے تھے تو کم از کم دیہاتوں میں یہ اہتمام ہوتا تھا کہ سکول جانے سے پہلے یا سکول سے واپس آنے کے بعد بچے مساجد میں چلے جاتے۔ مولوی صاحب سے ناظرہ قرآن پڑھ لیتے تھے۔ اب مساجد میں وہ مولوی رہے نہ وہ بچے رہے۔ اب موبائل پر گیم کھیلتے ہیں۔

میری بڑوں سے اور بچوں سے بھی گزارش ہے کہ قرآن کو پڑھو، سمجھو۔ کامیابی اسی میں ہے۔ یہ کوئی رواجی کتاب نہیں کہ اسے پڑھ لیا جائے اور بس! یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اس کا دیکھنا عبادت، چھونا عبادت، پڑھنا عبادت، یاد کرنا عبادت ہے لیکن اس کا اصل مقصد اسے سمجھنا اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھالنا ہے۔ اللہ کریم ہمیں توفیق دیں اور ہماری معمولی کاوشوں کو قبول فرمائیں۔

سورۃ البینۃ رکوع 1 آیات 1 تا 8

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی
تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ
قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾ وَ مَا تَفَرَّقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ
الۡبَیِّنَۃُ ؕ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ۙ حُنَفَآءَ
وَ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا
مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ
شَرُّ الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ خَیۡرُ
الۡبَرِیَّۃِ ؕ﴿۷﴾ جَزَآؤُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ ٪﴿۸﴾

جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ (کفر سے) باز رہنے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس کُھلی دلیل (نہ) آتی ﴿۱﴾ اللہ کے رسول جو پاک اوراق پڑھتے ہیں ﴿۲﴾ جن میں مستحکم آیات (لکھی ہوئی) ہیں ﴿۳﴾ اور اہل کتاب جو متفرق ہوئے ہیں تو اپنے پاس دلیل واضح آنے کے بعد (ہوئے ہیں) ﴿۴﴾ اور ان کو حکم تو یہی ملا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے ﴿۵﴾ بے شک جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک، وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے (اور) ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ لوگ ساری مخلوق سے بدتر ہیں ﴿۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل

کرتے رہے وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں ﴿۷﴾ ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے تالع نہریں جاری ہیں، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اللہ اُن سے خوش اور وہ اس سے خوش۔ یہ (صلہ) ہے اُس کے لیے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے ﴿۸﴾

تفسیر و معارف

سورۂ بینہ ان آخری سورتوں میں سے ہے جو مدنی حیاتِ طیبہ میں نازل ہوئیں۔ قرآن حکیم کی آخری سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان میں سے اکثر مکی سورتیں ہیں۔ یہ سورت البتہ مدنی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

ارشاد ہوا ہے: لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَالۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہلِ کتاب اور مشرک وہ (کفر سے) باز رہنے والے نہ تھے جب تک ان کے پاس کھلی دلیل (نہ) آتی۔

اہلِ کتاب سے تو سمجھ آتی ہے کہ وہ لوگ کتابِ الٰہی رکھتے تھے، انبیاؑ کے پیروکار تھے۔ ان انبیاؑ کے پیروکار تھے جن پر کتابیں نازل ہوئیں۔ وہ اللہ کی کتابوں کو ماننے والے تھے پھر اس آیۂ مبارکہ میں انہیں مشرک اور کافر کہا گیا ہے! ایسا اس لیے فرمایا گیا کہ اہلِ کتاب نے کتابوں کے مفاہیم بدل ڈالے۔ نہ صرف مفاہیم بدل دیے بلکہ الفاظ اور احکام بھی بدل دیے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی یہود، اہلِ کتاب تھے لیکن انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مقرر کر لیا اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم عیسائی اہلِ کتاب تھے۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا لیا اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ کفار و مشرک جو اہلِ کتاب میں سے تھے وہ آرام سے ماننے والے نہیں تھے یہاں تک کہ کوئی واضح دلیل، واضح روشنی آتی جو ان اندھیروں کا جگر چاک کر دیتی۔ یہ لوگ کفر پر اتنے پختہ ہو چکے تھے۔ ہدایت سے اتنا دور جا چکے تھے کہ یہ ہرگز ماننے والے نہ تھے، باز رہنے والے نہ تھے جب تک روشنیاں بکھیرنے والا سورج طلوع نہ ہوتا جو اندھیروں کو ختم کر دیتا۔ تاریکی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اب شمعیں روشن کرنے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اب دیے جلانے سے روشنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب تو عالمین کو روشن و منور کرنے والا سورج چاہیے تھا۔ سو ایسا اولوالعزم رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا گیا جسے قرآن نے سراجاً منیرا کہا۔ روشنیاں بانٹنے والا سورج جس نے صدیوں کی تاریکیوں کے سینے چیر کر رکھ دیے اور ہر طرف نور ہی نور پھیلا دیا۔

عہدِ فترت:

بعثتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پوری روئے زمین کفر میں مبتلا تھی۔ کوئی ایک شہر، ایک گاؤں، ایک ملک، ایک قریہ تک ایسا نہیں تھا بلکہ روئے زمین پر ہی کوئی نبی نہیں تھا۔ پانچ سو سال سے کوئی نبیؑ مبعوث نہیں ہوا تھا۔ تاریکیوں پر تاریکیاں گناہوں پر گناہ، ظلم پر ظلم، ظلمت پر ظلمت، اندھیروں پر اندھیرے، تہہ در تہہ چڑھتے رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک پوری پانچ صدیاں انبیاؑ کے وجود سے خالی رہیں۔ لوگ کفر و شرک میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے اور انتہائی تاریکی چھا گئی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک نظامِ کائنات میں، اللہ ربّ العزت نے سلسلۂ نبوت کو جاری رکھا۔ جہاں جہاں انسانی آبادیاں بنیں۔ اقوام اور قبیلے وجود میں آئے وہیں ہر قوم میں اللہ نے نبیؑ بھیجے۔ انسانیت کو ہدایت کی راہنمائی کے لیے بعض اوقات ایک ہی وقت میں کئی کئی نبیؑ بھیجے۔ مختلف اقوام، مختلف علاقوں میں بھیجے۔ تمام انبیاؑ نے توحیدِ باری انبیاؑ کی رسالت، آخرت یعنی تمام عقائد وہی بتائے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک توحیدِ باری کا ایک ہی نظریہ تھا، اقرار نبوت تھا۔ آخرت، قیامت، حساب کتاب وغیرہ البتہ احکام ماحول، وقت، لوگوں کے شعور اور ان کی عملی استعداد کے مطابق ہوتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام تک یہ نظام یوں ہی جاری رہا۔ پھر ایک ایسا عجیب دور آیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عالی تک یہ عہد تقریباً پانچ صدیوں پر محیط ہے جسے عہدِ فترت کہتے ہیں۔

یہاں اکثر ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ جب عہدِ فترت تھا۔ دنیا میں کوئی نبیؑ موجود نہیں تھا۔ لوگ دین سے منحرف ہو گئے تھے۔ کافر، کفر میں مبتلا تھے، اہلِ کتاب شرک میں مبتلا ہو گئے۔ انبیاؑ کو اللہ کا بیٹا بنا کر پوجنے لگے۔ شریعتیں منسوخ کر دیں، اللہ کی کتابوں میں تحریف کر دی تو نجات کی صورت کیا تھی؟

سادہ سا جواب ہے۔ اللہ کریم انسانوں کو نجات سے کبھی محروم نہیں فرماتے۔ عہدِ فترت میں جو شخص مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر، نظامِ کائنات پر غور و فکر کر کے، موسموں کے تغیّر و تبدّل، شب و روز کے آنے جانے، کھیتی اور پھلوں کے اُگنے کے نظام کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیتا تھا کہ اس نظام کو چلانے والا کوئی ہے۔ کوئی خالق ہے تو ہمہ وقت تخلیق ہو رہی ہے۔ کوئی نظام قائم رکھنے والا ہے تو اتنا وسیع نظام قائم رکھ رہا ہے اور وہ واحد و لاشریک ہے۔ کوئی اس کے نظام میں دخیل نہیں۔ اس عہد میں جو یہ عقیدہ رکھتا تھا وہ صاحبِ نجات تھا۔ جنتی تھا اور مسلمان ہی کہلاتا تھا۔

جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین۔ حضرت عبداللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ توحیدِ باری کے قائل تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب ایسے مؤحد تھے کہ جب ابرہہ نے بیت اللہ شریف کو ڈھانے کا ارادہ کیا اور حضرت عبدالمطلب کی اس سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اس سے مطالبہ کیا کہ اس کے سپاہی اُن کے جو اونٹ لے گئے تھے انہیں واپس کیا جائے۔ ابرہہ نے حیرانی سے کہا میں تو آپ کو مکہ کا سردار سمجھ کر یہ امید کر رہا تھا کہ میں کعبہ کو ڈھانے آیا ہوں تو آپ اس پر کوئی بات کریں گے۔ اس پر حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ یہ اونٹ اللہ نے مجھے دیے ہیں۔ میں ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ کعبہ کا ایک مالک ہے جو واحد و لاشریک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ تم سے نپٹ لے گا۔ تم جانو اور کعبہ کا مالک جانے۔ میں اپنی قوم اور اپنے مال و منال کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ لہٰذا اپنے لوگوں کے ساتھ پہاڑوں پر چلے گئے۔ کیا یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ آپ توحیدِ باری اور اللہ کی قدرت کے قائل تھے!

بعض عامیانہ سوچ رکھنے والے لوگوں نے 'نور نامے' قسم کی کتابیں لکھی ہیں ان میں انہوں نے لکھ دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین (معاذ اللہ) مسلمان نہ تھے۔ یہ بالکل غلط ہے اور ایسا کہنا قطعاً حرام ہے۔

اس عہد میں، عہدِ فترت میں وہ لوگ صاحبِ نجات تھے جنہیں دلائلِ فطرت اور نظامِ حیات دیکھ کر یہ یقین تھا کہ ایک ہستی ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔ وہی اللہ ہے، واحد و لاشریک ہے۔ کوئی اس کے برابر کا نہیں۔ کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ لوگوں کی نجات کے لیے یہی عقیدہ کافی تھا۔

ایک شخص زید بن عمرو بن نفیل، مکہ مکرمہ میں ہوئے ہیں۔ انہوں نے مذہبِ حقہ کی تلاش میں جہاں تک ہو سکا سفر کیے۔ علمائے یہود و نصاریٰ کے پاس پہنچے۔ جہاں بھی جاتے یہی کہتے کہ حق کی تلاش ہے۔ اہلِ کتاب کے راہب بھی بتاتے کہ حق عنقا ہو چکا ہے۔ حق ہمارے کے پاس بھی نہیں ہے۔ باتیں گھڑ رکھی ہیں جو ہمیں بھی وراثتاً ملی ہیں۔ ہم انہی پر کاربند ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

أَرَبًّا وَاحِدًا أَمْ أَلْفَ رَبٍّ
أَدِينُ إِذَا تَقَسَّمَتِ الأُمُورُ

عَزَلْتُ اللَّاتَ وَالعُزّٰى جَمِيعًا
كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الجَلْدُ الصَّبُورُ

اس نظام کو چلانے والا کوئی ایک ہے، ہزاروں نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی کوئی مذہب ہے جس میں کام بانٹ دیے جائیں کہ اولاد دینے والا کوئی اور ہے، بارشیں برسانے والا کوئی اور، دھوپ نکالنے والا کوئی اور تو بیماری ٹھیک کرنے والا کوئی دوسرا! جب امور بانٹ دیے جائیں اور اس کے متعدد ذمہ دار بن جائیں تو اسے دین نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ کہ میں

لات وعزیٰ سب سے بیزار ہوں۔ سب کو ترک کرتا ہوں۔ اور جس شخص کو بھی اللہ نے بصیرتِ قلبی دی وہ ایسا ہی کرے گا۔ پھر وہ بیت اللہ کے سامنے بیٹھ جاتا اور کہتا مجھے پتا ہے تُو ہے لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ تُو کس بات پر خفا ہوتا ہے، تیری رضا کس بات میں ہے؟ تیری عبادت کا طریقہ نہیں جانتا۔ ہاتھ پر مٹی رکھ کر اس پر پیشانی رکھ دیتا اور کہتا اسی کو میری عبادت قبول کر لے۔

ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو عہدِ فترت میں توحید کے قائل تھے اور وہ صاحب نجات تھے۔ اللہ نے کسی زمانے کو نجات سے خالی نہیں رکھا۔

عہدِ حاضرہ:

عہدِ حاضرہ کا اندازہ کیجیے۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہیں۔ آج ہم بتوں کو پوجنے کا تصور نہیں کرتے۔ ہر مسلمان بیت اللہ جانے کو بے قرار رہتا ہے۔ حج کرتے ہیں۔ سارا سال عمرے کرتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ افطار کرواتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں۔ سارا سال صدقات بانٹتے ہیں لیکن جب کہا جائے کہ اللہ کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرو تو ہم نہیں کرتے۔ ہماری معیشت سودی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں جو سود کھاتا ہے یا سود سے باز نہیں آتا اس کا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانِ جنگ ہے۔ ہم نے معاملات میں، سیاسیات میں، عدالت میں ہر جگہ کفار و مشرکین کے نظام کے مطابق نظام چلا رکھا ہے۔ اللہ کریم عدل کا، انصاف کا حکم دیتے ہیں۔ انصاف کیا ہے؟ اللہ کریم نے جو حقوق و فرائض مقرر کیے ہیں اس توازن کو قائم رکھنا، انصاف ہے، عدل ہے۔ ہم اس کے مطابق نہیں کرتے اگر کہا جائے کہ شریعت کے مطابق کرو تو مذاق اڑایا جاتا ہے۔ آج سب دانشور، سیاستدان، ایک ہی نعرہ لگاتے ہیں۔ ''قانون کی حکمرانی، Rule of Law''۔ انصاف کی حکمرانی نہیں۔ قانون کی حکمرانی۔ وہ قانون جو شریعت کا نہیں کافر کا بنایا ہوا ہے۔ اس قانون کا حال تو یہ ہے کہ اگر جج خود بھی دیکھ رہا ہو کہ اس شخص نے قتل کیا ہے وہ بھی سزا نہیں دے سکتا اگر گواہ گواہی نہ دے۔ جج بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ قانون کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے۔ کوئی عدالت انصاف نہیں دے سکتی۔ اگر مسلمان آج کلمہ، نماز روزہ کرنے کے بعد اتنے بگڑ گئے ہیں تو جو پانچ صدیاں کفر میں تھے وہ کتنے بگڑے ہوں گے!

اس بگاڑ کا علاج کیا تھا؟ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ ''جب تک ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی۔'' ایسی کھلی روشن دلیل جو انہیں لاجواب کر کے رکھ دے۔ جس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ وہ روشن دلیل تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کریم نے فرمایا، یہ باز آنے والے نہیں تھے۔ ان تاریکیوں سے نکلنے والے نہیں تھے۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ کفر سے باز آئیں گے یا کفر کی تاریکی چھٹے گی حتّٰی کہ وہ واضح دلیل آئے جو پانچ صدیوں کے کفر کا جگر چیر کر رکھ دے۔

رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ ۔۔۔ ''اللہ کے رسول ۔'' تو اللہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمادیا۔ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲ ''جو پاک اوراق پڑھتے ہیں۔'' ایسا قرآن جو خود بھی پاک ہے اور جو اس کو تھام لے اسے بھی پاک کردے۔ جس میں اتنی قوت ہو کہ جس کا ایک جملہ پانچ صدیوں کا کفر دھو کر صاف کردے۔ جو ایک مرتبہ کہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' (الصفت: 35) اور مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔'' (الفتح: 29) تو سارا کفر ڈھل کر بندہ فرشتے کی طرح پاک ہو جائے۔ یہ دونوں جملے قرآن کی آیات ہیں۔ ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم چاہیے تھا۔ ایسی کتاب چاہیے تھی جو پاک کردے۔ پاک ہو جانے کے بعد پاک رہنا اور دامن کو پاک لے کر قبر میں اترنا بھی مطلوب ہے۔ ایک مرتبہ پاک کرنا ہی نہیں تادمِ واپسیں اسے پاک رکھنا بھی تو ہے۔ وہ کیسے ہوگا؟

قرآن سب امور کو محیط ہے:

فرمایا: فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳ ''جن میں مستحکم آیات (لکھی ہوئی) ہیں۔'' فرمایا، قرآن ایسی کتاب ہے جس میں پوری زندگی کا ٹھوس لائحہ عمل ہے۔ قرآن میں قیامت تک کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔ پاک کرنے کے بعد پاک رکھنا بھی قرآن سے ہی ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرے۔ کتابِ الٰہی تمام امور کو محیط ہے۔ زندگی کے ہر سوال کا ٹھوس، صحیح اور آسان ترین جواب اس میں موجود ہے۔ ذات سے لے کر قومی اور بین الاقوامی امور تک۔ گھر، والدین، بیوی بچوں، بہن بھائیوں سے لے کر محلے، شہر، قوم و ملک تک۔ کاروباری معاملات سے لے کر، کاشتکاری، تجارت، ملازمت کے تمام ذرائع معاش تک۔ رشتہ داریوں، تعلقات، صلح و جنگ تک سب امور کو جامع ہے۔ اس میں سلطنت، ریاست، عدالت، جرم پر سزا سب کے بارے وہ احکام ہیں جو پوری دنیا کے لیے قابلِ عمل ہیں۔ قرآن نے اس بارے بھی مکمل راہنمائی دے دی اب تو یہ بندے کے ذمہ ہے کہ وہ زندگی کو قرآن کے احکام کے تابع کرے۔

آج کے کلمہ گو:

ہمیں قرآن پر ایمان کا دعویٰ ہے۔ الحمدللہ! ہمیں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا دعویٰ ہے۔ نعرے کی حد تک بڑی محبت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت چہرے پر ہو، اس سے ہمیں شرم آتی ہے۔ نعرے بہت بلند لگاتے ہیں اور معیشت کافرانہ ہے۔ نظامِ عدالت کافرانہ ہے۔ نظامِ تعلیم میں قرآن وسنت کو دخل نہیں۔ سیاست، قرآن وسنّت کے نظام سے عاری ہے۔ معلوم نہیں یہ محبت کی کون سی قسم ہے!

ایک حدیثِ مبارکہ کی تشریح:

مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ قربِ قیامت میں لوگ اپنی بیویوں سے زنا کریں گے تو اس کی کیا وضاحت ہے؟ اس حدیث کی یہ سمجھ نہیں آتی کہ بیوی تو منکوحہ ہوتی ہے۔ جب نکاح ہوگیا، بیوی بن گئی تو زنا کیسا؟ میں نے کہا جو میری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ قرآنی احکام کا انکار کفر ہے۔ قرآنی احکام کو ماننا پھر ان پر عمل نہ کرنا فسق ہے، گناہ ہے۔ یعنی کوئی کہے کہ قرآن کا حکم تو حق ہے میں اس حکم کے خلاف کر رہا ہوں، غلط کار ہوں تو وہ شخص گناہگار ہے، کافر نہیں۔ اور جو قرآن کے حکم کے خلاف کرتا ہے اور اپنے عمل کو صحیح کہتا ہے۔ قرآن کے حکم کے بارے کہتا ہے یہ تو مولویوں کا خوامخواہ کا شور ہے۔ جہاں قرآن کے حکم کو غلط کہا جائے وہ کفر ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ لوگ کلمہ تو پڑھتے ہیں۔ شریعت کے مطابق نکاح کرتے ہیں لیکن عقائد کی تردید کر دیتے ہیں۔ کتنے لوگ سود کے بارے کہتے ہیں یہ تو فضول بات ہے۔ ہم اپنے پیسوں پر پیسے لیتے ہیں اس میں حرام کہاں سے آگیا۔ اللہ کے حرام کردہ کو جب حلال کیا جاتا ہے تو یہ کفر ہے۔ ایسا کہنے سے بندہ کافر ہوگیا۔ کافر ہونے سے نکاح ختم ہوگیا۔ پھر کلمہ پڑھ لیا، نماز پڑھ لی، مسلمان تو ہوگیا لیکن نکاح کی تجدید تو نہیں کی۔ کفر بکنے سے نکاح ختم ہوا تھا پھر بیوی کے پاس گیا تو زنا ہی ہوا ناں! اپنی اپنی زندگی کا جائزہ لیں کتنے لوگ ہیں جو دن میں نکاح باطل کر بیٹھتے ہیں پھر کلمہ، درود شریف پڑھ لیتے ہیں تو مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائیں لیکن نکاح تو دوبارہ نہیں ہوتا۔ کوئی بھی دوبارہ نکاح نہیں کرواتا۔ تو پھر وہ زنا ہی کرتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد برحق ہے کہ ایسے لوگ آئیں گے جو اپنی بیویوں سے زنا کریں گے۔ ہم نسلوں سے مسلمان آرہے ہیں اور ہمارا حال یہ ہے کہ سود کھا رہے ہیں، حرام کھا رہے ہیں، رشوت لے رہے ہیں، ڈاکہ اور قتل و غارت میں مصروف ہیں۔ عجیب عذابِ الٰہی میں مبتلا ہیں۔ اگر ہمارا یہ حال ہے جنہیں قبولِ اسلام کے بعد سے عمریں گزر گئی ہیں تو جہاں پانچ سو سال تک کوئی بتانے والا نہیں تھا وہاں کیا حال تھا!

اللہ کریم فرماتے ہیں، ہم نے وہ سورج طلوع کر دیا جس نے تاریکیوں کے پردے چاک کر کے توحیدِ باری کی روشنی پھیلا دی اور اسی زمین پر ایسے بندے آگئے جن کے دامن کی پاکی کو فرشتے بھی ترستے ہیں۔ لاکھوں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوگئے۔ لاکھوں تابعی اور تبع تابعین بنے اور انہوں نے معلوم دنیا کے تین حصوں پر ریاستِ اسلامی قائم کر کے قرآنی احکام کو نافذ کر دیا۔ کیا لوگ تھے وہ! اور اُن کے وارث آج ہم اسلام پر کفر کے غلاف چڑھا رہے ہیں!

ببیں تفاوتِ را از کجا است و کجا

اور پھر ہمیں یہ گلہ ہے کہ ہم پر وہ برکتیں نازل نہیں ہوتیں جو اُن پر نازل ہوتی تھیں۔ ہم اپنا کردار تو دیکھیں۔ اللہ تو ہم پر اب بھی بڑا کرم کیے ہوئے ہے کہ ہم پر من الحیث القوم عذاب نہیں آتے۔ اللہ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یہ عمومی عذاب اٹھا دیے۔ یہ بھی صدقہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورنہ ہمارا کردار تو ان قوموں سے زیادہ نیچے گر چکا ہے جن پر یہ عذاب آئے تھے کہ قوم کی قوم غرق ہو گئی تھی۔ ہم جنس پرستی پر آسمان سے پتھر برسے تھے۔ زمین پھٹ گئی تھی پوری قوم کو زمین سمیت الٹا کر پٹخ دیا گیا تھا۔ ان معذب قوموں کے جرائم دیکھیں۔ تولنے میں بدکاری ہو رہی ہے، سود کا نام بدل کر اسے جائز قرار دے کر بے دھڑک لیا جا رہا ہے۔ کون سا جرم ہے جو تاریخ میں ملتا ہے اور آج نہیں ہو رہا۔ یعنی ایک ایک گناہ کے بدلے جن قوموں پر پتھر برسے، آگ برسی، زمین شق ہوئی، آسمان سے پانی برسا اور زمین نے پانی چھوڑ دیا اور قومیں عذاب الٰہی کا شکار ہو کر تباہ ہو گئیں۔ آج وہ سارے گناہ (اللہ معاف کر دیں) ہم مسلمانوں میں موجود ہیں۔

میں کافروں کی بات نہیں کر رہا۔ کافروں کے لیے ایک کفر ہی کافی ہے۔ کفر میں نیکی کا کیا تصور؟ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ ہم، جو مسلمان کہلاتے ہیں۔ آج ہمارا کردار ہر اس گناہ سے آلودہ ہے جس کی سزا میں قومیں تباہ ہو گئیں۔ من حیث القوم آنے والے عذاب تو اللہ کریم نے روک دیے لیکن ان کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ قحط سالی، سیلاب، وبائیں اور نئی نئی بیماریاں۔ عجیب وغریب مصیبتیں۔ شاید ہم سمجھ نہیں رہے کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دعویٰ تو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اتباع کافر کا۔ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لیتے ہیں اور دامن، کافر کا تھاما ہوا ہے! یہ منافقت کہلاتی ہے اور منافقت کفر سے بڑا جرم ہے۔

قرآن حکیم وہ کتابِ الٰہی ہے جس کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں۔ صدیوں کی تہہ بہ تہہ جمع ہوئی تاریکیاں چھٹنے والی نہ تھیں یہاں تک کہ اللہ کریم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شان سے مبعوث فرمایا کہ رہتی دنیا تک کے لیے عالم کو منور کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا جس کی آیات مستحکم اور جس کے احکام دین کو قائم رکھنے والے ہیں۔

اس بوڑھے آسمان نے دیکھا۔ ساری روئے زمین پر اللہ کا ایک بندہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف بلا رہے ہیں۔ اللہ کا نام لے رہے ہیں۔ پوری انسانی آبادی میں دوسرا فرد اُم المومنین، خواتین میں زوجہء محترمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ایک سے دو ہو گئے۔ مردوں میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور بچوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم جن

کی عمر دس سال کے قریب تھی۔ مسلمان ہوئے تو چار ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں۔ تیئس (23) برس میں دنیا کے حکمرانوں کے ایوانوں میں اور سلطنتوں کے درباروں میں زلزلے آ گئے۔ جزیرہ نمائے عرب ریاستِ اسلامی بن گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا نظامِ زندگی سکھا دیا، سمجھا دیا، عملاً نافذ کر دیا۔ اسلامی معاشرہ وجود میں آ گیا۔ اللہ کے حقوق بندوں پر، بندوں کے حقوق ربّ پر، لوگوں کے باہمی حقوق و فرائض، عقیدہ سے عمل تک سب سمجھا کر عملاً نافذ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما گئے۔ لیکن ایسی قوم تیار کر گئے کہ انہوں نے وصالِ نبوی کے تیئس برس کے اندر اندر زمین کے طول و عرض میں اللہ کا نظام عملاً نافذ کر دیا۔ عہدِ نبوت تیئس برسوں پر محیط ہے۔ عہد خلافت کے تیئس برس کی تاریخ پڑھیں۔ معلوم دنیا کے تین حصوں پر نہ صرف اسلامی ریاست پھیل چکی تھی بلکہ ساری ریاست پر اسلام عملاً نافذ تھا۔ معیشت اسلامی تھی۔ سود کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ عدلیہ اسلامی تھی۔ قرآن کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ نکاح طلاق کے اسلامی قانون رائج تھے۔ کافروں کو وہ حقوق حاصل تھے جو قرآن انہیں دیتا ہے۔ خود کافر حکومتیں انہیں وہ حقوق نہیں دے سکیں جو قرآن دیتا ہے۔

آج ہم ان کے وارث ہیں خواہی نخواہی کلمہ پڑھ لیتے ہیں۔ وقت بے وقت نمازیں پڑھ لیتے ہیں، روزہ رکھ لیتے ہیں لیکن معیشت سے معاشرت تک سیاست سے عدل تک سارا نظام کافرانہ اپنایا ہوا ہے اور اس پر یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ گویا قرآن یا اسلام، قابلِ عمل ہی نہیں ہم کیا کریں!

دنیا بھر میں ملکوں کے دستور بنتے ہیں۔ بڑے ملکوں کے سارے علاقوں میں ایک جیسا قانون نہیں ہوتا۔ امریکہ کی پچاس سے زائد ریاستیں ہیں۔ ہر ریاست کے قوانین دوسری ریاست سے کچھ نہ کچھ فرق ہیں۔ اس لیے کہ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ یہ ہر جگہ لاگو نہیں ہو سکتے۔ یہ اعجاز صرف قرآن کو حاصل ہے کہ صحرائے عرب میں مبعوث ہونے والے اللہ کے عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام انسانیت کو پہنچا دیا۔ قرآن ایسی طاہر، پاک کتاب ہے جس میں سارے دلائل انتہائی مضبوط ہیں۔ ایسے عقائد ہیں کہ انسانیت کا ہر فرد بلا تکلف اسے مان سکتا ہے۔ وہ گورا ہو یا کالا، کسی خطے کا ہو، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، کوئی سی بھی زبان بولنے والا ہو وہ اس پر اعتماد کر سکتا ہے۔ عبادات کے وہ طریقے بتائے جو روئے زمین پر بسنے والے سب انسانوں کے لیے یکساں آسان ترین ہیں۔ معاملات کے وہ طریقے بتا دیے جو ہر وقت اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے مضبوط اور ٹھوس قوانین عطا کر دیے جن میں قیامت تک کسی ترمیم کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ قرآن چونکہ قیامت تک کے لیے آیا ہے تو اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود لیا ہے۔ فرمانِ باری ہے: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر:9) ''بے شک یہ ذکر (قرآن) ہم نے

نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' جب اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تو کتاب کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ زمین پر کتاب کو ماننے والے ہوں۔ اسے یاد رکھنے والے ہوں گے تو یہ محفوظ ہوگی۔ اس کو سمجھنے والے ہوں گے، اس پر عمل کرنے والے ہوں گے۔ ایک طبقہ قیامت تک ایسا رہے گا جو اس کتاب کی حفاظت کا سبب ہوگا۔ اس پر ایمان لائے گا، اسے سیکھے گا، پڑھے گا، سمجھے گا، بیان کرے گا اور اس پر عمل بھی کرے گا۔ وہ اللہ کے خاص بندے ہوں گے۔

فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝٤ اور اہلِ کتاب جو متفرق ہوئے ہیں تو اپنے پاس دلیل واضح آنے کے بعد (ہوئے ہیں)

تفرقہ بازی کیوں؟

پہلے لوگ گمراہ کیوں ہوئے؟ پہلوں کے پاس بھی واضح دلائل پہنچے تھے۔ یہ اہلِ کتاب کیوں متفرق ہو گئے، کیوں آپس میں جھگڑتے رہے، انہوں نے کیوں اندھیرے پھیلا دیے، دنیا پر کیوں تاریکی چھا گئی؟ ان میں تفرقہ آ گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی منوانا چاہتا تھا۔ اپنی منوانے کے لیے انہوں نے کتابِ الٰہی کی آیات بدل دیں۔ احکام بدل دیے۔ الفاظ ہی بدل دیے اور ہر فرقے کا اپنا دین بن گیا۔ جہاں گمراہی آئی ہی اسی لیے کہ لوگوں نے اللہ اور اللہ کے نبی علیہ السلام کی بات کو چھوڑ دیا اور اپنی باتیں گھڑ کر اسے دین کا درجہ دے دیا۔

آج ہم کیوں گمراہی کا شکار ہیں؟ اللہ کی کوئی نہیں مانتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہیں مانتا، ہر کوئی اپنی منوانا چاہتا ہے۔ تقسیم در تقسیم ہو رہی ہے۔ ایک گھر میں پانچ سات افراد ہیں تو پانچ سات مذہب بھی ہیں۔ حکومت نے دینی ہم آہنگی کے لیے شعبہ اور ادارہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں سارے اپنی اپنی بات پر رہو، سارے متفق رہو۔ یہ نرالی بات ہے! اپنے آپ کے ساتھ بھی مذاق ہے کہ تم اپنی رائے رکھو میں اپنی رائے رکھوں اور ہم متفق ہیں۔ اسی پر تو گھر گھر لڑائی ہے۔ والدین، اولاد متفق نہیں۔ میاں بیوی متفق نہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ہر فرد یہ کہتا ہے میری بات مانی جائے۔ ساس کہتی ہیں، میری بات مانو۔ بہو کہتی ہے، میری مانو۔ جو حال گھروں کا ہے وہ قبیلوں، قوموں کا ہے۔ ہر کوئی اپنی منوانا چاہتا ہے۔

ہم آہنگی اور اتفاق کا بنیادی نکتہ:

ہم آہنگی کا بنیادی نکتہ جس پر اتفاق ہو وہ ایک ہی ہے۔ میری مانی جائے نہ آپ کی مانی جائے۔ میں بھی مانوں، آپ بھی مان لیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات! ہم آہنگی پیدا کرنی ہے تو سارے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لو ہم آہنگی ہو جائے گی۔ عقیدے میں مانو، عمل میں مانو۔ قرآن نے اتفاق و اتحاد کا

نسخہ بتا دیا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:80) ''جس نے پیغمبر کی اطاعت کی تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' اتحاد و اتفاق ہوتا ہے اس بات پر کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہی حق ہے، وہی اللہ کا فرمان ہے۔ اس ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لو، اتفاق ہو جائے گا۔ مسلمان ہو، آج بھی انقلاب آفرین بن سکتے ہو۔ آج بھی دنیا کو انقلاب سے آشنا کر سکتے ہو، شرط یہ ہے کہ صرف زبانی دعویٰ نہ کرو، خلوصِ دل سے عملاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لو۔

اہلِ کتاب کی کتابوں میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی، حلیہ مبارک، جائے پیدائش، خاندان تک کے بارے درج تھا۔ صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدین تک کی پہچان ان کی کتابوں میں موجود تھی۔ جب اس کے مطابق واقعات ظہور پذیر ہوئے تو انہیں انکار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

دوسری بات یہ کہ ان کی کتابوں میں نبوت، آخرت، قیامت، فرشتوں کے بارے وہی عقیدہ تھا۔ نیکی بدی کا وہی تصور تھا تو انہوں نے دینِ حنیف کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیوں کی؟

پھر اسلام نے کسی کو مسلط نہیں کیا کہ اس بندے کی مرضی کے مطابق تمہیں جینا ہے جیسے دنیوی، شخصی حکومتیں ہیں کہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہی، اس کی خواہش کے مطابق ہی جینا پڑتا ہے۔ اسلام نے شخصی حکومت، بادشاہت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ اسلام نے بندوں کی حکومت ختم کر دی اور خلافت کا تصور دیا۔

مسلمانوں کا امیر، خلیفہ:

مسلمانوں کا امیر خلیفہ ہوتا ہے، اللہ کا نائب ہوتا ہے، احکامِ الٰہی کو نافذ کرتا ہے۔ خلیفہ، معنی کے اعتبار سے ہی خود مختار نہیں ہوتا۔ نائب ہوتا ہے۔ جس کا نائب ہوتا ہے اسی کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اپنی مرضی نہیں کرتا۔ اگر دوسروں کو نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے تو خود بھی مکلف ہے۔ دوسرے زکوٰۃ دینے کے مکلف ہیں تو وہ خود بھی مکلف ہے۔ جو چیز دوسروں کے لیے حلال ہے وہی اس پر حلال ہے۔ جو دوسروں کے لیے حرام ہے، خود اس کے لیے بھی حرام ہے۔ اتنی ہی سختی سے وہ دین پر کاربند ہوتا ہے جس طرح دوسرے۔ انہی کی طرح ایک فرد ہوتا ہے۔ کیا یہ اہلِ کتاب اس لیے اختلاف کرتے ہیں کہ انہیں ایک بندے کی غلامی کرنی پڑ گئی ہے؟ اسلام نے تو یہ تصور ہی ختم کر دیا ہے۔ فرمایا: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔۔۔ ''اور ان کو حکم تو یہی ملا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔''

اہلِ کتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے۔ جانتے تھے کہ

نبیٔ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہو گئے اور قرآنِ مبین کا انکار کرنے لگے حالانکہ حکم تو یہ تھا کہ خلوصِ دل سے اللہ کی فرماں برداری کریں۔ نبی علیہ السلام کا اتباع، اللہ کی فرماں برداری ہے۔

آج ہمارے حکمران، اسلامی طریقے پر حکومت کیوں نہیں چلاتے؟ اس لیے کہ حکمران بادشاہ بن کر رہنا چاہتے ہیں، اپنی منوا کر حکمرانی چاہتے ہیں۔ اسلامی نظام کے قریب نہیں جاتے۔ کہتے ہیں، یہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ یہ جملہ کفریہ ہے۔ یہ طرزِ عمل منافقانہ ہے کہ کلمہ بھی پڑھ لیا اور یہ جملہ بھی کہہ دیا۔ سوچو! جس ربّ کا نظام قابلِ عمل نہیں اس کو ربّ کیسے مانتے ہو۔ جس کے احکام قابلِ عمل نہیں اسے ربّ مانا جائے، اس کی عبادت کیوں کی جائے۔ یہ سب کفریہ کلمات ہیں۔

ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کا نظام حق ہے۔ ہماری بدنصیبی ہے، ہم اتنے گناہگار ہیں کہ ہم اسے اپنا نہیں رہے۔ حکمران جان چھڑانے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ کون سے فرقے کا اسلام نافذ کریں۔ یہ کہنا بھی اسلامی نظام نافذ نہ کرنے کے بہانے ہیں۔ اسلام میں تو کوئی فرقہ ہے ہی نہیں۔ اسلام تو ایک ہے۔ فرقے اس لیے بن گئے ہیں کہ ہر کوئی اسلامی احکام کی تشریح اپنی مرضی سے کر رہا ہے قرآن تو ہم ایک ہی پڑھتے ہیں لیکن معانی اپنی مرضی کے پہناتے ہیں۔ عربی ایک وسیع المعانی زبان ہے۔ جب قرآنِ حکیم نازل ہوتا تو صحابہؓ کرام اپنی عربی دانی کے باوجود اپنی مرضی سے معنی مقرر نہیں کرتے تھے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوچھتے کہ جانتے ہو کہ اس آیت کا معنی کیا ہے؟ تو یہی فرماتے اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ اللہ بہتر جانتے ہیں یا اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ اور جو معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے وہ قبول کیا جاتا اور اس کے مطابق حل کیا جاتا۔

آج بھی ہم اپنے اپنے معانی اختیار کرنا چھوڑ دیں اور وہ معانی اختیار کریں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے۔ صحابہ کرامؓ نے سمجھے، سیکھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عمل کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمائی کہ اس فرمانِ الٰہی کی یہی مراد تھی تو سب ایک ہو جاتے ہیں۔ عقائد بھی ایک ہو جاتے ہیں اور اعمال بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ حکمران چاہیں تو اسلام نافذ ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا۔ لیکن وہ یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ کون سا اسلام نافذ کریں۔ وہ اسلام نافذ کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ اللہ نے کسی شخص کی غلامی کا حکم نہیں دیا۔ یہ لوگوں کو اپنی غلامی میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے بندوں پر سے بندوں کی حکمرانی ختم کر دی۔ صرف اللہ کی اطاعت کا حکم دیا۔ امیر المومنین بھی اتنا ہی مکلف ہے جتنا ایک عام آدمی مکلف ہے۔ اس کے لیے وہی حلال ہے جو

ایک عام شہری کے لیے حلال ہے۔اس کے لیے بھی وہ حرام ہے جو عام شہری کے لیے حرام ہے۔

فرمایا: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝۵ ''اُن کو یہی حکم ملا تھا کہ اخلاص کے ساتھ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی سچا دین ہے۔'' مسلمان کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ بغیر لگی لپٹی رکھے ٹک سیدھا چلے۔ عبادت کی پابندی کریں اور اموال اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کریں۔عبادات کی پابندی اللہ کریم سے تعلق قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں اور اسلامی معاشی نظام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ مال، کسی فرد کا نہیں یہ اس کا ہے جس کی کائنات ہے۔فرد کے پاس عارضی طور پر ملکیت ہے۔دراصل یہ اللہ کی امانت ہے۔جائز حدود کے اندر استعمال کر سکتا ہے۔حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔یہی سچا، کھرا دین ہے۔اس میں صرف اتنا سا ہے کہ عبادات قائم کی جائیں۔مالی معاملات میں اللہ کی اطاعت کی جائے۔حلال کمایا جائے اور جائز امور پر خرچ کیا جائے۔قانون سب کے لیے ہے۔شاہ و گدا سب کے لیے ایک ہی قانون ہے۔

اس کے آسان ہونے کے باوجود، حق ہونے کے باوجود، اس کے قابلِ عمل ہونے کے باوجود اہل کتاب، مشرک جب اس میں اختلاف کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔۔۔۔ بے شک جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہلِ کتاب اور مشرک، وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے (اور) ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

دینِ حق سے اختلاف کرنے والے دوزخ میں داخل کیے جائیں گے اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔اللہ کریم اس انجام کی خبر دنیا میں ہی دے رہے ہیں۔دنیا وقتی لمحاتی ہے آخرت مستقل، دائمی اور ابدی ہے۔اصل ہے، حقیقت ہے۔ اصل چیز قائم رہتی ہے، سایہ ختم ہو جاتا ہے۔جوں جوں سورج ڈھلتا ہے سایہ لمبا ہوتا رہتا ہے۔سورج ڈوبتا ہے، سایہ ختم ہو جاتا ہے۔دیوار تو قائم رہتی ہے جو اصل ہوتی ہے۔سایہ اسی سے متاثر ہوتا ہے۔جتنی دیوار ہوگی اتنا سایہ ہوگا۔جتنا درخت ہوگا اتنا سایہ ہوگا۔پتے، جتنے کم ہوں گے اتنا کم سایہ ہوگا۔اسی طرح جس کی آخرت بہترین ہے، اس کی دنیوی زندگی پر سکون ہے۔دنیوی زندگی چونکہ آخرت کا ظل یعنی سایہ ہے، پرتو ہے اسی لیے آخرت کے انجام سے متاثر ہوتی ہے۔جس کے لیے آخرت میں جہنم ہے اس کے لیے دنیا بھی جہنم بن جاتی ہے۔زندگی دکھوں سے بھر جاتی ہے۔

فرمایا، مشرکین یا اہلِ کتاب میں سے جو کوئی دینِ اسلام کا انکار کرے گا، کفر کرے گا اسے دوزخ جانا ہوگا جہاں اسے ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہوگا۔اس لیے کہ: اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶ یہ لوگ ساری مخلوق سے بدتر ہیں۔

دنیا میں بدترینِ خلائق وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے دین کو قبول نہیں کیا۔ اللہ کے ان گنت احسانات کو بھول کر اس کی نافرمانی کی۔ اللہ کی بے شمار عنایات کی ناقدری کی۔ اللہ نے انسان کو بے پناہ نعمتیں دیں اور انہوں نے اس کی عظمت کا انکار کیا، اس کی اطاعت سے منہ موڑا۔ اس کے نتیجے میں ان کی دنیوی زندگی بھی جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔ گھروں میں سکون ہوگا نہ کمائی میں برکت ہوگی۔ آپس میں محبت ہوگی نہ اطمینان ہوگا۔ ڈر خوف، ڈاکے چوریاں ہوں گی، رشوت، لوٹ مار ہوگی ناجائز قتل ہوں گے اور ظلم کا دور دورہ ہوگا۔

ان کے مقابلے میں ایمان والوں کے لیے خوش خبری ہے۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔

فرمایا، وہ لوگ میری بہترین مخلوق ہیں جنہوں نے میری عظمت کا اقرار کیا۔ میری اطاعت کا حق ادا کیا، میری نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ اللہ کریم نے یہاں بھی ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید لگا دی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ہر جگہ جہاں ایمان کی بات آئی ہے وہاں اعمال صالح کا ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فرمایا جا رہا ہے کہ جنہوں نے اپنے بہترین مخلوق ہونے کا حق ادا کیا وہ، وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمال صالح کیے۔ عنداللہ ایمان کا معنی یہ ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد مومن کا کردار بھی درست ہو جائے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا کردار کافروں جیسا ہے۔ قرآن میں ایسی مسلمانی کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن میں ایمان کی تعریف یہی ہے کہ جو ایمان لائے اس کا کردار صالح ہو جائے۔ جس کا کردار اس کے ایمان، عقیدے کے مطابق ہو۔ جن لوگوں نے اپنے کردار سے اپنے ایمان کو ثابت کیا وہ اللہ کی بہترین مخلوق ہیں۔ اُن کو یہ انعام ملے گا: جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۔۔۔ ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن کے تابع نہریں جاری ہیں، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔۔۔ اللہ اُن سے خوش اور وہ اس سے خوش۔

جنت ابدی ہے اس لیے ایمان رکھنے اور اعمال صالح کرنے والوں کو ہمیشگی کی راحتیں نصیب ہوں گی۔ جنت کی اہمیت کیا ہے؟ جنت رضائے الٰہی کی سند ہے۔ یہ اللہ کے راضی ہونے کی دلیل ہے۔ جنہیں جنت ملے گی یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اللہ ان پر راضی ہے۔ انہیں جنت کی ابدی نعمتیں نصیب رہیں گی۔ ان میں ہر آن ترقی ہوتی رہے گی۔ اللہ کریم انہیں اتنا دیں گے کہ مانگنے کی حاجت ہی نہ رہے گی۔ اللہ ان کی آرزو اور تمنا سے بڑھ کر عطا فرمائیں گے۔

خشیت کیا ہے؟

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ؀ یہ صلہ ہے اس کے لیے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے یہ انعامات اس کے لیے ہیں جس کے دل میں اپنے پروردگار کی خشیت ہے۔ خشیت کیا ہے؟ عربی وسیع زبان ہے اردو کا دامن تنگ ہے۔ اردو ترجمہ کرتے ہوئے خشیت کا معنی یہی لکھنا پڑتا ہے کہ جو اپنے ربّ سے ڈرتا رہا۔لیکن لفظ ڈر خشیت کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتا۔ ڈر کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً دشمن کا ڈر، موذی جانور کا ڈر، کسی نقصان کا ڈر، بیماری کا ڈر وغیرہ۔ خشیت، دل کا ایک لطیف ساجذبہ ہے۔ ہم کسی کو خلوصِ دل سے چاہتے ہوں تو اس سے ایسا قلبی تعلق جو اس کا مطیع بنالے۔عرب شاعر کہتا ہے: فَاِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعُهٗ۔ محبت ایسا جذبہ ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کا اسیر ہو جاتا ہے، مطیع اور تابعدار ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا فعل ہے۔ اللہ کریم سے ایسا تعلق قائم ہو جائے۔ اللہ کریم سے ایسی محبت ہو جائے کہ بات بات پر ڈر لگے کہ ایسا کہنے یا ایسا کرنے سے کہیں اللہ کریم خفا نہ ہوں تو یہ خشیت ہے۔ یہ رشتہء الفت میں بال آنے کا ڈر ہے۔ یہ رشتہ بنائے نہیں بنتا۔ یہ کیفیات ہیں۔ کیفیات انبیاؑ سے نصیب ہوتی ہیں۔ سوچتے رہنے سے کیفیات نہیں بنتیں۔ ایک آدمی پہروں سوچتا رہے کہ وہ بادشاہ ہے تو کیا وہ بادشاہ بن جاتا ہے؟ سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

خشیت کہاں سے آئے؟ یہ وہ کیفیت ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے قلوب سے تقسیم ہوتی رہیں۔ انبیاؑ جب مبعوث ہوئے تو انؑ کے قلوب کیفیات کا خزانہ، مصدر اور منبع تھے۔ جو ان پر ایمان لایا وہ صحابیؓ ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ان کیفیات کا وہ سمندر امڈا جو تا قیامت جاری رہے گا۔ جس نے براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یا کسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک پڑی۔ اس ایک نگاہ میں جو قلبی کیفیات منتقل ہوئیں وہ بغیر ملاقات کے نصیب نہ ہوئیں۔ بغیر بارگاہِ نبوت کی حاضری کے کوئی صحابیؓ نہ بن سکا۔ صحابہؓ کے پاس بھی اس کثرت سے آئیں کہ جو ان کی مجلس میں پہنچا تابعی بن گیا۔ یہ طبقے ہی الگ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے: خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ۔۔۔ تم لوگوں میں بہتر میرے زمانے کے لوگ (صحابہؓ) ہیں پھر جو ان کے بعد والے (تابعین) ہیں پھر ان کے بعد والے (تبع تابعین) ہیں۔۔۔ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے) (صحیح البخاری) اور صحیح مسلم۔

فرمانِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مفہوم ہے کہ سب سے زیادہ خشیت الٰہی رکھنے والے لوگ، انسانیت کے بہترین افراد میرے زمانے میں ہیں پھر اس کے بعد والے زمانے کے لوگ (صحابہ کرامؓ) پھر اس کے بعد

والے (تابعین) کے زمانے کے۔ اور پھر ان کے بعد والے۔ یعنی دنیا پر جتنے دور گزرے ہیں اور جتنے زمانے گزریں گے ان میں بہترین لوگ عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ پھر تابعین اور پھر تبع تابعین۔ تبع تابعین کے بعد محض صحبت سے کام نہ بنا کہ صرف سامنے آتے اور سینہ منور ہو جاتا۔ پھر لوگوں کو اپنے سینے روشن کرنے کے لیے محنت کرنا پڑی۔ ذکرِ قلبی، اللہ اللہ کی، صالحین کی صحبت میں رہ کر اُن کے سینے سے انوارات اپنے قلوب میں جذب کیے تو قلب میں خشیت پیدا ہوئی۔

جن لوگوں نے یہ دولت حاصل کی انہیں ہم ولی اللہ کہتے ہیں۔ اسلام میں پیری مریدی کی بنیاد ان دینی جذبوں اور کیفیاتِ ایمان کے حصول پر ہے۔ پیر وہ ہے جس نے اپنے شیخ کی خدمت میں رہ کر، ذکر کر کے دل کو روشن کیا اور خشیتِ الٰہی سے اپنا سینہ اتنا منور کیا کہ دوسروں کے قلوب میں انڈیلنے کے قابل ہوا۔ مرید وہ ہے جس نے ان کیفیاتِ ایمانی کو حاصل کرنے کے لیے پیر کی صحبت اختیار کی۔ پیر سے بیعتِ طریقت، برکات حاصل کرنے کی بیعت ہے۔ خشیت حاصل کرنے کے لیے ہے۔

پیر یا شیخ دنیوی مسائل کے حل کے لیے نہیں ہے۔ یہ جو لوگوں نے تصور بنا لیا ہے کہ بیعت ہو جاؤ کہ پیر کی دعا سے اولاد ہو گی یا ان کی دعا سے روزی ملے گی یا بیماری دور ہو جائے گی تو یہ ہندوؤں کے وہ تصورات ہیں جو انہوں نے پروہتوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں سے وابستہ کر رکھے ہیں۔ اسلام کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔

دینِ اسلام میں شیخ یا پیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات کو مریدوں کے سینے میں انڈیلنے کا کام کرتا ہے اس آیہء مبارکہ میں مومنین کے اخروی انعامات کا ذکر ہے کہ یہ انعامات انہیں نصیب ہوتے ہیں جنہیں اپنے پروردگار کی خشیت نصیب ہو جائے۔ اللہ کریم سے وہ گہرا قلبی تعلق پیدا ہو جائے جو زندگی کو اللہ کریم کی پسند کے مطابق ڈھال دے۔ اور بندہ ربّ کریم کی ناپسند سے بچنے کی کوشش میں رہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے نصیب ہوتا ہے وہ برکات شیخِ کامل کی صحبت سے نصیب ہوتی ہیں۔

سورۃ الزلزال رکوع 1 آیات 1 تا 8

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۟ۙ۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۟ۙ۲ وَقَالَ
الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۟ۚ۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۟ۙ۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۟ؕ۵
يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۟ؕ۶ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۟ؕ۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۟۸

جب زمین اپنے ہی بھونچال سے ہلا دی جائے گی ﴿۱﴾ اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی ﴿۲﴾ اور انسان کہے گا اس کو کیا ہوا ہے؟ ﴿۳﴾ اُس روز وہ اپنے حالات بیان کر دے گی ﴿۴﴾ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا (ہوگا) ﴿۵﴾ (تو) اُس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تا کہ اُن کو اُن کے اعمال دکھا دیے جائیں ﴿۶﴾ تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا ﴿۷﴾ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا ﴿۸﴾

تفسیر و معارف

سورۂ زلزال مدنی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں اللہ کریم نے قیامت کے دن کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ کسی بھی کام کو کرنے کا مقصد اس کا نتیجہ حاصل کرنا ہوتا ہے اور ہر کوئی کام کا اچھا نتیجہ ہی چاہتا ہے۔ قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے لہٰذا عقائد و نظریات سے لے کر اعمال و کردار تک کے اخروی نتائج بھی بیان فرماتا ہے کہ اگر بندہ اچھا نتیجہ، بہتر انجام چاہتا ہے تو وہ اپنے عقیدے کی اصلاح کر لے اور کردار کی بھی اصلاح کر لے۔ کیونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ عقیدہ درست ہو تو تقاضا کرتا ہے کہ کردار درست ہو۔

ارشاد ہوتا ہے: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ ''جب زمین اپنے ہی بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔'' زمین کو اس قدر جھنجھوڑا جائے گا کہ انسان کے تصور میں نہیں آسکتا۔ زمین پر بہت بڑا زلزلہ آئے گا۔ اتنا بڑا کہ پہاڑ گر کر برابر ہو جائیں گے۔ زمین کے نشیب و فراز بھر جائیں گے۔ ایک چٹیل میدان بن جائے گا۔ گرمی کی اس قدر شدت ہوگی کہ سمندر بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝٢ ''اور زمین اپنے اندر کے بوجھ نکال ڈالے گی۔'' زمین میں اللہ نے ہزاروں اقسام کے خزانے چھپا رکھے ہیں۔ سونا، چاندی، ہیرے جواہرات بہت کچھ ہے۔ انسان، حیوان چرند پرند سب کے رزق کے وسائل سے اس کا سینہ پُر ہے۔ پھر تمام جاندار مر کر اسی زمین کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ وہ ایسا بڑا زلزلہ ہوگا کہ زمین اپنے اندر سموئی ہوئی ہر چیز باہر نکال پھینکے گی۔ انسان بھی اور زر و جواہر بھی! اس دن دولت کے، زر و جواہر کے ڈھیر پڑیں ہوں گے لیکن کوئی انسان ان کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوگا۔ آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آخری انسان تک زمین سے نکل کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور کہیں گے: وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝٣ ''اور انسان کہے گا اس کو کیا ہوا ہے۔'' ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھیں گے کہ یہ زمین کو کیا ہو گیا ہے اس نے یہ کیا کر دیا، ہر چیز نکال کر سامنے رکھ دی ہے۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ حیرت زدہ ہوں گے کہ مال و دولت ہی نہیں ہر جاندار کو باہر نکال دیا۔ ہر انسان زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ اسی حیرت میں ہوں گے کہ زمین قصّے بیان کرنا شروع کر دے گی یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝٤ ''اس روز وہ اپنے حالات بیان کر دے گی۔'' یعنی سطحِ زمین پر انسانوں نے جو کچھ کیا وہ سب بیان کرنا شروع کر دے گی۔ ایک ایک فرد کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے گی کہ فلاں وقت اس نے یہ کیا اور فلاں وقت وہ کیا۔ انسان کتنا بھی چھپ جائے، عمل تو زمین پر ہی کرتا ہے۔ کسی تہہ خانے میں اتر جائے، کمرے میں چلا جائے، اندھیرے میں کرے، ہر حال میں زمین پر ہی کرتا ہے۔ زمین گواہ ہوتی ہے۔ نیک لوگوں کے لیے گواہ ہوتی ہے کہ اس نے تیرے سجدوں سے مجھے آباد کیا۔ اس نے مساجد کو تیرے نام سے آباد کیا۔ یہ تیرا کلام پڑھتا تھا۔ تیری یاد میں مگن رہتا تھا۔ یہ میرے سینے پر شہید ہوا۔ یہ حلال کماتا تھا، تیرے حکم کے مطابق خرچ کرتا تھا۔ ہر بندے کے راز اگلنا شروع کر دے گی۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝٥ ''کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا'' ایک ایک بندے کے بارے میں بتائے گی۔ اس لیے کہ اللہ اسے حکم دیں گے۔ وہ کیسے بولے گی؟ جس نے انسان کو بولنا سکھایا وہی اسے بولنے کی قوت دے گا۔ انسان کیسے بولتا ہے؟ انسان کے منہ میں زبان ہے۔ لیکن زبان تو ہر جانور کے منہ میں بھی ہے۔ وہ انسانوں کی طرح باتیں کیوں نہیں کرتے؟ اگر اللہ نے انسان کو بولنا سکھا دیا ہے تو زمین کو بھی سکھا دے گا۔

یہ اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ہر فعل پر اس کا نتیجہ آئے۔ جس طرح انسان بیج بوتا ہے اس پر پودا اگانا اور پھل لگانا تقاضائے ربوبیت ہے۔ اسی طرح ہر عمل ایک بیج ہے اس پر ایک پودا، ایک تناور درخت بنتا ہے۔ اس پر پھل لگتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں انسان نے ایک پودا لگایا، اس درخت کو پالا۔ برزخ میں اس کا انتظار کیا۔ جب قیامت قائم ہوگی، نتائج کا پھل لگنے کا وقت آئے گا۔ اعمال پر پھل لگے گا۔ کردار کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ یہ لازماً ہوگا، ضرور ہوگا۔ کائنات بھر میں اس کی ربوبیت کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہر عمل کا ایک انجام ہے۔ حیاتِ انسانی بھی بے نتیجہ نہیں۔ انسان کے نظریات و اعمال اور اس کا کردار بے نتیجہ نہیں۔ اس کے ہر ہر عمل پر نتیجہ نکلے گا اور اس دن انسان کے اعمال کو گواہوں اور شہادتوں سے ثابت کیا جائے گا۔ اللہ کریم تو ہر انسان کے احوال سے براہ راست واقف ہیں لیکن اللہ نے انسان کے لیے اس پر کراماً کاتبین دو فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو ساری زندگی اس کے نیک و بد اعمال نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ قیامت کو انسان کہے گا کہ یا اللہ! میں نے تو یہ نہیں کیا نہ ہی مجھے کچھ یاد ہے۔ اللہ کریم فرمائیں گے ہم نے دو فرشتے تمہارے ساتھ مقرر کر رکھے تھے۔ وہ ساری زندگی تمہارا کہا سنا، کیا سب لکھتے رہے۔ کہے گا، میں نے تو انہیں زندگی بھر نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کیا لکھتے رہے۔ اللہ کریم اس کے ہاتھ پاؤں، زبان، کھال سارے وجود کو حکم دیں گے، انہیں بولنے کی قوت دیں گے۔ وجود کا ایک ایک عضو بتائے گا کہ اس نے یہ بھی کیا اور یہ بھی کیا۔ انسان پریشان ہو جائے گا۔ اپنے ہی اعضا و جوارح کو کہے گا: لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۔۔۔ ”تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت:21) وہ کہیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے بولنے کی طاقت دی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی۔“

پھر زمین کو حکم ہوگا کہ تُو گواہ ہے، تجھ پر اس شخص نے یہ سارے کام کیے تھے اور اس دن زمین بھی اور اس کا وجود بھی اس کے اعمال کا گواہ بن جائے گا۔ سارے ثبوت اس کے سامنے ہوں گے۔ اللہ بڑے کریم ہیں، کسی کو خلوصِ دل سے توبہ نصیب ہو، وہ رجوع الی اللہ کرے۔ اللہ اسے معاف کر دے تو جو چیز اللہ نے معاف کر دی وہ ہر جگہ سے مٹ جائے گی۔ ہر ایک کی یاد سے مٹ جائے گی، زمین کو یاد ہوگی نہ اعضا و جوارح کو اور نہ ہی فرشتوں کی تحریر میں موجود رہے گی۔ یہ اس کے کرم کے انداز ہیں لہٰذا انسان جتنا بھی دور جا چکا ہو، جتنی غلطیاں کوتاہیاں، برائیاں کر چکا ہو، جتنا بھی ظلم کر چکا ہو اس سب کا علاج سچی توبہ ہے اور رجوع الی اللہ ہے۔ توبہ کا دروازہ ہمہ وقت کھلا ہے، آج وقت ہے ہمیں توبہ کر کے اصلاحِ احوال کر لینی چاہیے ورنہ ہر چھوٹی بڑی بات زمین بھی بتانا شروع کر دے گی۔

کردار کے مطابق گروہ:

فرمایا: یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ؕ﴿۶﴾ "(تو) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھا دیے جائیں"۔ اس دن لوگوں کو ان کے عقائد و نظریات، اعمال و کردار کے اعتبار سے گروہوں میں کھڑا کر دیا جائے گا۔ جس کے نظریات و عقائد، اعمال و کردار آپس میں ملتے ہوں گے اسے اسی گروہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کفار کی مشابہت بھی اختیار نہ کی جائے۔ کیونکہ جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا قیامت کو ان ہی کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے گا۔ فرمایا: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (سنن ابوداؤد)

آج دارِ دنیا میں عمل کی مہلت ہے، موقع ہے۔ آج اپنا عقیدہ، نظریہ، کردار اور حلیہ اس گروہ کا بنا لے جس میں قیامت کو کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ روزِ محشر لوگ اس لیے گروہ در گروہ کر دیے جائیں گے کہ ہر کوئی اپنا کردار دیکھ لے دنیا میں جو کیا تھا، بھلائی برائی، نیکی بدی وہ سب دیکھ لے!

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ؕ﴿۷﴾ تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ﴿۸﴾ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

اسی لیے علمائے حق فرماتے ہیں کہ کوئی عمل چھوٹا نہیں ہے۔ کسی گناہ کو بھی چھوٹا سمجھ کر نہ کیا جائے کیونکہ ہر چھوٹا بڑا گناہ میدانِ حشر میں سامنے آ جائے گا۔ کسی عمل کو اس اعتبار سے دیکھنا کہ یہ معمولی عمل ہے، یہ ایک اور چیز ہے اور اس اعتبار سے دیکھنا کہ یہ حکم عدولی کس کی ہے؟ یہ ایک اور نقطۂ نظر ہے۔ ہر گناہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے خواہ وہ گناہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ نافرمانی تو اللہ کی ہے۔ اس لحاظ سے ہر نافرمانی بہت بڑا گناہ ہے۔ کسی گناہ کو ہلکا سمجھ کر اختیار نہ کیا جائے۔ میدانِ حشر میں وہ بھی مصیبت بن جائے گا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ انسان کو ہر وقت توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ استغفار پڑھتے رہنا چاہیے۔ اور یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ کریم میں جو غلطی جان بوجھ کر کر چکا ہوں وہ معاف کر دیں اور جو نادانی میں، نہ سمجھتے ہوئے، نہ جانتے ہوئے کر گیا ہوں وہ بھی معاف فرما دے۔ اس زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ میں پارسا ہو گیا ہوں۔

انسان سوچ وفکر سے لے کر کردار تک ہزاروں ایسی غلطیاں روز کر جاتا ہے جنہیں وہ خود غلطی سمجھتا ہی نہیں۔ جو گناہ ہم دیدہ دلیری سے کرتے ہیں وہ تو بات ہی اور ہے۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ آج دوسروں کا مال لوٹنا، ناجائز طور پر فائدہ اٹھانا، غلط سفارشیں کرنا ہم نے معمول بنا لیا ہے اور اسے گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ حتّٰی کہ قتل ودہشت گردی کو بھی عام بات سمجھ لیا ہے۔ یہ باتیں معمولی نہیں ہیں۔ جب ان کی جوابدہی ہوگی تو بہت مشکل بن جائے گی۔ قرآن کریم نے وہ سارا نقشہ سامنے کر دیا ہے۔ قرآن کا ایک ایک لفظ حق ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔ یقیناً میدانِ حشر میں ایسا ہی ہوگا۔

وہ تو بڑے ہی بدبخت تھے جنہوں نے کفر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔ اس لیے انہوں نے اطاعتِ الٰہی سے منہ موڑا لیکن ہمیں تو یہ احساس کرنا چاہیے۔ ہم جنہیں کلمہ طیبہ نصیب ہوا، ہم جب اللہ کی الوہیت کا اقرار کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں۔ قرآن کو اللہ کا ذاتی کلام مانتے ہیں۔ اس کے ایک ایک لفظ کو سچ مانتے ہیں تو ہمارا کردار تو اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہماری زندگی قرآن کے بتائے ہوئے نقشہء حیات میں ڈھل جائے۔ اسی کا نام مسلمانی ہے اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ نام مسلمانوں کا، کردار کافروں کا! یہ تو بڑی گستاخی ہے۔ تہذیب کے نام پر بے حیائی، سیاست کے نام پر دھوکا، تحائف کے نام پر رشوت! ہم نے برائیوں کے کیا خوبصورت نام رکھ دیے ہیں۔ برائی، زہر ہے۔ اس پر جتنے چاہے خوبصورت غلاف چڑھا دیں اس کا اثر تو زہر کا اثر ہی ہے۔ موت ہی ہے۔ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ سود کا نام منافع رکھ دینے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ کُتے کا نام دنبہ رکھ دینے سے کُتا حلال نہیں ہوگا۔ اس پر جواز یہ دیا جاتا ہے کہ سارے ہی ایسا کر رہے ہیں۔ میدانِ حشر میں ہر کوئی اپنے کردار کے حساب سے گروہ میں کھڑا ہوگا۔ آج فیصلہ کر لو کہ کس گروہ میں کھڑا ہونا چاہتے ہو؟

ایک گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں بھی ہوگا۔ صحابہ کرامؓ بھی ہوں گے۔ سوچ لو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانبرداروں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتے ہو، اولیائے امت، صلحائے امت کے ساتھ کھڑا ہونا چاہتے ہو؟ زندگی، اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، وہ نعمت ہے جو زندگی میں ایک بار ہی ملتی ہے۔ پھر دنیا میں دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔ یہ سنہری موقع ہے، گولڈن چانس ہے جو ایک ہی دفعہ ملتا ہے۔ اس کے لحات کو اللہ کی یاد سے منور کریں کہ اطاعتِ الٰہی کی توفیق ہو۔ درود شریف سے روشن رکھیں۔ اتباعِ رسالت کی توفیق ملے گی۔

سورۃ العٰدیٰت رکوع 1 آیات 1 تا 11

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿١﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿٢﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿٣﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ
نَقْعًا ﴿٤﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿٥﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿٦﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِيْدٌ ﴿٧﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿٨﴾ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ﴿٩﴾
وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ﴿١٠﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿١١﴾

اُن سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اُٹھتے ہیں ﴿۱﴾ پھر (پتھروں پر) نعل مار کر آگ نکالنے والوں کی ﴿۲﴾ پھر صبح کے وقت چھاپہ مارنے والوں کی ﴿۳﴾ پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں ﴿۴﴾ پھر اس وقت (دشمن کی) فوج میں جا گھستے ہیں ﴿۵﴾ بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے ﴿۶﴾ اور یقیناً وہ اس بات پر گواہ بھی ہے ﴿۷﴾ اور یقیناً وہ مال سے سخت محبت کرنے والا ہے ﴿۸﴾ کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں سے (مُردوں کو) اُٹھایا جائے گا؟ ﴿۹﴾ اور جو (بھید) دلوں میں ہیں وہ حاصل کر لیے جائیں گے ﴿۱۰﴾ یقیناً ان کا پروردگار اُس روز ان سے خوب واقف ہوگا ﴿۱۱﴾

تفسیر و معارف

سورۂ عادیات شروع ہوتی ہے۔ یہ مکّی سورتوں میں سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿١﴾ ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿٢﴾ پھر (پتھروں پر) نعل مار کر آگ نکالنے والوں کی۔ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿٣﴾ پھر صبح کے وقت چھاپہ

مارنے والوں کی۔ فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا ۝۴ پھر اس میں گرد اٹھاتے ہیں۔ فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا ۝۵ پھر اس وقت (دشمن کی) فوج میں جا گھستے ہیں۔

یہ ساری صفات میدانِ جہاد میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کی گنوائی گئی ہیں۔ دراصل یہ تعریف جہاد کی ساری کوششوں اور کاوشوں کی ہے۔ اس عہد میں گھوڑے تھے۔ اب جنگی ہوائی جہاز، زمینی ٹینک، بحری جنگی جہاز اور جدید اسلحہ یعنی جہاد کے تمام وسائل و ذرائع ہیں۔ اللہ کریم کے نزدیک جہاد کے وسائل کی اتنی عظمت ہے کہ اللہ کریم انہیں گواہ بنا رہے ہیں، ان کی قسم دی جا رہی ہے تو خود جہاد کی، مجاہدین کی عظمت کیا ہوگی! جہاد کا ذکر ہو رہا ہے کہ گھوڑوں کے لشکر تیار کرنا، ان کی نعل بندیاں کرنا، علی الصبح چھاپے مارنا، دشمن کے فوجیوں پر ٹوٹ پڑنا، کشتوں کے پشتے لگا دینا۔ یہ سب تو انسانوں کو مارنے اور قتل و غارت والی بات ہے تو پھر جہاد کیا ہے؟ جہاد یہ ہے کہ ظلم سے روکا جائے۔ اسلام قتل و غارت کے لیے جہاد نہیں کرتا۔ اس لیے اسلام میں جنگ نہیں جہاد ہے۔ جنگ دشمن کو تباہ کرنے کے لیے، اس کے علاقے چھین لینے کے لیے، اس کے وسائل ختم کرنے کے لیے، اس کے جوانوں کو قتل کرنے کے لیے ہے۔ اسلام نے اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اسلام میں جہاد ہے۔ جہاد میں ظلم سے روکا جاتا ہے۔ اس حد تک جہاد کیا جاتا ہے جس حد تک وہ ظلم پر اصرار کرتا ہے۔ ظلم سے توبہ کر لے، ظلم کرنا چھوڑ دے تو جہاد ختم۔ پھر میدانِ جہاد میں بھی دشمن کے وسائل تباہ نہیں کیے جاتے۔ قتلِ عام نہیں کیا جاتا۔ جو تلوار نہیں اٹھاتا اسے نہیں چھیڑا جاتا۔

جہاد کا یہ سارا منظر پیش کر کے فرمایا: اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ۝۶ بے شک انسان اپنے ربّ کا ناشکرا ہے۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيۡدٌ ۝۷ اور یقیناً وہ اس بات پر گواہ بھی ہے۔

ناشکرا ہونے سے کیا مراد ہے؟ اللہ نے نظامِ حیات دیا جو اس کے لیے بھلائی ہی بھلائی تھا لیکن وہ خود ہی اس نظام کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ یہ ناشکرا پن ہے۔ فرمایا جہاد کے وسائل اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان اپنے رب کی ناشکری کرتا ہے۔ ناشکری کیا ہے؟ اللہ کریم نے انسانی معاشرے میں مل جل کر رہنے کے لیے کچھ ضابطے کچھ اصول وضع کیے ہیں جس سے معاشرے میں توازن قائم رہتا ہے۔ یہ بندوں کا حق نہیں کہ وہ لوگوں کے حقوق و فرائض متعین کریں۔ مثلاً ایک گھر ہے، خاندان ہے۔ اس میں والدین اور اولاد کے حقوق ہیں، خاوند اور بیوی کے حقوق ہیں۔ اسی طرح اولاد کے اور والدین کے فرائض بھی ہیں۔ میاں کے حقوق ہیں تو میاں کے فرائض بھی ہیں۔ بیوی کے حقوق ہیں تو بیوی کے فرائض بھی ہیں۔ اللہ کریم نے ایک کا حق دوسرے کا فرض بنا دیا ہے۔ ہر شخص اپنے حقوق میں سے کچھ معاف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن جو کچھ اس کے ذمہ فرض ہے وہ تو اسے لازماً کرنا ہے، چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ اسلام ہے۔

جو حقوق و فرائض انسان خود مقرر کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے جو نظام خود تشکیل دیتے ہیں وہ اسلام سے متصادم ہوتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہوتے۔ پھر احتجاج ہوتا ہے، جلوس نکلتے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے مجھے میرا حق نہیں مل رہا۔ اس سے پوچھو کہ آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں؟ اس کی اسے کوئی فکر نہیں۔ یہ نتیجہ ہے غیر اسلامی نظام زندگی کا۔ جو بندوں کا مقرر کردہ نظام ہو اس میں توازن کہاں! اس میں بعض کو مل جاتا ہے، بعض محروم رہ جاتے ہیں۔ پھر وہ ہڑتالیں کرتے ہیں۔ جو طاقتور طبقہ ہو وہ ان پر گولی چلا دیتا ہے، پکڑ دھکڑ کر جیلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ جو طاقتور طبقہ ہو وہ ان پر گولی چلا دیتا ہے، پکڑ دھکڑ کر جیلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ ہوتا رہتا ہے۔

جہاد کی ضرورت اس لیے ہے کہ باطل اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہائے حیات کو مٹا کر اللہ کی مخلوق کو اللہ کریم کا دیا ہوا نظام دیا جائے اور ان پر نافذ کیا جائے۔ کوئی اپنی مرضی سے جہاد نہیں کر سکتا۔ کوئی ایسا کرے گا تو وہ قتل ہوگا۔ جہاد اسلامی ریاست کے سربراہ کے ماتحت ادارہ کرتا ہے۔ چند آدمیوں کا ایک گروہ بندوقیں اٹھا لے تو یہ جہاد نہیں فساد ہوگا۔ اوّل تو اسلامی ریاست ہو۔ اس پر اسلامی نظام نافذ ہو۔ ہر بندے کے حقوق و فرائض وہ ہوں جو اللہ نے مقرر کیے ہیں اور جہاں وہ نافذ نہیں ہیں وہاں ان کو نافذ کرنے کے لیے جنگ کی جائے اگر وہ مان لیں تو صلح ہے نہ مانیں تو انہیں ماننے پر مجبور کیا جائے۔ اس لیے کہ جہاں اللہ کا دیا ہوا نظامِ عدل نہیں ہوگا وہاں لوگوں پر ظلم ہوتا رہے گا۔ ظلم کو روکنا ہی جہاد ہے۔ قرآن جہاد کی واضح شرائط بیان کرتا ہے کہ پہلے ریاست اسلامی ہو یعنی اس کے سارے امورِ سلطنت اللہ کے دیے ہوئے نظام کے مطابق ہوں۔ حقوق و فرائض وہ ہوں جو اللہ نے متعین کیے ہیں۔ پھر وہ ان ریاستوں سے جہاں اللہ کا نظام نہیں ہے اور لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے، اس ظلم کو روکنے کے لیے جنگ کرے تو وہ جہاد ہوگا۔ اس کی عنداللہ اتنی عظمت ہے کہ اس جہاد میں جو گھوڑے اور ذرائع استعمال ہوں گے وہ بھی اللہ کو عزیز ہیں۔ ارشادِ باری ہے کہ یہ سارے وسائلِ جہاد اس بات پر گواہ ہیں کہ انسان اپنے ربّ کا بہت ناشکر گزار ہے۔ اس پروردگار عالم کی ناشکری کرتا ہے جو اسے لحہ لحہ پال رہا ہے۔ بڑے طریقے اور سلیقے سے اس کی ساری ضروریات پوری کر رہا ہے۔ **شکر کا معنی ہے اطاعت اور عدمِ اطاعت کو ناشکری گردانا جاتا ہے۔**

نظامِ اسلام کے باہر جتنے نظام ہیں وہ نافذ کرنے والا خود بھی جانتا ہے کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ جب وہ جانتا ہے تو پھر کیوں کرتا ہے؟ فرمایا: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿٨﴾ ''اور یقیناً وہ مال سے سخت محبت کرنے والا ہے۔'' اسے دولت کا لالچ مار جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کن باریکی سے انسانی نفسیات کا تجزیہ فرماتا ہے، حالات سے آگاہ کرتا ہے،

جرائم کی نشاندہی کرتا ہے، ان کی وجوہات بتاتا ہے اور پھر ان مسائل کا حل بتاتا ہے کہ دولت استعمال کے لیے ہے محبت کرنے کے لیے نہیں۔ اللہ سے محبت کرو۔ اپنے آپ سے محبت کرو، خود کو آخرت کے عذابوں سے بچاؤ۔ اپنے آپ پر تو رحم کرو کہ اللہ کی نافرمانی تمہیں جہنم میں لے جائے گی۔

اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ﴿۹﴾ ''کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں سے (مردوں کو) اٹھایا جائے گا؟'' انسان جب دولت کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے تو اس میں بہت گہرائی تک دھنس جاتا ہے۔ یہ کیوں بھولا ہوا ہے کہ اسے موت آنی ہے۔ صرف مرنا نہیں، مرنے کے بعد پھر قبروں سے نکالا جائے گا۔ پھر زندگی دی جائے گی۔ یہ کتنی حسرتناک بات ہے کہ ساری عمر لوگوں کے حقوق چھین کر دولت جمع کرتا رہا اور پھر اسے چھوڑ کر جاتا ہے۔ کتنا حسرتناک انجام ہے۔ لیکن اس پر ہی خلاصی نہیں ہوگی۔ مرنے پر بات ختم نہیں ہوگی۔ مر کر فنا نہیں ہو جائے گا۔ اسے زندہ کیا جائے گا وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ﴿۱۰﴾ ''اور جو (بھید) دلوں میں ہیں وہ حاصل کر لیے جائیں گے۔'' اندر کی باتیں باہر آ جائیں گی۔ دنیا میں تو بندہ جو زبان سے کہتا ہے یا جو عمل کرتا ہے اس سے وہ ظاہر ہوتا ہے۔ جو سوچتا ہے یا دل میں رکھتا ہے وہ پوشیدہ ہوتا ہے لیکن جب قبروں سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو دلوں کی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ ہر بندے کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی۔ حقائق سامنے آ جائیں گے۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾ ''یقیناً ان کا پروردگار اس روز ان سے خوب واقف ہوگا'' اسی ایک بات کو انسان اگر پلّے باندھ لے کہ جو میں کر رہا ہوں یا جو سوچ رہا ہوں، وہ میرے ربّ کے علم میں ہے تو کتنی اچھی تبدیلی آ سکتی ہے۔ ہر انسان کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ اپنی غلطیاں کوتاہیاں چھپاتا ہے۔ جو اچھا کام کر گزرے تو اس کی شہرت چاہتا ہے۔ لوگ چونکہ ظاہر کو دیکھتے ہیں تو ہر کوئی ظاہر پر محنت کرتا ہے۔ لیکن جو پسِ پردہ ہے۔ جو خواہشات، آرزوئیں دل کے اندر ہیں، اللہ ان سے بھی واقف ہے۔

قیامت کو تو ہر شخص کو یہ سمجھ آ جائے گی کہ ہر چیز رب العالمین کے سامنے ہے اور پہلے بھی ہمیشہ اس کے سامنے تھی۔ قرآن دعوت دے رہا ہے کہ آج اس بات پر ایمان لے آؤ۔ آج صحیح سوچو، ارادے نیک کرو، اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسالت پناہی کا سوچو، دامانِ رسالت کو تھامو۔ محض دولتِ دنیا نہ کماؤ اللہ کے حکم کے مطابق کماؤ اور ساتھ آخرت بناؤ۔ جو رزق تمہارے حصّے میں لکھا ہے وہ تمہیں ملے گا۔ حلال اور جائز وسائل سے اپنا حصّہ پاؤ۔ آخرت یقینی ہے۔ اس کی تیاری کر لو! اس چھوٹی سی سورت میں اللہ کریم نے پوری حیاتِ انسانی کا تجزیہ فرما کر راہنمائی فرما دی ہے۔ اللہ کریم ہمیں سمجھنے، ماننے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

سورۃ القارعہ رکوع 1 آیات 1 تا 11

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ﴿١﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٣﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ
النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿٤﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿٥﴾
فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ
مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

کھڑکھڑانے والی ﴿۱﴾ کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟ ﴿۲﴾ اور تم کو کیا خبر کھڑکھڑانے
والی کیا ہے؟ ﴿۳﴾ جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈیاں ﴿۴﴾
اور پہاڑ دھنکی ہوئی پشم کی طرح ہو جائیں گے ﴿۵﴾ تو جس (کے اعمال) کا وزن
بھاری ہوگا ﴿۶﴾ تو وہ اپنی پسند کی عیش میں ہوگا ﴿۷﴾ اور جس (کے اعمال) کا
وزن کم نکلے گا ﴿۸﴾ تو اس کی جگہ ہاویہ ہے ﴿۹﴾ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ (ہاویہ) کیا
ہے؟ ﴿۱۰﴾ (وہ) دہکتی ہوئی آگ ہے ﴿۱۱﴾

تفسیر و معارف

سورۂ قارعہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ ان آخری سورتوں میں قیامِ قیامت کے مختلف احوال ارشاد ہوئے ہیں۔ فرمایا: اَلْقَارِعَةُ ﴿١﴾ ''کھڑکھڑانے والی۔ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ ''کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟'' یہاں قیامت کی منظر کشی کی جارہی ہے کہ وہ جو ہر چیز کو کھڑکھڑا دے گی۔ ارشاد ہے کہ اے مخاطب تو اندازہ نہیں کرسکتا۔ تو سوچتا بھی رہے تو بھی سمجھ نہیں سکتا کہ وہ کھڑکھڑانے والی چیز کیا ہوگی! چونکہ سننے، دیکھنے اور محسوس کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ایک شخص کوئی واقعہ سنتا ہے۔ اس کی کیفیت، اس کے حالات پر

غور کرتا ہے۔ اس کے احساسات اور ہوتے ہیں۔ جو آنکھوں سے دیکھتا ہے اس کا حال اور ہوتا ہے۔ جس پر بیتتا ہے اس کے احساسات مضبوط (شدید) ہوتے ہیں۔ قیامت کے دن جس پر جو بیتے گا وہ اسی طرح محسوس کرے گا۔ فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ کتنی بڑی کھڑکھڑاہٹ ہوگی وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳ اور تم کو کیا خبر کھڑکھڑانے والی کیا ہے؟ وہ ہر چیز کو ہلا جلا کر رکھ دینے والی ہے جس کے باعث ہر شئے آپس میں ٹکرائے گی، گرے گی، ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور ہر شئے تباہ ہوجائے گی۔

ماہرین فلکیات اور تحقیقی ادارے برسوں تحقیق کر کے جس نتیجے پر پہنچتے ہیں بالآخر اسی بات کی تائید ہوتی ہے جو قرآنِ حکیم بلاتکلف ارشاد فرما دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ بات ساڑھے پندرہ سو سال پہلے بتادی تھی کہ زمین کی طرح دیگر سیارے بھی فضا میں موجود ہیں۔ سورج، چاند، ستارے سیارے۔ جو ہمیں نظر آتے ہیں وہ کم ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے وہ ان سے کھربوں گنا زیادہ ہیں۔ اور یہ سارے اسی جوِ سماوی میں آسمان کے اندر خلا میں تیر رہے ہیں۔ یہ سارے متحرک ہیں، گردش کر رہے ہیں۔ ساکن نہیں۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقررہ راستے پر رواں دواں ہے اور اپنی حد کے اندر ہی رہتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ سب آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ جب یہ ٹکرائیں گے تو کچھ باقی نہ رہے گا۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ یہ قیامت ہوگی۔ اللہ کریم قیامت قائم کریں گے۔ یہ اللہ کے نظام کا حصہ ہے۔ جب تک اللہ چاہیں گے ہر ستارہ، سیارہ اپنی حد کے اندر چلتا رہے گا جب اس کا حکم ہوگا تو یہ ٹکرا جائیں گے۔ کتنی بڑی آواز پیدا ہوگی، کتنے دھماکے، کھربوں کی تعداد میں سیارے ستارے جوں جوں ٹکراتے جائیں گے توں توں دھماکے ہوتے جائیں گے۔ اس کی منظر کشی یہاں کی جارہی ہے کہ مخاطب تجھے کیا خبر وہ کیا ہے!

يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴ ''جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈیاں۔'' اس سے پہلے نفخہ اولیٰ کی بات ہوئی۔ اب نفخہ ثانیہ کی بات ہو رہی ہے۔ آدم علیہ السلام کے دور سے لے کر قیامت تک کے تمام انسان بیک وقت زمین سے نکلیں گے۔ بکھری ہوئی ٹڈیوں کے لشکروں کی طرح میدانِ حشر میں پہنچیں گے۔

وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ ''اور پہاڑ دھنکی ہوئی پشم کی طرح ہوجائیں گے۔'' فرمایا، اتنے بلند پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ روئی کو دھنکا جائے تو ذرا ذرا سے ریزوں میں بٹ جاتی ہے۔ لیکن پشم

تو بالوں سے بنتی ہے۔ جب اسے دھنکا جائے تو ایک ایک بال الگ ہو کر پھیلتا ہے اور زمین پر گر کر جمع ہوتا رہتا ہے۔ پشم کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ پہاڑ پشم کی طرح ریزوں میں تبدیل ہو کر زمین پر پھیل جائیں گے۔ زمین میں کوئی جگہ اونچی نیچی نہیں رہے گی۔ ایک چٹیل میدان بن جائے گا۔ قرآنِ حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ (ابراہیم:48) جس دن زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔ اتنا بڑا زلزلہ ہوگا کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ پھر حیات بخشی جائے گی۔ جو چیز دنیا میں ایک دفعہ ظاہر ہوئی ہے۔ میدانِ حشر میں پھر ظاہر ہوگی۔ انسان، حیوان، چرند پرند سب حاضر ہوں گے۔ کوئی حساب دینے کے لیے، کوئی گواہی دینے کے لیے، کوئی بتانے کے لیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے کہ کسی سینگ والی بکری نے کسی بکری کو سینگ مارا ہوگا تو اس کا بھی حساب اس سے دلوایا جائے گا یعنی حساب برابر کیا جائے گا۔ اگر جانوروں کا محاسبہ کیا جائے گا تو انسانوں کا بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

انسان کو اللہ نے معاشرے میں بڑے وسیع اختیارات دیے ہیں۔ یہ تو روئے زمین کو بہت سے رنگوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ خود سدھرتا ہے تو روئے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیتا ہے۔ یہ بگڑتا ہے تو اسی روئے زمین کو ظلم و جور اور کفر سے بھر دیتا ہے۔ اس سارے اندھیرے کا ہر ایک کو اپنا اپنا حساب دینا ہوگا۔ جب یہ سب ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا: فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝٦ ''تو جس (کے اعمال) کا وزن بھاری ہوگا فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧ تو وہ اپنی پسند کی عیش میں ہوگا۔

اعمال میں وزن کس چیز سے ہوگا؟

اعمال تولے جائیں گے۔ اس میں وزن کس چیز کا ہوگا؟ بندے کی خلوصِ نیت کا۔ کھرے پن کا۔ ایک بندے نے نماز پڑھی، فرض ادا کر دیا۔ ٹھیک ہو گیا۔ اس عمل کا وزن ہوگا۔ دیکھا جائے گا اس میں خلوص کتنا تھا، اللہ کی رضا کی کتنی طلب تھی؟ وہ نماز اللہ کے لیے تھی یا اپنی شہرت کے لیے تھی۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے تھی یا اصلاحِ نفس کے لیے تھی۔ خوبصورت باتیں کرتا تھا تو لوگوں پر اپنی نیکی کی دھونس بٹھانا چاہتا تھا یا دردِ دل سے نیکی پھیلانا چاہتا تھا۔ دل کی یہ کیفیت جس کا نام خلوص ہے، اسے کوئی نہیں جانچ سکتا۔ وہی جانے جو دلوں کا حال جانتا ہے۔ نیک

اعمال میں جتنا خلوص ہوگا، اتنا ان میں وزن ہوگا۔ جتنا خلوص کم ہوگا اتنا وزن کم ہوگا۔ جیسے بادام یا اخروٹ کا مغز نہ ہو تو باہر کا چھلکا بے کار ہے اسی طرح جس عمل میں خلوص وللّٰہیت نہیں ہوگی اس عمل کا وزن ہلکا ہوگا۔

خطاؤں کو بھی تولا جائے گا۔ خطاؤں میں بھی ایک وزن ہوتا ہے۔ حادثاتی طور پر خطا ہوگئی۔ جانتا نہیں تھا کہ یہ جرم ہے اور کر بیٹھا۔ پتا چلا تو توبہ کی، ندامت کے آنسو بہے اور اسے چھوڑ دیا۔ معافی ہوگئی تو وہ خطا مِٹا دی گئی۔

جس کا نیکیوں کا وزن بھاری ہوگا وہ من پسند عیش میں ہوگا۔ اسے اس کی مرضی کے مطابق نعمتیں دی جائیں گی۔ جو چاہے گا پائے گا۔ اس بات کو کسی بزرگ نے بڑا آسان کر دیا یہ فرما کر، ''اس دنیا میں اس طرح جیو جس طرح اللہ چاہتا ہے۔ اُس دنیا میں وہ تمہیں اس طرح رکھے گا جیسے تم چاہتے ہو۔'' اس جملے نے اس آیت کا مفہوم بہت آسان کر دیا۔ اور جنت کی نعمتیں تو کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا کتنی پر لطف ہوں گی۔ اہل جنت کے حالات کے بارے مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ ہر جنّتی اللہ کے انعام پائے گا۔ ہر ایک کا اپنا مقام ہے۔ ایک عام جنّتی اپنی رہائش گاہ میں اوپر جانا چاہے گا تو کوئی روایتی سیڑھیاں نہ پائے گا بلکہ قدم اٹھائے گا تو سیڑھی آجائے گی اور ہر قدم کے لیے سیڑھی کا STEP بنتا چلا جائے گا۔ پچھلے سارے STEP ختم ہوتے جائیں گے۔ اترنا چاہے گا تو اسی طرح سیڑھی کے STEP آتے جائیں گے، پچھلے ختم ہوتے جائیں گے۔ اس سے اعلیٰ درجہ کا جنّتی قدم اٹھائے گا تو سیڑھی کا STEP سامنے آجائے گا اور وہی STEP آ کر کسی لفٹ کی طرح اسے اٹھا کر اوپر لے جائے گا۔ اس سے بھی اعلیٰ درجے کا جنّتی دیکھے گا کہ اسے اوپر کی منزل پر جانا ہے تو ارادہ کرتے ہی خود کو اس منزل پر موجود پائے گا۔ نیچے جانے کا ارادہ کرے گا تو نیچے موجود ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد برحق ہے کہ اس دنیا میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ آخرت کی، جنت کی نعمتیں کیا کیا ہوں گی۔ اب یہ تو بندے پر ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی اپنے اعمال کو جانچ لے کہ کتنے کام اللہ کی اطاعت سمجھ کر، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت سمجھ کر خلوص سے کیے اور کتنے رسماً کیے!

جو اللہ کو مانتے ہی نہیں۔ جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہی نہیں ان کی نیکی تو نیکی ہی نہیں ہے۔ دنیا میں بعض کافر فلاحی کام کر جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ان کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔ ضائع نہیں کی جاتیں۔ چونکہ وہ اللہ کو نہیں مانتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نہیں مانتے۔ آخرت کو نہیں مانتے تو نیکی کس لیے کرتے ہیں؟ ظاہر ہے آخرت پر یقین ہی نہیں تو آخرت

کے لیے نہیں کرتے۔ کسی دنیوی فائدے کے لیے کرتے ہوں گے۔ شہرت کے لیے، دولت کے لیے، کسی مصیبت کو ٹالنے کے لیے غرض کسی مفاد کے تحت کرتے ہوں گے۔ اللہ ان کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ جس نے شہرت کے لیے نیکی کی اسے شہرت مل گئی۔ جس نے اپنی پارسائی کا پرچار کرنے کے لیے نیکی کی، لوگوں نے اسے پارسا کہہ دیا۔ پھر آخرت میں کیا ملے گا۔ دنیا کے لیے تھی، دنیا میں بدلہ مل گیا، حساب ختم!

اسی کی جانچ ہوگی کہ کس نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اللہ کی فرمانبرداری کی۔ اور کس نے ایمان لانے سے ہی انکار کر دیا۔ جو ایمان والے ہوں گے ان کی جانچ یہی ہوگی کہ اعمال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کیے اور کتنے خلوص سے کیے؟ اگر اس میں وزن ہوگا تو وہ من پسند موج میں ہوں گے۔ جن کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا، وہ لوگ دنیا میں اجر لے چکے۔ آخرت میں ان کا کچھ باقی نہیں۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ اور جس کے (اعمال) کا وزن کم نکلے گا۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ تو اس کی جگہ ہاویہ ہے۔ اُم، ماں کو کہتے ہیں۔ ماں بندے کی بنیاد بھی ہوتی ہے، پرورش کی جگہ بھی ہوتی ہے، پناہ گاہ بھی ہوتی ہے۔ آدمی بوڑھا بھی ہو جائے اور اس کی ماں زندہ ہو تو ماں ہی اس کی پناہ گاہ ہوتی ہے۔ شجر سایہ دار ہوتی ہے۔ دعاؤں کا خزانہ ہوتی ہے۔

افسوس ہے ان لوگوں پر جن کا انجام ہاویہ ہوگا جن کے لیے کہا گیا کہ اس کی ماں 'ہاویہ' ہوگی یعنی اس کی جائے پناہ، اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ مَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ اور تمہیں کیا خبر (ہاویہ) کیا ہے؟ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾ دہکتی ہوئی آگ ہے۔

ہاویہ کی ہر شے دہکتی ہوئی آگ ہے۔ ہاویہ اس کا ٹھکانہ ہے۔ ٹھکانے میں لباس، کھانا پینا، بستر ہوتا ہے۔ ہاویہ میں ہر چیز دہکتی ہوئی تیز آگ سے بنی ہے۔ جدھر نظر کرو آگ، جس چیز کو ہاتھ لگاؤ آگ، کھانا بھی آگ، پینا بھی آگ، لباس بھی آگ، بستر بھی آگ۔ انتہائی بھڑکی ہوئی آگ ہے۔

سورۃ التکاثر رکوع 1 آیات 1 تا 8

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ٪﴿۸﴾

(لوگو!) تم کو (مال کی) بہتات نے غافل کر دیا ﴿۱﴾ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں ﴿۲﴾ خبردار! تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا ﴿۳﴾ پھر دیکھو! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا ﴿۴﴾ دیکھو! اگر تم جانتے علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے) ﴿۵﴾ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے ﴿۶﴾ پھر اُس کو (ایسا) دیکھو گے (کہ) عین الیقین سے ﴿۷﴾ پھر اُس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے پوچھا جائے گا ﴿۸﴾

تفسیر و معارف

سورۃ تکاثر مکّی سورتوں میں سے ہے۔ اس سورت میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسان کو مال سمیٹنے کی عادت اور مال جمع کرنے کے شوق نے غفلت میں ڈال دیا۔ انسان کو حقائق سے بے خبر کر دیا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ آنے والا وقت بہت قریب ہے تب انسان کو سمجھ آجائے گی۔

فرمایا: اَلۡہٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ (لوگو!) تم کو (مال کی) بہتات نے غافل کر دیا۔ حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ خبردار! تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ثُمَّ کَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ پھر دیکھو! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

خطاب کرتے ہوئے فرمایا، لوگو! تمہیں کثرتِ مال کے لالچ نے غافل کر دیا اور یہ غفلت تب تک رہتی ہے جب تک کہ تم قبروں میں داخل ہو جاتے ہو۔ کاش تم جان جاتے لیکن عنقریب تم جان جاؤ گے۔ ایسا وقت بہت قریب ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔

انسان غفلت میں کیوں چلا جاتا ہے؟ اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کیا ہے؟ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے، بدن اور روح۔ بدن ایک جسمِ ماڈی ہے۔ ماڈے سے بنا ہے۔ جسم کی نگاہ ماڈی، سوچ فکر ماڈی، خواہشات اور محسوسات ماڈی ہیں۔ روح بہت قیمتی، بہت نازک، نہایت صاف ستھری چیز ہے۔ یہ عالمِ امر سے ہے۔ امر صفتِ الٰہی ہے۔ عالمِ امر اوصافِ باری میں سے ہے۔ جیسے اللہ کی ذات کو بقا ہے اسی طرح اس کی صفات کو بھی بقا ہے۔ دنیا اور دنیا کا مال واسباب بھی ماڈی ہے۔ ماڈے سے تخلیق کی تفصیل تو اللہ کریم نے بیان کر دی کہ ماڈہ کن کن صورتوں سے تبدیل ہو کر انسانی وجود میں ڈھلتا ہے۔ انسان کی عقل ماڈی ہے۔ اس سے کام لے کر انسان علوم وفنون سیکھتا ہے۔ مختلف ایجادات کرتا ہے۔ اشیا کی افادیت معلوم کر لیتا ہے۔ ان کے نقصانات سے بچنا سیکھ لیتا ہے۔ بدنِ انسانی کی تخلیق اور اس کے مراحل تو بیان کر دیے لیکن روح کیسے تخلیق ہوئی، انسانی روح عالمِ امر سے کس طرح تخلیق ہوئی؟ اس کا جواب قرآنِ حکیم میں یوں آتا ہے: قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا (بنی اسرائیل:85) ''فرما دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے''۔ یعنی اللہ کریم نے اسے کیسے تخلیق فرمایا یہ وہی جانتا ہے۔ یہ بات انسانی علوم سے بالاتر ہے۔ انسانی دماغ، عقل اور علم تخلیق شدہ چیزیں ہیں۔ دماغ، دائرہ تخلیق کے اندر کام کرتا ہے کیونکہ خود مخلوق ہے جو چیز دماغ کے احاطۂ علمی میں آئے گی وہ بھی عالمِ خلق سے تعلق رکھتی ہوگی۔ وہ مخلوق ہوگی۔ روح بلاشبہ عالمِ امر سے تعلق رکھتی ہے لیکن ہے تو مخلوق اور اس عالمِ خلق کی مخلوق نہیں بلکہ عالمِ امر کی ہے۔ یہی فرمایا گیا کہ روح امرِ ربی سے ہے لیکن تمہارے علوم کی رسائی وہاں تک نہیں۔ انسانی دماغ سے اور اس ماڈی دنیا میں رہتے ہوئے تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ عالمِ امر سے اسے اللہ کریم نے کیسے پیدا فرمایا۔

بدن چونکہ ماڈی ہے تو انسان اس کی بیماری اور دوا کا ادراک کر لیتا ہے۔ اس کی دوا بھی ایجاد کر لیتا ہے۔ اس کی ضرورتوں سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور ان کی تکمیل کے ذرائع بھی ماڈی دنیا کی صورت اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ دولتِ دنیا تمام ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ بھوک لگے تو اس کے ذریعے سے دور کی جاسکتی ہے۔ بیماری کا علاج ہو سکتا ہے۔ گاڑی خریدی جاسکتی ہے۔ گویا مرکز دولتِ دنیا ہے۔ جتنی دولت ہوگی اتنا

آسودہ حال ہوگا تو انسان اسی میں لگ گیا۔ ہر بندہ سرپٹ دوڑ رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے! کیا مال جمع کرنا بُری بات ہے؟ نہیں۔ جب اللہ نے مال کی ضرورت پیدا کی تو مال حاصل کرنے سے روکا بھی نہیں۔ اسلام میں کوئی پابندی نہیں۔ کروڑ جمع کرو یا اربوں کوئی حرج نہیں۔ صرف ایک پابندی ہے۔ اللہ کے حکم اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں سے کماؤ۔ دوسروں سے نہ چھینو۔ جائز اور حلال کماؤ اور اللہ کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق خرچ کرو۔ حلال طریقے سے کمائے ہوئے مال پر سال کے بعد زکوۃ دو۔ یہ فرض ہے۔ اس کے علاوہ صدقاتِ نافلہ دو۔ اللہ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں خرچ کرو۔ اپنی ضروریات پر اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرو۔ کھاؤ پیو۔ اچھا گھر بناؤ، اچھی گاڑی رکھو، اچھے لباس پہنو بلکہ حکم دیا: وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ (الضحیٰ:11) ''اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہیے۔'' یعنی جتنا اللہ نے دیا ہے اس کا اظہار انسان کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، لباس وغیرہ سے ظاہر ہونا چاہیے۔

لیکن انسان جب مال کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے تو پھر اپنے حق پر بس نہیں کرتا۔ کہتا ہے مال ہی کی ضرورت ہے۔ حرام آئے، حلال آئے، جائز آئے، ناجائز آئے، اپنا آئے، پرایا آئے۔ بس لیتے جاؤ۔ چھینتے جاؤ۔ فرمایا، اے انسان! جب تم اس دوڑ میں لگے تو آخرت سے غافل ہو گئے۔ دنیا کی زندگی، دنیا کا مال، یہ مادّی وجود، صحت، نعمتیں، اولاد، گھر بار کنبہ قبیلہ، ملک، حکومت، یہ اس لیے دیا گیا تھا کہ ان سے بہرہ مند ہو کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی آخرت تعمیر کر لو۔ روح کی غذا، روح کی رہائش کا انتظام کر لو۔ جو ابدی ہے، دائمی ہے۔ جس کو فنا نہیں۔ تم اسے بھول ہی گئے اور بدن کی پرورش اور اس کی لذات میں کھو گئے۔

مومن ہو یا کافر، مادّی اعضاو جوارح، مادّی عقل و شعور اور مادّی نعمتوں کا ادراک ہر ایک کو ہو جاتا ہے۔ روح کی حیات کے لیے ایمان شرط ہے۔ روح زندہ ہی تب ہوتی ہے جب ایمان نصیب ہو۔ اسی لیے قرآن نے کفار کو مردہ کہا ہے کہ ان کی روحیں مری ہوئی ہیں۔

روح، بدن میں آتی ہے تو بدن کو حیات بخشتی ہے۔ اس میں مادّی شعور آ جاتا ہے۔ لیکن خود روح تب حیات پاتی ہے جب اسے نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں اس کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے تو شعور پر بلوغت آتی ہے۔ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اتباع نصیب ہوتا ہے۔ جتنا اتباع کرتا ہے اتنی دولتِ آخرت نصیب ہوتی ہے۔ اتنی تعمیرِ آخرت ہوتی ہے۔ جیسے معراج کی احادیث میں ملتا ہے کہ شبِ معراج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام دیا جس کا مفہوم ہے کہ امت کو میرا پیغام دیجیے کہ جنت کی مٹی بڑی زرخیز ہے

اور جنت کا پانی شیریں ہے وہ صاف میدان ہے اس میں نہریں بنانا، پودے اگانا، باغ لگانا، پھل اگانا محل بنانا یہ سب تمہاری محنت پر منحصر ہے۔ یہ سب تم نے خود بنانا ہے۔ جتنا نیکی کرو گے اتنی وہاں تعمیر ہوتی رہے گی۔ یہ بات آپؐ نے بطورِ مثال ارشاد فرمائی کہ جنت اللہ کا انعام ہے۔ وہ ہر ایک کو جانتا ہے کہ کس کے کتنے نیک اعمال ہوں گے اللہ نے ان کے مطابق نعمتیں تیار کر رکھی ہیں لیکن انسان کو چاہیے کہ وہ تعمیرِ آخرت کرے۔

دورِ حاضر، ایک مثال:

ایک ساتھی نے پرتگال سے رابطہ کیا کہ میرے لیے دعا کریں مجھ سے عبادات نہیں ہوتیں۔ میں قرآن کا حافظ تھا۔ حلقۂ ذکر میں آیا ذکر کرتا رہا۔ روزی کی تلاش میں پرتگال آ گیا۔ یہاں اچھا پیسہ کما رہا ہوں لیکن نمازیں چھوٹ گئیں، قرآن بھول گیا، ذکر کرنا چاہتا ہوں پر دل نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا ایسی کوئی دعا نہیں۔ نماز اللہ کا حکم ہے، فرض ہے۔ اللہ کے حکم کو نہ مانا جائے اور دعا کروائی جائے۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟ دعا کا طریقہ تو یہ ہے کہ تم اللہ کے حکم پر عمل کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو۔ اور دعا کرو کہ اللہ! اسے قبول فرما۔ اسے بار آور کر۔ عمل نہ کرنا اور دعا کا کہنا تو مذاق ہے۔ میں نے پوچھا، تم پرتگال کیوں گئے تھے؟ دنیا کی دولت اتنی قیمتی ہے، اس کی اہمیت تمہیں پاکستان سے پرتگال لے گئی اور تمہارے نزدیک آخرت کی اتنی قیمت بھی نہیں کہ تمہیں فرض نماز، قرآن، ذکر بھول گئے۔ خود بیٹھ کر سوچو! تمہارے نزدیک دنیا کی اہمیت کیا ہے اور آخرت کی اہمیت کیا ہے؟ کیا تم نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے پرتگال جانے کے لیے دعا کروں؟ تمہیں دنیا کے قیمتی ہونے کا یقین تھا۔ دنیا کی اہمیت تھی اس لیے تم نے تحقیق کی، محنت کی، طریقہ سیکھا اور وہاں چلے گئے۔ آخرت کے یقینی اور دائمی ہونے کا یقین نہیں اس لیے آخرت کو بھول گئے، تمہیں قرآن حفظ تھا۔ تم نے نہیں دہرایا۔ جو لوگ روزانہ ناظرہ قرآن پڑھتے ہیں وہ پندرہ منٹ میں پارہ مکمل کر لیتے ہیں۔ تم تو حافظ تھے تمہارے پاس چند منٹ بھی نہ تھے کہ ایک پارہ روزانہ دہرا لیتے۔ پانچ نمازوں کے لیے چوبیس گھنٹوں میں دس دس منٹ بھی نہ تھے۔ اتنا بھی وقت نہ تھا کہ بستر پر لیٹتے وقت ہی ذکر کر لیتے۔ اگر عبادات کے لیے چند لمحے بھی نہیں تو اس دولت کو لے کر کیا کرو گے۔ والدین سے دور، گھر سے دور۔ کسی کی خوشی میں شامل نہ کسی غمی میں شریک۔ تم ساری زندگی کما کر بھیجتے رہو گے، پچھلے اڑاتے رہیں گے۔ بوڑھے ہو کر آؤ گے۔ کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہو گے۔ پچھلے سب کھا پی چکے ہوں گے۔ تڑپتے مر جاؤ گے۔ کیا فائدہ ہو گا؟ جو تمہارے ذمہ ہے وہ کرو اور ابھی سے کرو پھر دعا بھی کرو کہ اللہ کریم! میرے ذمہ جو اسباب تھے میں نے اختیار کیے اب آپ قبول فرمائیں اور اس میں برکت ڈال دیں۔

انسان کے غفلت میں جانے کا سبب یہی ہے کہ مال و دولت کی سمجھ آتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی لذتوں سے آشنائی ہوتی ہے تو بندہ انہی میں کھو جاتا ہے۔ آخرت کی سمجھ تب آئے جب نورِ ایمان ہو۔ جب بچے کو حیات عطا ہوتی ہے تو کیا اسے دولت کی، عہدوں کی اہمیت سمجھ آ جاتی ہے؟ جوں جوں بڑھتا ہے، بالغ ہوتا ہے، دنیا کو برتتا ہے ویسے ویسے سمجھ آتی جاتی ہے۔ آج ہم طالب علموں کو علم کی قدر اور طالب علمی کے زمانے اور وقت کی اہمیت بتاتے رہتے ہیں۔ سمجھاتے رہتے ہیں کہ یہ پڑھنے کا وقت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کیا مصیبت ہے! جب میدانِ عمل میں جائیں گے، پھر انہیں سمجھ آجائے گی کہ استاد ٹھیک کہتے تھے۔ تب پڑھا ہوتا تو آج کام آتا۔ جو پڑھ جائیں گے وہ کامیاب ہوں گے۔ تو دنیا کی سمجھ آتے آتے بھی وقت لگتا ہے۔ اور آخرت تو ویسے ہی مادّی نظروں سے اوجھل ہے۔ آخرت کا سارا مدار ہی ایمان پر ہے، یقین پر ہے۔ اعتماد علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ سارا کام یہی ہے کہ اللہ کے ایک بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کر کے ساری زندگی نچھاور کر دینا، یہی ایمان ہے اور کافروں کے انکار کی وجہ بھی اس حقیقت کو نہ ماننا تھا۔ کافروں کا مسئلہ یہی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جیسے وہ انسان ہیں ویسا ہی یہ بھی ایک انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ پھر اپنے جیسے بشر کی بات ماننے کے لیے کیسے ساری زندگی تج دیں؟

ایمان اسی کا نام ہے کہ اس ایک ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا یقین کیا جائے کہ پھر ساری زندگی اس پر نچھاور کر دی جائے۔ جب شعور پر بلوغت آتی ہے تو سمجھ آتی ہے کہ آخرت کتنی قیمتی ہے۔ فرمایا، دولت کی کثرت نے تمہیں اس نعمت سے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبروں میں جا کر دیکھو گے۔ قبر میں پہنچو گے تو آنکھ کھل جائے گی۔ جب دُنیوی زندگی ختم ہوتی ہے، دنیا سے آنکھ بند ہوتی ہے تب آخرت کے لیے آنکھ کھل جاتی ہے لیکن پھر اس کا کیا فائدہ؟ آج بتایا جا رہا ہے۔ اچھی طرح سن لو! بہت جلد تمہیں سمجھ آ جائے گی۔ انسانی زندگی کوئی لمبا عرصہ نہیں ہے۔ مستقبل کے سال لمبے لگتے ہیں۔ ماضی کے سال کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کسی سے کہو کہ مجھے ساٹھ سال کے لیے قرض دے دو۔ میں ساٹھ سال بعد تمہیں واپس کر دوں گا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ جائے گا کہ ساٹھ سال؟ لیکن جن کی عمریں ساٹھ ستر سال ہو چکی ہیں ان سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں، کل کی بات ہے، ہم لڑکے بالے تھے۔ پتا ہی نہیں چلا یہ ساٹھ سال کیسے گزر گئے! دنیا میں ہمیشہ آنے والا وقت ہی طویل لگتا ہے جو گزر چکا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر تم محسوس کرو گے کہ دولت کے پیچھے ابدی زندگی تباہ کر لی!

کیا ہی اچھا ہوتا!

کیا ہی اچھا ہوتا تم علمِ یقین حاصل کر لیتے! تمہارے پاس اتنے واضح دلائل، اتنے عظیم معجزات آئے۔ یہ اتنی کھری دلیلیں تھیں۔ کاش! تم میں اتنی عقل تو ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کُلّی اعتماد کر لیتے۔ فرمایا: كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ دیکھو! اگر تم جانتے علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے)۔

یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، دلائل سے کسی چیز کا ثابت ہونا، علم الیقین ہے۔ مثلاً ہم جہاں کھڑے ہوں وہاں سے دور دھواں اٹھتا نظر آئے تو یہ دلیل ہے کہ جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہے وہاں آگ ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ اگر ہم اس جگہ خود جائیں، اپنی آنکھوں سے آگ دیکھ لیں تو یہ ایک پختہ دلیل ہے کہ آگ جل رہی ہے۔ یہ عین الیقین ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم آگ میں گر جائیں، جھلس جائیں، جلنے لگیں تو یہ حق الیقین ہوگا۔ یقین ہونے کا حق ادا ہو گیا یعنی یقین کی آخری حد حاصل ہو گئی۔

انسان کو اللہ نے عقل دی، شعور دیا تو ایمان کا کم تر درجہ یہ ہے کہ دلیل سے تو بات مانیں۔ اللہ کے نبی اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جو بات ارشاد فرماتے ہیں وہ مدلل ہوتی ہے۔ اس پر عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل موجود ہوتے ہیں۔ عقلِ سلیم اسے تسلیم کرتی ہے اور پہلی مُنَزّل من اللہ کتابیں بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ پہلی اُمتوں کی تاریخ اس پر گواہی دیتی ہے۔ یہ کم تر درجے کا ایمان تھا کہ ان دلائل کی روشنی میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین کر لیتے۔ کم از کم علم الیقین تو حاصل کر لیتے۔ انسان میں کم از کم اتنا شعور تو ہونا چاہیے کہ دلائل سے نتیجہ اخذ کر سکے۔ محض رواج کے پیچھے بھاگنا کوئی بات ہے!

فرمایا، کاش! تمہیں علم یقین ہی حاصل ہو جاتا۔ علمِ یقین تک تو پہنچ جاتے۔ دھوئیں سے اندازہ کر لیتے کہ وہاں آگ ہے۔ پھر جو تمہیں بتاتا کہ اس سے دور رہنا ہی اچھا ہے۔ دھواں بھی نقصان دہ ہے۔ آگے جاؤ گے تو آگ میں جا گرو گے، جل جاؤ گے۔ دھواں بھی پہنچا تو صحت خراب ہوگی۔ تم بتانے والے کی باتوں پر عمل کرتے لیکن تم نے کہا دھواں تو ہے لیکن میں نہیں مانتا یہ آگ ہے۔ میرے باپ دادا نے کہا وہاں آگ نہیں۔ یہ ہمارے بڑوں کا کہنا ہے، ہمارے بزرگوں کا رواج ہے! یہ اور کچھ نہیں ضد ہے کہ دلیل سامنے ہے اور اسے جھٹلائے جا رہے ہیں۔

اللہ کریم کا یہ کتنا احسان ہے کہ انبیاؑ کو مسلط نہیں کرتے۔ اللہ کریم قادرِ مطلق ہیں۔ کہہ دیتے کہ یہ میرا نبی علیہ السلام ہے جو یہ فرمائے اسے مانو۔ جو نہیں مانے گا دوزخ میں جائے گا۔ کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ تو اس کا حق ہے۔ اسے

کون روک سکتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دلائل کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ شریعت کے ہر حکم پر دلیل موجود ہے۔ ہر عقیدے، نظریے اور ہر دعوت پر دلیل موجود ہے، دلائلِ عقلی بھی موجود ہیں یعنی وہ جنہیں صحیح الدّماغ بندے کی عقل قبول کر لے کہ بات عقل کے مطابق ہے۔ دلائلِ نقلی بھی موجود ہے یعنی وہ دلائل جو آدم علیہ السلام سے لے کر نزولِ قرآن تک سب صحیفوں اور کتابوں میں نقل ہو کر آتے گئے۔ جو عقائد حضرت آدم علیہ السلام نے بیان فرمائے وہی عقائد حضرت شیث علیہ السلام نے بیان فرمائے۔ وہی حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک آئے۔ آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکمیل نبوت فرمائی اور وہی عقائد بتائے جو روزِ اوّل میں ارشاد ہوئے۔ اللہ واحد و لاشریک ہے۔ رسالت، آخرت، حساب کتاب، عذاب وثواب۔ یہ سارے حقائق وہی ہیں جن پر روزِ اوّل سے دلائل نقلی موجود ہیں اور جن پر دلائلِ عقلی کا جہان پھیلا دیا گیا ہے۔ ایک ایک ذرہ اس کی عظمت اور ربوبیت پر گواہ ہے۔ ہرا گنے والا تنکا، ہر کھلنے والا پھول، ہر نکلنے والی پتی، ہر برسنے والا قطرہ، اس کی طاقت، قدرت، عظمت اور ربوبیت پر گواہ ہے۔ کاش! تم ان عقلی اور نقلی دلائل سے علمِ یقین تک پہنچ جائے!

دنیا کے بارے یہ یقین ہمیں حاصل ہے۔ از خود حاصل ہے۔ اس لیے ہماری پوری توجہ اس کی طرف ہے۔ دنیا مادّی ہے۔ انسانی سمع وبصارت مادّی ہے تو مادّی نعمتوں کو سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ اس میں تو ہمیں حق الیقین حاصل ہے لہٰذا ہر کوئی دنیا کے پیچھے دوڑ رہا ہے کہ دولتِ دنیا حاصل کر لے۔ عہدہ واقتدار لے لے۔ دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کیا کسی کو تبلیغ کرنا پڑتی ہے کہ ان چیزوں کو حاصل کرلو۔ ہر کسی کو از خود یقین حاصل ہے اس لیے لگے ہوئے ہیں۔

بدن، روح کی سواری ہے۔ روح کے لیے دنیا میں کام لینے کا آلہ ہے۔ اگر بدن کو اتنی استعداد نصیب ہے کہ اپنے فائدے کا یقین رکھتا ہے۔ اس پر محنت مجاہدہ کرتا ہے تو روح کو کتنے اوصاف نصیب ہوں گے۔ اگر گھوڑا دوڑنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہے، کمالات رکھتا ہے تو انسان جو اس پر سواری کرتا ہے وہ تو اس سے کہیں اعلیٰ درجے کی مخلوق ہے۔ اس کی استعدادِ معرفت، اس کے علوم اور کمالات سواری سے بہت زیادہ اور بہت اعلیٰ ہیں۔ اسی طرح روح کے علوم واوصاف کی وسعت بدن سے کہیں زیادہ ہے۔ اور روح کے علوم کی وسعت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔ لیکن روح، علوم کیسے حاصل کرے۔ اس کے لیے حیات شرط ہے۔ بدن میں جب روح آتی ہے تو وجود کے سارے کمالات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ جب وجود حیات سے محروم ہو جاتا ہے تو مشتِ خاک رہ جاتی ہے۔ مٹی کی ڈھیری بن جاتا ہے۔ اسی طرح روح سے اگر حیات منفی کر دیں تو اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ کیونکہ روح کی حیات ایمان سے ہے۔ اسی لیے قرآن، کفار کو مردہ کہتا ہے۔

جب بندہ ایمان قبول کر لے تو روح میں حیات آ جاتی ہے لیکن کیا صرف حیات چاہیے؟ دنیا میں رہنے بسنے کے لیے حیات بھی چاہیے، صحت اور قوت بھی چاہیے۔ ایک شخص زندہ ہو لیکن بے ہوش ہو تو کیا فائدہ؟ اور جو زندہ ہو، بے ہوش بھی نہ ہو لیکن ایسا مریض ہو کہ اٹھ کر چل پھر نہ سکتا ہو، کوئی کام نہ کر سکے تو بھی کارآمد نہیں۔ اس کا مطلب ہے حیات، صحت، طاقت وقوت یہ سب ہوں تو کام کر سکے گا۔ جس طرح بدن کو غذا اور دوا کی ضرورت ہے اسی طرح روح کو غذا اور دوا کی ضرورت ہے۔ روح کی غذا ودوا عبادتِ الٰہی اور ذکر الٰہی ہے اسے غذا ملے۔ دوا سے علاج ہو وہ صحت مند ہو تو وہ فیصلے کرتا ہے جو انسان کی دنیا وآخرت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

یہ دنیا، اس کی نعمتیں اللہ کریم کی ہیں۔ اللہ کریم میزبان ہیں۔ انسان کچھ وقت کے لیے نعمتوں سے بھرے اس دسترخوان پر مہمان بنتا ہے۔ وہ فرماتا ہے، روئے زمین پر جو کچھ پیدا کیا ہے تمہاری خدمت کے لیے ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ میری ان نعمتوں کو میرے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق استعمال کرو۔ تم یہاں اکیلے مہمان نہیں ہو۔ یہاں اربوں مہمان ہیں۔ اللہ کریم میزبان اور انسان مہمان۔ مہمان کسی کے گھر میں جا کر اودھم نہیں مچا سکتا۔ میزبان کے قاعدے ضابطے کے مطابق رہتا ہے۔ جو چیز کھانے پینے کو پیش کی جائے لیتا ہے۔ وہاں اپنی پسند نہیں ٹھونس سکتا۔ میزبان کی پسند کے مطابق رہتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مہمان چھینا جھپٹی کرے۔ اس کی پلیٹ سے بھی لے دوسرے کی پلیٹ میں بھی ہاتھ ڈالے۔ کچھ کھانا گرائے دسترخوان خراب کرے۔ دوسرے لوگوں کے لیے ایذا کا باعث بنے تو اسے کیا کہیں گے؟

جن کو صرف دنیا کا حق الیقین حاصل ہے اور جن کو ایمان نصیب نہیں وہ تو مُردوں کی طرح بے حس ہیں۔ اور جنہیں ایمان نصیب ہے ان میں آج اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کی روحوں میں زندگی تو ہے، وہ بے ہوش ہیں یا سو رہی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ روحیں زندہ ہیں، بیدار بھی ہیں لیکن بیمار ہیں۔ اسی لیے جھوٹ بول لیتے ہیں، گناہ کر لیتے ہیں، برائی کرتے ہیں اور سود بھی کھا لیتے ہیں۔ یہ سارے روح کے عوارضات ہیں، بیماریاں ہیں۔ روح بیچاری بیمار، لاغر کبھی اٹھ گئی، کبھی لیٹ گئی اس نے کیا فیصلے کرنے ہیں؟

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کائنات اللہ کی ہو۔ دسترخوان اُس کا ہو اور فیصلے کافر کریں۔ وہ، جن کی روحیں مُردہ ہیں۔ جن میں روحانی اقدار ہی نہیں کہ لباس کیسا ہونا چاہیے، تہذیب کس بلا کا نام ہے، انصاف کسے کہتے ہیں، معیشت کیسی ہو، تعلیم وتعلم کیسا ہو۔ ان سب کے فیصلے کافر کریں اور خود کو مسلمان کہنے والے اس پر عمل پیرا ہوں۔ ان کے پیچھے

چل رہے ہوں! آج ہر طبقہ کے مسلمانوں کو اللہ کریم سے شکوہ ہے کہ کفار تو دنیا میں موج کر رہے ہیں اور مسلمان ہر جگہ پست اور رسوا ہیں۔ لیکن مسلمان یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کو ماننے کا دعویٰ رکھنے والے اللہ کے دستر خوان پر اللہ کے ضابطوں کو چھوڑ کر کافروں کی پیروی کر رہے ہیں۔ کافر تو جہنم کا راہی ہے۔ اس نے تو دنیا میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر دیا۔ اس سے کس بھلائی کی توقع رکھی جائے۔ جو اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا دعویدار ہے وہ جب اللہ کے ضابطے چھوڑ کر وہ ضابطے اپناتا ہے جو کافر نے دیے ہیں تو کتنا بڑا جرم کرتا ہے؟ اس پر اسے کون سا انعام ملنا چاہیے؟

اللہ کریم کا خاص کرم:

یہ تو پھر اللہ کریم کا خاص کرم ہے کہ اس نے دو رعایتیں عام کر رکھی ہیں۔ اس کے کرم کی گواہ ہیں۔ ایک، وہ فوراً گرفت نہیں کر رہا۔ مہلت دے رہا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ اگر اللہ کریم گناہوں پر فوری گرفت کرتے تو دنیا میں کوئی شے موجود نہ رہتی۔ دوسرا احسانِ عظیم یہ ہے کہ زندگی کے آخری لمحے تک توبہ کا در کھلا ہے۔ کوئی طویل سے طویل عمر پائے اور آخری حصے میں بھی نادم ہو جائے توبہ کر لے، اصلاح کر لے تو ناکام نہیں رہے گا۔ اللہ کریم سے بھلا وہ کتنا ہی دور چلا جائے جس لمحے اپنے گناہوں پر نادم ہو جائے۔ اللہ کی بارگاہ میں معافی مانگ لے تو اللہ کریم اسے واپس قبول کر لیتے ہیں۔ عمر بھر کے گناہوں کی معافی دے دیتے ہیں۔ کوئی خلوصِ دل سے توبہ تو کرے! اتنی بڑی رعایت بھی ہو سکتی ہے؟ اس کے باوجود ہم توبہ نہ کریں اور کفار کے پیچھے چلنے پر ہی مُصر رہیں تو اس کی وجہ؟ علمِ یقین کی کمزوری! اس کا علاج؟ فرمایا: كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۞

"دیکھو! اگر تم جانتے علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے)" کاش! تمہیں علم الیقین حاصل ہو جاتا۔

سب سے بڑی دلیل:

اس دنیا میں انسان کے پاس دلائل ہیں جن سے اسے عظمتِ الٰہی کا اقرار کرنا ہے۔ سب سے بڑی دلیل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا وجودِ مبارک ہے۔ پوری انسانیت میں ایسے گنے چنے لوگ ہیں جن سے گناہ، نافرمانی، غلطی کا کوئی تصور نہیں۔ جن کو معصوم ہی پیدا کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تک سب معصوم عن الخطا تھے۔ جن سے جھوٹ، گناہ یا غلطی کا کوئی تصور نہیں۔ اب اصدق الصادقین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتمی بات بتا رہے ہیں۔ یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک عقائد ایک ہی تھے۔

کلمہء اسلام کا پہلا جز وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی رہا۔ اللہ کے ہر نبیؑ نے یہی پیغام دیا۔ دوسرا حصّہ نبوت کا اعلان تھا جو ہر نبیؑ کی رسالت کی گواہی دیتا رہا۔ جیسے لا الہ الا اللہ آدم صفی اللہ۔ پہلا جز وایک ہی رہا دوسرا حصّہ نبیؑ کی رسالت کا اعلان کرتا رہا۔ جیسے نوح نجی اللہ۔ اسمٰعیل ذبیح اللہ۔ ابراہیم خلیل اللہ۔ عیسیٰ روح اللہ۔ اور آخر میں لا الہ الّا اللہ محمد رسول اللہ۔

عقائد کا نتیجہ احکام کی وہ بجا آوری جیسا اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر عہد میں تعلیم فرمایا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مبعوث ہونے کے بعد تا قیامت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی لائی ہوئی شریعت ہی نافذ ہوگی۔ ہر حکم کی تفصیل حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے لینی ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: وَمَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰـكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7) ''اور جو چیز تم کو پیغمبر دے دیں تو وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں سو (اس سے) باز رہو۔'' یعنی اسلام یہ ہے کہ جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اجازت دیں اسے تھام لو اور جہاں سے روک دیں وہاں رک جاؤ۔ یہاں علم الیقین کی ضرورت ہے۔ یہی فرمایا گیا کہ اے کاش! تمہیں علمِ یقین حاصل ہو جاتا۔ تم سب سے سچے کھرے انسان صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتبار کر لیتے۔ ایسے انسان پر جو عالمِ انسانیت میں بے مثل ہیں۔ اُن صلی اللہ علیہ وسلّم کے جیسا، اس پائے کا دوسرا انسان کوئی نہیں۔ جو نبیوںؑ کے بھی سردار، امام اور پیشوا ہیں۔ جو کائنات میں اللہ کی رحمت پانے کا سبب ہیں۔ اس سے بڑی دلیل کیا چاہتے ہو؟

اللہ قادر ہے، حاکم ہے۔ وہ فرما دیتا کہ ایسا کرو تو کسی میں جرأت ہے کہ پوچھے کیوں کریں؟ اللہ کریم ایسا فرما دیتے تو کسی چون وچرا کی گنجائش تھی؟ لیکن اللہ کریم نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا، میں جو حکم دے رہا ہوں اس پر دلائل ہیں۔ عقلی بھی اور نقلی بھی۔ دلائل نقلی وہ ہیں جو آدم علیہ السلام سے نقل ہو کر آتے رہے۔ ہر نبیؑ نے ان کی تصدیق کی تا آنکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچے۔ نقلی دلائل یعنی نقل ہوتے ہوئے جو پہنچے وہ یہ ہیں کہ اللہ واحد ولاشریک ہے۔ انسان اس کی بہترین مخلوق ہے۔ اسے دنیا میں ایک مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس نے اس دنیا سے جانا ہے۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔ قیامت قائم ہونی ہے۔ عذاب وثواب ہے۔ زندگی کا ایک انجام ہے۔ ایک نتیجہ ہے جس پر سوا لاکھ کے قریب اللہ کے سچے کھرے بندے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام گواہ ہیں۔ اے کاش! تمہیں اس صداقت پر یقین آجاتا۔

عقلی دلائل سے کائنات بھری پڑی ہے۔ اس کا ذرہ ذرہ اللہ کی عظمت پر گواہ ہے۔ پتّا پتّا اس کی ربوبیت کا گواہ ہے۔ قطرہ قطرہ اس کی خالقیت کا شاہکار ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا اس کی عظمت کا گواہ ہے۔ سورج کی ایک ایک کرن، چاند کی روشنی، ایک ایک ستارہ اس کی قدرتِ کاملہ کی گواہی دے رہا ہے۔ دلائلِ عقلی بھی موجود ہیں،

دلائلِ نقلی بھی موجود ہیں۔ کاش تمہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار و اعتماد ہوتا۔ کاش! تمہیں علمِ یقین نصیب ہو جاتا۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴿٦﴾ ''تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔'' ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٧﴾ ''پھر اس کو (ایسا) دیکھو گے (کہ) عین الیقین سے۔'' یعنی اگر یقینی طور پر پتا ہو کہ آگے آگ کا گڑھا ہے، جلتی آگ ہے تو کوئی اس میں قدم رکھتا ہے؟ پتا ہو پانی میں زہر ملا ہے تو کوئی پیتا ہے؟ کوئی ڈاکٹر ہی کہہ دے کہ یہ غذا تمہیں موذی مرض میں مبتلا کر دے گی تو کوئی کھاتا ہے؟ ڈاکٹر تو انسان ہے اسے غلطی بھی لگ سکتی ہے لیکن ہم اس کی بات پر اعتبار کرتے ہیں۔ پرہیز کرتے ہیں اس کی تجویز کردہ دوا استعمال کرتے ہیں اور اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما دے، جنہیں غلطی نہیں لگتی، جو اللہ کے علم سے فرماتے ہیں اور سچ فرماتے ہیں کہ اللہ کی نافرمانی کرو گے تو مارے جاؤ گے اور ہم کہتے ہیں، دیکھا جائے گا! اور نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں۔ کتنا تضاد ہے؟ ہماری سمجھ اور شعور میں کتنا فتور ہے۔ ہمارا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کتنا کمزور ایمان ہے۔ اتنا اعتبار بھی نہیں جتنا ایک حکیم یا ڈاکٹر پر ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پرہیز کرنے کا بتایا ہے، ہم کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ یقینی علم حاصل نہیں۔ کہتے ہیں نبیؐ مانتا ہوں۔ اس بات پر یقین نہیں کہ ہم اُمتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نبیؐ ہیں۔

ڈاکٹر کہتا ہے آپ کے پیٹ میں رسولی ہے۔ آپریشن کر کے نکالنا ہوگا۔ ہم اس پر اعتبار کرتے ہیں۔ ٹیسٹ۔ فیسیں سب کے لیے رقم فراہم کرتے ہیں خواہ ادھار لینا پڑے یا زمین بیچنی پڑے خرچ کرتے ہیں۔ اپنا وجود ہے۔ اسے آپریشن کی اجازت دیتے ہیں۔ تکلیف برداشت کرتے ہیں تاکہ تندرست ہو جائیں۔

جب اللہ کریم سود سے منع فرماتے ہیں۔ حکم دیتے ہیں: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (البقرہ:279) ''پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' تو مسلمان کہلانے والے سود کھاتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں، خیر ہے مجبوری ہے، ضرورت ہے۔ اللہ کو پتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے اس لیے کھا رہا ہوں۔ آخر مجبوری اور ضرورت کے وقت ہی تو ایمان پر قائم رہ کر حلال میں گزارا کرنا ہوتا ہے۔ ضرورت ہی سے تو سب سود لیتے ہیں۔ جب اللہ نے سود سے روک دیا ہے۔ حکم دیا ہے کہ حلال ذرائع سے کماؤ، حرام سے بچو تو پھر کوئی شخص کیسے کُتا مار کے کھانا کھائے اور کہے کہ مجھے بھوک لگی تھی۔ میری ضرورت تھی! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

لوگو! تمہارا دین دامن علمِ یقین سے خالی رہا۔ کاش! تمہاری روح میں قوت ہوتی کہ تمہیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر یقین آ جاتا۔ جن باتوں سے تمہیں روکا جاتا ہے ان سے رک جاتے۔ جن باتوں کا حکم دیا جاتا ہے وہ کر لیتے۔ کیونکہ آخر ایک دن دوزخ تمہارے سامنے آ جائے گی۔

قیامت آئے گی۔ میدانِ حشر ایک چٹیل میدان ہوگا۔ نہ پہاڑ نہ وادی۔ کوئی اونچ نیچ نہیں سپاٹ میدان ہوگا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آخری افراد جن پر قیامت قائم ہوگی سب انسان ایک جگہ جمع ہوں گے۔ پھر اپنے اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ اپنے اپنے اعمال کے مطابق گروہ بن جائیں گے۔ جو جس طرح کے لوگوں کو پسند کرتا ہوگا اس طرح کے لوگوں میں اس کا حشر ہوگا۔ دوزخ کو سامنے لایا جائے گا۔ اچھے بُرے سب لوگوں کے سامنے ہوگی۔ جنت کو بھی سجا سنوار کر سامنے رکھا جائے گا۔ ہر کوئی اپنی نظروں سے دیکھے گا کہ یہ جنت ہے اور یہ جہنم ہے۔ تب عین الیقین نصیب ہو جائے گا۔ پھر اعمال کرنے کا وقت نہیں ہوگا۔ اللہ کریم اس وقت کا نقشہ کھینچ کر بتا رہے ہیں کہ یہی تو امتحان ہے کہ اپنی آنکھ سے دیکھ کر یقین کرو گے یا میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان کر یقین کرو گے۔ علم الیقین پر نجات ہے۔ آج میرے نبیؐ کی بات پر اعتبار کر لو اور نجات پا جاؤ۔ ورنہ جب دوزخ سامنے ہوگی تو عین الیقین ہو جائے گا لیکن تب اس یقین کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جب موت آتی ہے تو ہر مرنے والے کو کشف ہو جاتا ہے۔ مومن تو مومن کافر کو بھی فرشتے نظر آتے ہیں، ان کی باتیں سنائی دیتی ہیں لیکن اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو سنائی نہیں دیتیں۔ پاس بیٹھے ہوئے کہتے ہیں اس کی نظر ٹک گئی ہے۔ وہ یکسو ہو چکا ہوتا ہے۔ فرشتوں سے باتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس حالت کا ذکر آیا ہے۔ فرعون غرقِ دریا ہونے لگا۔ موت کے فرشتے روح قبض کرنے آ گئے تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں تب اللہ کریم نے فرمایا، جب میرے دو نبیؑ تمہارے پاس گئے، دعوت حق دی تب تم کفر پر جمے رہے۔ اب برزخ کھل گیا تو مانتے ہو۔ جو دیکھ لے وہ کیسے نہیں مانے گا؟ ماننا وہی قبول ہے جو میرے نبیؐ کی بات پر اعتبار کر کے مان لے۔ یہی فرمایا جا رہا ہے کہ میدانِ حشر میں تم دوزخ کو ضرور دیکھو گے! جب تم خود دیکھو گے تو پھر چاہو گے کہ اس سے بچ جاؤں اور جنت چلا جاؤں لیکن دوزخ سے بچنے اور جنت جانے کے لیے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دامن تھامنا ضروری تھا۔ تب تم نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار ہی نہ کیا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی آنکھوں پر اعتبار کرتے ہو اور اب مانتے ہو۔ اب کیا ماننا؟

ماننا، عمل کا تقاضا کرتا ہے:

ماننے کا مطلب کیا ہے؟ ماننے کا مطلب ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ یہ کہنا کہ میں مانتا ہوں اور عمل نہ کیا جائے تو یہ ایک گستاخی ہے۔ جرم ہے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ فرماتا ہے جو زبانی اقرار کر کے اسے بھی مسلمان سمجھو۔ اسے اسلامی حقوق دو۔ وہ عمل نہیں کرتا تو گناہگار ہے، کافر نہیں۔ لیکن یہ قانون اس دنیا کے لیے ہے۔ آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ یہ ربّ جانے اور اس کا بندہ جانے۔ ماننا۔ بہر حال عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس گناہ پر ایک اور فتویٰ لگا دیا جاتا لیکن وہ کریم ربّ ہے۔ وہ اپنی شان کے مطابق کرتا ہے۔ مہلت بھی دیتا ہے اور توبہ

کے لیے عمر کی یا گناہوں کے کم زیادہ ہونے کی شرط بھی نہیں رکھتا۔ کہتا ہے کہ ضعفِ پیری میں بھی میرا بندہ نادم ہو جائے کہہ دے یا اللہ! میں غلط کرتا رہا۔ اب توبہ کرتا ہوں۔ اسی لمحے اس کا خلوص قبول کر کے معاف کر دوں گا۔ وہ توبہ کر لے، برائی چھوڑ دے، نیکی کا دامن تھام لے تو اس کی پچھلی ساری خطائیں معاف کر کے بخش دوں گا۔ نیکی کی توفیق عطا کر دوں گا۔

ان رعایتوں کو چھوڑ کر کوئی جہنم جانا چاہے تو یہ اس کا فیصلہ ہے۔ جہنم جانا مشکل ہے اور جنت جانا آسان ہے۔ ہر گناہ مشکل ہے۔ کفر کرنا، بتوں کو سجدے کرنا، انسان کی تذلیل ہے۔ ہر نیکی آسان ہے کہ انسان فطرتاً نیکی کو پسند کرتا ہے۔ جنت تو مفت میں ملتی ہے۔ ایک بندہ پوری عمر گناہوں میں بسر کر دے اور موت سے پہلے پہلے توبہ کر لے تو اللہ اسے معاف کر دیتے ہیں۔ یہ مشکل ہے یا جہنم جانا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات تو علم الیقین کی ہے۔ اللہ کے روشن واضح دلائل سے کائنات پُر ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یقین کی دولت بانٹ رہے ہیں۔ تمہیں ان دلائل سے یقین کیوں نصیب نہیں ہو رہا؟ جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے تو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس دن تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں ہر چیز کا عین الیقین نصیب ہو جائے گا۔ جنتی جنت میں جائیں گے اور انہیں جنت کا حق الیقین نصیب ہو جائے گا۔ دوزخی دوزخ میں گریں گے۔ جب داخلِ دوزخ ہوں گے تو انہیں بھی حق الیقین نصیب ہو جائے گا۔ پھر کرنے کا کام ختم ہو چکا ہوگا۔ پرسش کا وقت ہوگا۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝٨ ''پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے پوچھا جائے گا۔'' یعنی اس وقت تم سے پوچھا جائے گا۔ اللہ کی نعمتوں کی جوابدہی شروع ہوگی۔ اس دن تم سے پوچھا جائے گا۔ دنیا میں اللہ کی کتنی نعمتیں، عطا ہوئی تھیں تم نے ان کی کیا قیمت چکائی؟ نعمتوں کا حساب دینا ہوگا!

اللہ کی کسی ایک نعمت کو دیکھ لیا جائے۔ بندہ اس ایک کا بھی حساب نہیں دے سکتا۔ زندگی بھر سورج کی روشنی کتنی استعمال کی، چاند ستاروں سیاروں نے زمین کی روئیدگی میں اپنا حصہ ڈالا۔ غذائیں دوائیں مہیا کیں۔ ہوا بارش۔ جسم کی توانائیاں حواس خمسہ، دماغ، ہر ہر نعمت کتنا عرصہ استعمال کی۔ کیا قیمت چکائی؟

بڑی آسان سی قیمت تھی:

ان نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرتے تو اللہ کا شکر ادا ہو جاتا۔ انسان بے شمار نعمتیں استعمال کرتا ہے۔ اتنی نعمتیں استعمال کرتا ہے کہ کوئی فرد گن بھی نہیں سکتا ایک قوتِ سماعت کو ہی لے لیں، بصارت اور گویائی کو ہی دیکھ لیں۔ پیدا ہونے سے مرنے تک استعمال کرتا رہتا ہے۔ کیا اس کے دل میں احساس تشکر پیدا

ہوا۔ یہ احساس پیدا ہو جائے تو یہ بڑی آسان سی قیمت ہے جس کا مطالبہ ہے۔ لیکن یہ تو مطالبہ کرتا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتبار کیا جائے۔

جس ربّ نے یہ اور باقی تمام نعمتیں دیں ہیں اسے ہی حق حاصل ہے کہ وہ ان کے بارے سوال کرے۔ اور وہ سوال کرے گا۔ آنکھ کان، دل، دماغ، زبان سب کے بارے پوچھے گا کہ انہیں کس مصرف پر صرف کیا۔ ایک زبان کے استعمال کا ہی جائزہ لے لیں کہ کتنی باتیں حق کے مطابق کیں اور کتنی ناحق کیں۔ کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ میں اپنی اصلاح کیسے کروں؟ انہوں نے فرمایا، صبح اٹھ کر ایک کاپی پنسل پکڑ لو۔ رات سونے تک جو کام کرو اور جو بات کہو وہ لکھ لینا۔ اگلے دن مجھے دکھانا۔ وہ شخص سارا دن جھجکتا رہا۔ بات کرنے سے رکتا رہا کہ یہ بات کیسے لکھوں گا۔ کسی کو گالی دوں گا تو وہ گالی بھی لکھنی پڑے گی۔ پھر بزرگوں کو یہ کیسے دکھاؤں گا۔ اسی طرح اپنے کام کرتے وقت جھجکتا رہا کہ یہ کام کیسے لکھوں گا اس لیے نہیں کرتا۔ دوسرے دن کاپی لے کر حاضر ہوا اور اپنی کیفیت بھی بتائی کہ کیسے برائی سے رکتا رہا اور باتیں بھی کم کیں۔ بولنے لگتا تھا، غلط بات منہ سے نکلنے لگتی تو رک جاتا کہ آپ کو کیسے دکھاؤں گا۔

اُن بزرگ نے فرمایا۔ بس یہ بات یاد رکھو۔ دو لکھنے والے تمہارے ساتھ ہیں تمہارا ہر بول اور ہر کام لکھا جا رہا ہے۔ یہ اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور اللہ کریم خود ذاتی طور پر ہر ہر لحہ ہر آن سن بھی رہے ہیں اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ جتنا جتنا تمہارا یہ یقین بڑھتا جائے گا تمہاری اصلاح ازخود ہوتی جائے گی۔ تمہیں یہ یقین نصیب رہے گا کہ یہ نامہء اعمال جو فرشتے لکھ رہے ہیں، یہ سب تو اللہ کے روبرو ہے جو دیکھ رہا ہے اور اسی کا حساب ایک دن دینا ہوگا اس دن تم سے اللہ کی نعمتوں کے بارے پوچھا جائے گا ان کی قیمت کیا تھی؟ ایک احساس تشکر کہ یا اللہ! یہ سب کچھ آپ کا ہے۔ آپ نے مجھے ان گنت نعمتیں دیں میں آپ کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کے مجھ پر بے انتہا احسانات ہیں۔ اور یہ احساس تشکر انسان کو اللہ کی اطاعت پر خوش دلی سے مجبور کردے۔ فرمایا، کیا تم سے اتنی سی قیمت بھی نہ چکائی گئی؟

اللہ کریم شعور دیں، علم الیقین دیں کہ ہم اپنی رائے کو وہ اہمیت نہ دیں جو ارشاداتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اللہ کریم ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق دیں۔ نیکوں کے ساتھ زندہ رکھے اور نیکی پر خاتمہ نصیب کرے۔ آمین

سورۃ العصر رکوع 1 آیات 1 تا 3

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

زمانے کی قسم ﴿۱﴾ یقیناً انسان نقصان میں ہے ﴿۲﴾ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے ﴿۳﴾

تفسیر و معارف

سورۃ العصر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے:

فرمایا: وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ زمانے کی قسم۔ یقیناً انسان نقصان میں ہے۔

زمانے کی قسم ہے یعنی گزرتا ہوا وقت خود اس بات پر گواہ ہے کہ یقیناً انسان خسارے میں جا رہا ہے۔ اپنے آپ کو دھوکے دیتا رہتا ہے۔ اس کی سوچ اور فکر کی بات ہے جس انداز سے سوچنا شروع کر دے۔ ہر سال یوم پیدائش کا تہوار مناتا ہے حالانکہ حق تو یہ ہے کہ موت سے ایک سال قریب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی عمر کے بڑھنے کی خوشیاں منا رہا ہوتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ عمرِ عزیز کا ایک سال خرچ کر چکا ہے، اس کے پاس گنتی کے دن ہیں۔ جب یہ غفلت میں ڈوبتا ہے تو اس قدر ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ جو مر چکے ہیں اُن کے یومِ پیدائش بھی منا رہا ہوتا ہے۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ مرنے والا کس عالم میں ہوگا۔ وہاں اُسے کن چیزوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ وہ کس حال میں ہوگا، اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ ان سب چیزوں سے بے خبر یہ اپنی رسومات کی خوشی منائے جا رہا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو مختلف فنون سیکھتا ہے اور پھر اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا بھر کی نعمتیں جمع کر لے۔ دولت آ جائے، گاڑیاں لے لے،

اچھے مکان بن جائیں، اچھے لباس پہن لے لیکن وقت اس کے ہاتھ سے سرکتا رہتا ہے۔ جوانی رخصت ہو جاتی ہے اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپا آ جاتا ہے۔ نئی نسلیں آ جاتی ہیں وہ زیادہ لالچی ہوتی ہیں اور اس کا کمایا ہوا بھی چھین لیتی ہیں۔ بڑے شوق سے جو مکان بنائے تھے، اُن میں پھر اولاد رہنے نہیں دیتی۔ اُسے باہر نکال دیتی ہے۔ اکثر لوگ محنت کرتے کرتے کماتے کماتے، بڑی مشکل سے گھر بناتے ہیں۔ پھر مر جاتے ہیں اور بچے اس گھر کو بیچ کر بانٹ لیتے ہیں۔ گھر بنانے والے کے ہاتھ تو کچھ نہیں آتا۔

انسان اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ صرف دولت جمع کر لینا، اچھے کھانے، اچھے لباس پہن لینا ہی مقصد ہے۔ اسے بھول جاتا ہے کہ حقیقی زندگی آگے ہے جہاں اس کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور یہ زندگی ایک آزمائش ہے۔

اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ، سورج، چاند، ستارے، زمین ہر چیز اس بات پر گواہ ہے کہ اس نظام کا ایک خالق ہے، مالک ہے، ربّ ہے۔ جو اسے لحہ لحہ بنا رہا ہے، مٹا رہا ہے، چلا رہا ہے۔ یہ دنیا ویسی کی ویسی نظر ضرور آتی ہے لیکن ہوتی نہیں ہے۔

ارشادِ باری ہے، فرمایا: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن:29) وہ ہر روز کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔ ہر روز عظمتِ الٰہی کا ایک نئے انداز میں اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔ پتا پتا، بوٹی بوٹی روز بدلتی رہتی ہے۔ ہر جھونکا ہوا کا، ہر قطرہ پانی کا بدلتا رہتا ہے۔ چشمے، ندیاں، دریاؤں میں پانی ہر لمحے رواں دواں ہے۔ ہمیں دریا ویسے کا ویسا نظر آتا ہے لیکن چند لمحے پہلے جو پانی ہم نے دیکھا تھا وہ بہت دور جا چکا ہوتا ہے۔ جس کا نظام ہے وہ چلا رہا ہے اور اس میں اُس قادرِ مطلق نے بے حد حُسن اور لذتیں سمو دی ہیں۔ انسان کے لیے یہی ایک امتحان بن گیا کہ وہ ساری توجہ صرف مادّی لذات کے حصول پر لگا دیتا ہے یا آخرت نگاہ میں رکھتا ہے۔ جب اس کی ساری توجہ کا مرکز مادّی وجود، مادّی لذات بن جاتیں ہیں اور انہی کے حصول میں لگا رہتا ہے تو سراسر نقصان میں جا رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ لذتیں دیکھتے ہی دیکھتے اس سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ جوانی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ حافظہ ساتھ نہیں دیتا، اولاد اپنی کمائی میں سے ایک پیسہ دینے کو تیار نہیں ہوتی۔ فرمایا، بنیادی طور پر انسان نقصان میں ہے اس لیے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کو بھول گیا اور اس نے محض دولت جمع کی، کھایا پیا، لباس پہنا، اولاد پیدا کی، مر گیا۔ یہ تو چوپایوں کی زندگی ہے۔ کتا، بلی، چرند پرند بھی روزی تلاش کر لیتے ہیں، گھونسلا، ٹھکانہ بنا لیتے ہیں بچے پیدا کر لیتے ہیں انہیں پال لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ پھر انسان

میں اور اُن میں کیا فرق رہا! قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف:179) یہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

اگر کوئی انسان ہو کر محض حیوانی زندگی گزارتا ہے تو وہ چار پایوں سے بھی گیا گزرا ہے کہ اُنہیں تو اللہ نے حیوان ہی بنایا تھا۔ یہ تو انسان تھا اور اسے انسانی زندگی بسر کرنی چاہیے تھی۔ لوگوں نے بڑے بڑے قلعے تعمیر کیے، محلات بنائے، سلطنتیں بنائیں اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔ آج وہ محلات کھنڈر بن چکے اور قلعے عبرت کی داستان ہیں۔ ایسے سلاطین جن کی بنگالہ سے کابل اور ہمالہ سے دکن تک حکومت تھی، کوئی ان کے سامنے نگاہ اٹھانے کی جرات نہیں کرتا تھا لیکن آج اُن کے مقابر لوگوں کی سیر گاہیں بن گئی ہیں۔ کیا یہ عبرت کے لیے کافی نہیں ہے؟ کہاں گئی وہ شان و شوکت؟ وہ شاہی جاہ و جلال وہ سپاہ اور دربان کہاں گئے؟ کوئی چیز نظر آتی ہے؟ اُن کے تعمیر کردہ قلعے منہدم ہو گئے، محلات تباہ ہو گئے، سلطنتیں بکھر گئیں۔ انسان محض گھاٹے کی زندگی جی رہا ہے۔ وقت گزر رہا ہے اور یہ محض دنیا جمع کرنے میں لگا ہے جبکہ دیکھ رہا ہے کہ مجھ سے پہلے جنہوں نے جمع کی وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ پھر بھی نہیں سوچتا کہ میں دنیا کا کیا کروں گا! ہمارے سامنے کتنے لوگ جائیدادیں اور دولت کے ڈھیر چھوڑ کر خالی ہاتھ چلے گئے۔ ہم نے کون سا کچھ ساتھ لے جانا ہے۔ فرمایا، زمانہ یہ گردشِ دوراں اس بات پر گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے۔

خسارے سے محفوظ لوگ:

انسان تو سراسر نقصان میں جا رہا ہے سوائے اُن لوگوں کے فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے۔

فرمایا، وہ لوگ ہرگز نقصان میں نہیں ہیں جنہیں نورِ ایمان نصیب ہو گیا۔ جنہوں نے تخلیق کو دیکھ کر عظمتِ خالق کا اندازہ لگایا اور حقیقت کو پا لیا جنہوں نے دامانِ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تھاما، عقیدہ درست کیا۔ ایمان کیا ہے؟ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین پر بھیجنے سے پہلے تمام انسانوں کو یومِ الست جمع کیا تھا جنہیں پھر میدانِ حشر میں جمع ہونا ہے۔ یاد رہے کہ یومِ الست صرف ارواح کو جمع نہیں کیا گیا تھا بلکہ وجود سمیت مکمل انسان جمع کیے گئے تھے۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ اولادِ آدم کو میں نے اُس کی پشت سے نکال کر جمع کر دیا۔ پوچھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔۔۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ کیا میں تمہارا خالق، مالک، حاجت روا، ضرورتیں پوری کرنے والا پالنہار نہیں ہوں؟ فرمایا: قَالُوْا بَلٰى (الاعراف:172) کہنے لگے کیوں نہیں!

فرمایا پھر اس بات کو یاد رکھنا۔ میں تمہیں ایک ایسے جہان میں بھیج رہا ہوں جس میں میں نے بے شمار لذتیں

اور نعمتیں پیدا کر دی ہیں۔ جس میں حسنِ ظاہر بکھیر دیا ہے۔ وہاں جا کر اُن لذتوں میں کھو کر میری عظمت کو نہ بھول جانا۔ پھر یہ کوئی زیادہ کڑا امتحان بھی نہیں ہے کیونکہ وہ سب نعمتیں، لذتیں تمہارے لیے ہیں۔ صرف ایک بات کا احساس رکھنا کہ انہیں اُس طرح استعمال کرنا جس طرح میں اجازت دوں، اپنی مرضی مسلط نہ کرنا۔ پھر تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ اُس جہان کی بساط بالآخر لپیٹ دی جائے گی کہ وہ وقتی طور پر آزمائش کے لیے ہے۔ تمہیں وہاں ہمیشہ نہیں رہنا وہ ختم ہو جائے گا۔ پھر تمہیں لوٹ کر میری بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور یہاں کی نئی ابدی دنیا میں آبسنا ہے۔ اگر تم نے وہاں دنیا میں میری عظمت کا خیال رکھا تو یہاں کی قیام گاہ میں جو لذتیں ہیں جو آرام ہیں وہ تمہاری سوچ سے بالاتر ہیں۔ اگر وہاں جا کر تم مجھے بھول گئے، میری عظمت کو فراموش کر دیا تو یہاں کا قید خانہ بھی تمہارے اندازوں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

یہ وہ عہدِ الست ہے جو انسانوں کے دلوں میں پیوست ہے۔ اسی لیے ہر انسان کے اندر عظمتِ الٰہی کا، مذہب کا خانہ موجود ہے اور وہ خواہ کتنا گمراہ ہو جائے کوئی نہ کوئی مذہب ضرور اختیار کرتا ہے۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ انسان وحشی ہو گئے، جنگلوں میں رہنے لگے لباس سے بے نیاز ہو گئے، کھانے پینے کی تمیز نہ رہی رشتوں کی تمیز نہ رہی، جانوروں کی طرح زندگی بسر کی لیکن مذہب کے نام پر انہوں نے بھی کچھ رسومات ایجاد کر لیں۔ یہ وہ عہدِ الست کی طلب ہے جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ اب اُس سے وہ حق تلاش کرے یا خانہ پری کرے، کچھ کرتا ضرور ہے۔ اللہ کریم نے اس پر چھوڑ نہیں دیا بلکہ پہلا انسان جس نے زمین پر قدم رکھا، اسے نبوت سے سرفراز فرمایا نبیؑ بنا کر بھیجا۔ نبوت ایک کمال ہے جو نسلِ انسانی کو عطا کیا گیا کہ وہ براہ راست اللہ سے ہدایت پاتا ہے۔ نبیؑ وہ ہدایت دوسروں پر تقسیم فرماتا ہے اور مینارِ نور ہوتا ہے۔ چنانچہ انسانیت جوں جوں پھیلتی رہی ہر قوم، ہر بستی کے لیے انبیاؑ مبعوث ہوتے رہے۔ پھر آخر میں ساری انسانیت کے لیے، سارے زمانوں کے لیے امام الانبیاؑ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حفاظت فرمائی۔ چنانچہ پندرہ سو سال ہونے کو ہیں لیکن ایک ایک لفظ اللہ کے کلام کا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا محفوظ ہے۔ رات دن عظمتِ الٰہی اور رسالتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نعرے فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔ اب جس نے لبیک کہا اور دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تھاما، ایمان قبول کر لیا اس نے عظمتِ الٰہی کا اقرار کر لیا۔ ایمان کیا ہے؟ اس کا سادہ سا مطلب ہے اعتماد علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر کتنا اعتبار ہے کتنا یقین ہے۔ اس ایمان کا اظہار کیسے ہوتا ہے؟ فرمایا: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔۔۔ اور نیک عمل کرتے رہے۔

جنہیں نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے اُن کے کردار کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ جتنا ایمان اور جتنا یقین پختہ ہوتا ہے اتنا اس کا کردار اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھل جاتا ہے، اعمال سدھر جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی ہوا میں سانس

لیتے ہیں، اسی سورج کی گرمی میں، انہی شب و روز میں عمر بسر کرتے ہیں۔ اسی زمین کے سینے پر چلتے ہیں لیکن اللہ کی نعمتوں کو اللہ کے بتائے ہوئے سلیقے کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔

آج بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہ رواج ہو گیا ہے کہ جو بھوکا ننگا ہو اُسے ولی اللہ سمجھ لیا جاتا ہے یا جو بالکل پاگل ہو اُسے بہت ہی پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے اور جو لباس سے بھی عاری ہو جائے پھر وہ تو خدا بن جاتا ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اللہ کے ولی، اہل اللہ بھی اسی دنیا میں جیتے ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی ساری نعمتیں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس کارگاہِ حیات کو اللہ کی امانت سمجھتے ہیں۔ ہر نعمت کو اللہ کی اجازت سے، اس کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اس کی نعمتوں کو اپنا سمجھ کر اُن پر اپنی مرضی سے تصرف نہیں کرتے۔ ایمان کی یہی دلیل ہے کہ اعمال کو صالح کر دیتا ہے۔ فرمایا: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔۔۔ اور آپس میں حق بات کی تلقین کرتے رہے۔

فرمایا، اُن کی زندگی پھر احقاقِ حق کی دلیل بن گئی۔ وہ اپنے کردار سے حق پر قائم ہو گئے یعنی بہترین تبلیغ یہ ہے کہ ہم عملی زندگی میں اللہ کے حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کریں اور لوگ احکامِ الٰہی اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل ہوتا ہوا دیکھیں۔ یہ اثباتِ حق کا بہترین طریقہ ہے۔ فرمایا: وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿٣﴾ اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

صبر کا معنٰی یہ ہے جیسے گھوڑا بھاگ رہا ہو تو اُس کی لگام کھینچ کر اسے روک لیا جائے یعنی ایک چیز کو شدت سے حد کے اندر روک لیا جائے۔ صبر سے مراد ہے کہ انسان اپنے آپ کو، اپنی خواہشاتِ نفس کو حدودِ الٰہی کے اندر روک لے۔ فرمایا، اللہ کے بندے دوسروں کو بھی حدودِ الٰہی کے اندر رہنے کی تلقین کرتے ہیں یعنی وہ خود اللہ کی حدود نہیں توڑتے اور اتنی استقامت سے جمے رہتے ہیں کہ دوسروں کے لیے مثال بن جاتی ہے۔ اُن کا صبر لوگوں کے لیے ایک تبلیغ بن جاتی ہے کہ حدودِ الٰہی پر قائم رہنا چاہیے ان حدود کو توڑنا نہیں چاہیے۔ یہ سب سے احسن طریقہء تبلیغ ہے کہ بندے کا عقیدہ درست ہو، عمل سنت کے مطابق ہو، اپنے کردار سے حق پر قائم رہے اور اس شدت سے احکامِ الٰہی پر کاربند رہے کہ دوسروں کے لیے مثال بن جائے۔ اگر خود عمل نہ کرے اور صرف زبانی تلقین کرتا رہے تو وہ صرف کھوکھلے الفاظ ہوں گے۔ اُن میں جان نہیں ہوتی۔

فرمایا، یہ زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں جا رہا ہے سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے اللہ کے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر اعتماد کیا اور اللہ سے بندگی کا رشتہ قائم کیا، اپنے کردار کو سنبھالا اور دوسروں کے لیے احقاقِ حق کی زندہ مثال بن گئے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی عزت و احترام تھا، راحت تھی آخرت میں بھی ان کے لیے بہترین گھر

اور بہترین نعمتیں اور لذّتیں ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ عہدِ رسالت پناہی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں عہدِ صحابہؓ، عہدِ تابعینؒ اور تبع تابعین یعنی خیر القرون میں کوئی دینی جلسے یا تقریریں نہیں ہوتی تھیں۔ اُن بہترین زمانوں میں کوئی رسالے چھپتے تھے نہ ذرائع ابلاغ تھے لیکن دین ایک صحرا سے نکل کر روئے زمین پر پھیل گیا۔ آج تمام ذرائع ابلاغ سے دین کی اشاعت کی جاتی ہے۔ اخبارات اور رسالوں میں دینی باتیں شائع ہوتی ہیں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر دینی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ہر شہر، ہر قریے میں متعدد جامع مساجد ہیں جہاں جمعہ کا بیان ہوتا ہے۔ تبلیغی جماعتیں گھر گھر تبلیغ کرتی پھر رہی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ کافر تو کیا مسلمان ہوتے جو پہلے ہی کلمہ گو ہیں وہ بھی اسلام سے دور جا رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں عمل نہیں کرتے۔ ہم خود کافرانہ نظام کا حصّہ ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں تحریک تو چلاتی ہیں کہ اسلام نافذ ہو لیکن خود اسی نظام کا حصّہ بن کر مزے لوٹتی ہیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسمبلیوں میں بھی بیٹھی ہیں سینیٹ میں بھی، وزارتیں بھی لے رکھی ہیں لیکن اسلام نافذ نہ ہو سکا۔ اسی نظام کی تقویت کا سبب بننے والے کہتے ہیں کہ اسلام نافذ کرو تو کیسے نافذ ہو سکتا ہے؟ مطالبہ کرنے والے خود اس کافرانہ نظام کا حصّہ بن جائیں گے تو ان کی بات میں کیا اثر ہوگا؟ اگر یہ ساری دینی جماعتیں اور ان کے پیروکار عملاً اس نظام میں حصّہ نہ لیں اور اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیں۔ اگر یہ اپنے اخراجات شرعی حدود کے اندر رکھیں اور اپنے مطالبے پر قائم رہیں، عمل اسلام کے مطابق کریں اور لوگوں کو بھی تلقین کریں تو کتنا انقلاب آجائے! کوئی ہے جو پھر انہیں زبردستی کسی اور نظام میں لے جائے؟ افسوس کہ ہمارا طریقۂ تبلیغ یہ ہے کہ خود شریکِ جرم ہو کر شور کرتے ہیں کہ یہ جرم چھوڑ دو۔ صحابہ کرامؓ کی تبلیغ کا انداز یہ تھا کہ وہ کہتے نہیں تھے، کرتے تھے۔ وہ ایمان لاتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ وہاں نہ کوئی اسمبلی تھی نہ سینٹ تھی، کوئی بادشاہ تھا نہ وزارت تھی مگر دین نافذ ہوتا چلا گیا۔ مکہ مکرمہ میں کوئی جلسے نہیں ہوئے لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت اور تربیت یہی تھی کہ اپنے ایمان کی قوت اور کردار سے حق کو ثابت کرو اور اس کے خلاف جو ہوا سے باطل کہو تو دوسرے بھی تمہارے ساتھ اس کے دائرے میں آئیں۔ صحابہ کرامؓ نے یہی طریقہ تبلیغ اپنایا اور مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے کافرانہ نظام سے تعاون نہیں کیا۔ اپنا جینا مرنا، کھانا، پینا الگ رکھا، شریعت کے اندر رہے۔ اس پر کفارِ مکہ نے انہیں کتنی ایذا دی لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہے۔ حتّٰی کہ ہجرت کرنا پڑی لیکن صحابہ کرامؓ نے کافرانہ نظام قبول نہیں کیا۔ انہوںؓ نے گھر چھوڑ دیے، جائیدادیں چھوڑ دیں، عمر بھر کی کمائی چھوڑ کر نکل گئے، رشتہ داریاں برادریاں چھوڑ دیں لیکن اپنا نظام، اپنا کردار قائم رکھا۔ پھر ایک ریاست بن گئی جس کی بنیاد ہی احکامِ الٰہی پر تھی اور وہ پھیلنا شروع ہو گئی تو روئے زمین پر پھیل گئی۔ یہ بہترین تبلیغ تھی۔ آج بھی خسارے سے بچنے کا نسخہ یہی ہے۔

سورۃ الھمزۃ رکوع 1 آیات 1 تا 9

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ﴿١﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿٢﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿٥﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿٧﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾

ہر طعن کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے ﴿۱﴾ جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے ﴿۲﴾ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ رکھے گا ﴿۳﴾ ہر گز نہیں! وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا ﴿۴﴾ اور تم کیا سمجھتے کہ حطمہ کیا ہے؟ ﴿۵﴾ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے ﴿۶﴾ جو دلوں پر جا لپٹے گی ﴿۷﴾ وہ یقیناً اس میں بند کر دیے جائیں گے ﴿۸﴾ (آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں ﴿۹﴾

تفسیر و معارف

سورۂ ھمزہ بھی مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

دین پر طعن کرنے والوں کا کردار اور انجام:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ فرمایا: وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ﴿١﴾ ہر طعن کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے۔ فرمایا، بہت بڑی تباہی ہے ایسے چغل خور لوگوں کے لیے جو دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس مذاق میں طعن آمیزی ہوتی ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو طعن آمیز کلمات کسی زمانے میں نمرود، شداد، فرعون، ہامان اور قارون وغیرہ کے منہ سے نکلے تھے وہی کلمات تقریباً اکثر امتوں کے کفار حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں جو کفار تھے اُن کے منہ سے بھی نکلے۔ یہ بھی کم عجیب بات نہیں کہ آج بھی جو دین پر طعن کرتا ہے وہی کلمات اس کے منہ سے نکلتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں نے پہلے کافروں کے دلوں سے مشابہت پیدا کر لی ہے۔ اس لیے اُنھی جیسی باتیں ان کے دلوں سے نکلتی ہیں۔ جب کوئی بدی کی راہ اپناتا ہے تو اُسے شیطان سے ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے پھر جوں جوں تعلق بڑھتا ہے تو نوبت کفر تک پہنچتی ہے۔ پھر کفر کے مدارج ہیں تو جس طرح کی نسبتِ کفریہ پاتا ہے اس طرح کا جو کافر پہلے گزرا ہے، اُس جیسی باتیں دہراتا ہے۔ اُن گستاخیوں پر ایک خاص غضبِ الٰہی بھی بھڑکتا ہے تو شیطان کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کفار کے منہ سے وہ الفاظ کہلوائے جو بڑے بڑے کافروں نے کہے تھے تاکہ اس درجے کے غضبِ الٰہی کا شکار ہوں۔

اسی طرح ہر مبارک کلمہ پر ایک خاص برکت اور رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کردہ الفاظ، وہ وظائف جو سنّت ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے، اُن کا اپنا اثر ہے۔ اسی طرح اللہ کے مقرب بندے اہل اللہ، جو تسبیحات بتاتے ہیں اُن کے بتانے کا بھی ایک اثر ہے۔

یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور اس عہد کے کفار کا حال بتا رہی ہے کہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کے جواب میں اسلام قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی بجائے طعنہ زنی اختیار کی۔ وہ لوگ دین کا مذاق اڑاتے اور عموماً اُن کے الفاظ اسلامی نظام کے خلاف کچھ اس نوعیت کے ہوتے کہ دیکھو جی، یہ کیا نظام ہے؟ ایسے بھی ہو سکتا ہے؟ یہ تو جاہلانہ رسومات ہیں، یہ تو کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ اس طرح کے اعتراضات کرنا جن میں طعن بھی ہوتا ان لوگوں کا وتیرہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی یہ عادت بھی تھی کہ لگائی بجھائی کرتے، چغل خوری کیا کرتے تھے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جو لوگ دین پر طعن کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں اُن میں یہ عادت بھی ہے کہ یہ سارے چغل خور بھی ہوتے ہیں۔ یہ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کر کے لگائی بجھائی کرنے والے ہیں۔ ان آیات کا نزول تو مشرکین و کفارِ مکہ کے کردار و عادات بیان کرنے کے لیے ہوا لیکن یہ رویہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اسلام پر طعن کرتے ہیں، وہ صرف اعتراض نہیں کرتے بلکہ اُس میں تحقیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ ایسی باتیں اکثر کہی جاتی ہیں کہ جی بہت دیکھے ہیں نمازی! نمازیں پڑھتے ہیں اور ایسا کرتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کسی بندے نے کوئی غلطی کی ہے تو اس میں نماز پر طعن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے جو برائی کی وہ تو قصور ہے لیکن نماز تو ایک اچھائی ہے، نماز میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ اگر ایک نمازی سے قصور ہو گیا تو وہ بھی انسان ہے اس سے غلطی ہو گئی۔ اُسے نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن بتقضائے بشریت اس سے ہو گئی۔ ایک بے نماز غلطی کرے تو کوئی طعنہ نہیں لیکن نمازی سے ہو گیا تو کیوں طعنہ دیا جاتا ہے؟ اسی طرح اسلامی نظام کا آج مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ یہ فضول باتیں ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے یا یہاں تک کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام کی سزائیں وحشیانہ ہیں۔ گویا ان کی نگاہ میں اللہ نے جو نظام دیا ہے وہ ناقابلِ عمل ہے، جس دین کی تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے وہ ناقابلِ عمل ہے۔ ایسے کلمات کہنا

کس قدر گستاخی ہے اور پھر دین کے نظام کا مذاق بھی اڑایا جائے۔ یہ سب کس لیے ہوتا ہے؟ فرمایا: الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گن گن کر رکھتا ہے۔

یہ لوگ دنیا کی دولت کے دیوانے ہیں جبکہ اسلامی نظام دولت کے حصول اور استعمال میں توازن پیدا کرتا ہے۔ حدود و قیود مقرر کرتا ہے۔ اسلام ہر ایک کا حق مقرر کرتا ہے لہٰذا اپنا حق ہر کوئی لے سکتا ہے لیکن دوسرے کا نہیں لے سکتا۔ یہ لوگ سب کا چھینا چاہتے ہیں۔ پھر مال جمع کرتے ہیں اور اُسے گن گن کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ یہی گنتے رہتے ہیں کہ اب اتنا ہو گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ جتنا بھی ہو جائے سیر نہیں ہوتے۔ یہ اسلام کا، اسلامی قوانین کا مذاق اس لیے اڑاتے ہیں، اس پر طنز کرتے ہیں کیونکہ یہ محض دولت سمیٹنا چاہتے ہیں، لُوٹنا چاہتے ہیں، مال جمع کرنا چاہتے ہیں اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

وطنِ عزیز میں کچھ خاندان ایسے بھی ہیں جن کی دولت کا کوئی حساب ہی نہیں اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن کے پاس اتنی دولت ہے پھر روزانہ اس پر جو سود آتا ہے وہی شاید اربوں میں ہے، کاروبار سے جو آمدن ہے وہ الگ ہے۔ اس کے باوجود رشوتیں لینے پر بھی لگے ہوئے ہیں۔ بس لیے جا رہے ہیں، لیے جا رہے ہیں یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ جمع کرتے رہتے ہیں اور گن گن کر خوش ہوتے رہتے ہیں اور فرمایا: یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ رکھے گا۔

ان کا شاید یہ خیال ہے کہ یہ مال ہمیشہ ان کے پاس ہی رہے گا یا ان کی بقا کا سبب ہوگا۔ انہیں تو یہ گمان بھی نہیں ہے کہ یہ چھن جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ جو لوٹ لوٹ کر جمع کر رہے ہیں یہ ہمیشہ ان کے پاس رہے گا ہمیشہ کام آئے گا۔ یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ میں نے نظامِ اسلامی کی بات اس لیے کی ہے کہ یہ لوگ کلمہ پڑھ لیتے ہیں اس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ لوگ حج اور عمرے کر آتے ہیں لیکن کردار میں جو توازن چاہیے کہ انسان اپنا حق لے، دوسرے کا نہ چھینے۔ اس بات پر یہ نہیں مانتے اور جو بندہ بھی خلافِ اسلام چلتا ہے اس کی بنیاد یہی ہے۔ خواہ کوئی کھربوں چھین لیتا ہے، خواہ دس روپے چھینتا ہے لیکن سب کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کا حق چھینا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے لوگ صرف رُؤسا ہوں، ایک غریب دیہاڑی دار مزدور بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ کئی دفعہ دیکھا کہ مزدور دیہاڑی پر لگے ہوں گے، مزدوری تو پوری لیں گے لیکن اوقاتِ کار میں ڈنڈی ماریں گے۔ ظہر کے لیے بھی وقفہ لیں گے ادا کریں گے۔ پھر عصر کے لیے بھی وقت لگا کر آئیں گے۔ کھانے کے لیے وقت لگا لیں گے۔ اس بہانے سے وقت ضائع کریں گے۔ باقی دن کی نمازیں نہیں پڑھیں گے یعنی مقصد نماز پڑھنا نہیں تھا بلکہ کام چوری تھی۔ گویا ایک عام دیہاڑی دار بھی اسی کوشش میں ہے کہ میں پیسے پورے لوں اور کام تھوڑا کروں اور ایک ارب

پتی بھی یہی چاہتا ہے کہ پیسے سمیٹوں کسی نے کھربوں سمیٹ لیے اور کسی کو کچھ روپے مل سکے۔ یہ سارے لوگ اسلامی نظام کے خلاف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عقیدہ بھی مان لیتے ہیں عبادت بھی کر لیتے ہیں لیکن معیشت میں، تعلقات میں توازن نہیں چاہتے۔ ان میں پھر بعض بڑے ہیں وہ پھر عبادت بھی نہیں کرتے۔ پھر بعض اُن سے بھی بڑے ہیں جو عقیدہ بھی قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مال ہمیشہ اُن کے پاس ہی رہے گا۔ فرمایا: كَلَّا ۔۔۔ ''ہرگز نہیں!'' ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ مال ہمیشہ پاس رہے کہ جب موت آئے گی تو مال تو ساتھ نہیں جائے گا۔ مال پیچھے رہ جائے گا اور فرمایا: كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝۴ وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

فرمایا، جب موت آئے گی تو یہ حطمہ میں پھینک دیے جائیں گے۔ لوگ تو بڑی عزت سے غسل دے کر کفن پہنا کر خوشبوئیں لگا کر قبر میں دفن کر آئیں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم ہو تو جلا کر راکھ کر دیں گے یا اپنی رسومات کے مطابق رخصت کریں گے لیکن یہ لوگ برزخ میں داخل ہوتے ہی حطمہ میں جائیں گے۔ فرمایا: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝۵ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝۶ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝۷ ''اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں پر جا لپٹے گی''۔ فرمایا، اے مخاطب! تجھے کیا خبر حطمہ کسے کہتے ہیں۔ یہ تو اللہ کی بھڑکائی ہوئی ایسی آگ ہے ایسا لپکتا ہوا شعلہ ہے کہ جسم کے کسی حصّے کو چھو جائے تو دل کے نہاں خانے سے جا نکلتا ہے۔ یہ ایسا شعلہ نہیں ہے کہ ہاتھ کو لگا تو صرف ہاتھ کو جلائے بلکہ دل سے جا نکلتا ہے۔ یہ اور طرح کی آگ ہے۔ حطمہ دوزخ کا ایک حصّہ ہے اور بہت دہکتی ہوئی آگ ہے جس کے شعلے بہت بھڑکتے ہوئے ہیں۔ جیسے بعض ادویات ایسی ہوتی ہیں کہ جب ان کا ٹیکہ بازو پر لگتا ہے تو اثر دل پر ہوتا ہے۔ کسی ٹیکے کے اثر سے دل پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے کسی ٹیکے سے دل میں تقویت ہوتی ہے۔ یہ آگ بھی اس ٹیکے کی طرح ہے کہ جسم کے کسی حصّے کو چھوتی ہے تو شعلہ دل کے نہاں خانے اَفْـِٕدَةِ سے جا کر نکلتا ہے۔ دل کے بھی انتہائی نہاں خانے سے جا کر یہ شعلہ نکلتا ہے۔ اب قیامت کے روز جہاں جہاں کسی کا فیصلہ ہوگا وہ جائے گا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں یہ تو مرتے ہی حطمہ میں جا گرتے ہیں یعنی برزخ دراصل انتظار گاہ ہے جس درجے کا بندہ جاتا ہے ویسی انتظار گاہ ہے۔ فرمایا، وہ جنہیں قیامت کو حطمہ میں داخت ہونا ہے وہ برزخ میں بھی ویسی ہی آگ میں داخل کیے جائیں گے۔ اُن کی انتظار گاہ میں بھی ویسی ہی شعلہ زن آگ ہے۔ اس آگ کی ایک چھوٹی سی مثال دنیا میں سمجھنے کے لیے عرض ہے کہ کبھی سنار کو دیکھیں کہ جب وہ زیور جوڑتے اور ٹانکے لگاتے ہیں تو ایک دیا سا جلا کر رکھا ہوتا ہے۔ سنار کے پاس ایک پھونکنی سی ہوتی ہے جس میں سے وہ اُسی شعلے میں پھونک مارتے ہیں تو ہوا کے زور سے ایک شعلہ نکلتا ہے جو دھات پر پڑتا ہے اور وہ پگھل جاتی ہے۔ اب وہ دیا جل رہا ہے وہ بھی آگ

ہے لیکن اس سے جو شعلہ نکلا وہ اتنا تیز تھا کہ اس نے سونا یا چاندی جو بھی دھات تھی اسے پگھلا دیا۔ فرمایا یہ حطمہ ایسا بھڑکتا ہوا شعلہ ہے کہ جسم کے کسی حصے کو بھی چھو جائے تو نہاں خانہ دل تک چلا جاتا ہے۔ فرمایا: اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾ ''وہ یقیناً اس میں بند کر دیے جائیں گے (آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں''۔ انہی شعلوں کے ستون ہوں گے، دیواریں ہوں گی، فرش ہوگا اور انہی بڑھکتے ہوئے شعلوں کی چھت ہوگی۔ یہ اس کے اندر بند کر دیے جائیں گے۔ ہر طرف اسی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ برزخ میں ان کی ایسی انتظار گاہ ہوگی۔ یاد رہے! یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا عذاب صرف کسی بہت دولت مند پر ہی آئے بلکہ یہ غریب آدمی پر بھی نازل ہو سکتا ہے اگر اس کی دولت کے لیے محبت بھی اتنی ہی شدید ہو۔ جب ایک غریب بھی حلال حرام کی پروا کیے بغیر صرف پیسہ جمع کرنے میں لگا رہے۔ اُسے اللہ سے حیا نہ آئے، دین کی پروا نہ کرے صرف پیسے کا لالچ ہو تو اس کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آیا۔ کسی صاحبِ کشف بزرگ نے مجھے بتایا تھا۔ ایک غریب سا آدمی تھا جسے میں بھی جانتا تھا تو کہنے لگے کہ وہ جب فوت ہوا اور اسے دفن کیا تو میں نے دیکھا کہ یہ تو آگ کا ایک بکس ہے جس میں اسے رکھ رہے ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے میت کو اس میں رکھا تو اسے اُس طرف کھینچ کر اس پر پردہ ڈالا تو وہ بھی آگ کا تھا۔ کہنے لگے کہ آپ جانتے ہیں مرنے والے کے پاس کتنی دولت تھی؟ میں نے کہا وہ تو ایک دیہاڑی دار غریب بندہ تھا اس کے پاس دولت کہاں سے آگئی۔ میں اس کے خاندان کو بھی جانتا ہوں۔ وہ خود بمشکل دو وقت کا کھانا کماتا تھا لیکن شاید اس کے دل میں لالچ اُسی درجے کا تھا جس طرح کا کھرب پتیوں کے دل میں ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی قبر کو ہی حطمہ بنا دیا گیا کہ قبر انتظار گاہ ہے، قیامت تک وہاں رہنا ہے۔ حطمہ کی تفصیل بتا دی گئی، اللہ کریم ہمیں معاف فرمائے۔ ہمیں ارشاداتِ باری اور ارشاداتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یقینِ کامل نصیب فرمائے، ماننے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ یاد رکھو! اسلام دولت کمانے سے منع نہیں کرتا صرف دوسروں کا حق چھیننے سے روکتا ہے۔ جس قدر ممکن ہو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور پھر معافی طلب کرتے رہو کہ یا اللہ اس ساری محنت کے بعد بھی جو کوتاہی رہ گئی ہے اُسے معاف کر دیں۔ اس کی بارگاہ میں عاجزی کرو چہ جائیکہ تم اُس نظام کا مذاق اڑاؤ جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ تم کہو کہ یہ تو ناقابلِ عمل ہے یا یہ فضول یا ناممکن باتیں ہیں۔ یہ کیسا عجیب جملہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام قابلِ عمل نہیں ہے! یہ باتیں کس قدر گستاخی ہیں اور پھر مذاق بھی اڑایا جائے صرف اس لیے کہ دنیا مل جائے، دولت جمع ہو جائے، یہ لُوٹ کر کہاں لے جاؤ گے؟ یہ تو پیچھے رہ جائے گا البتہ تمہیں اُٹھا کر حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔

سورۃ الفیل رکوع 1 آیات 1 تا 5

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ
تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝٣ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ
سِجِّيْلٍ ۝٤ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝٥

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟﴿۱﴾ کیا اُن کا داؤ غلط نہیں کیا؟﴿۲﴾ اور ان پر جھُنڈ کے جھُنڈ اُڑتے جانور (پرند) بھیجے﴿۳﴾ جو اُن پر کنکر سے پتھر پھینکتے تھے﴿۴﴾ سو ان کو ایسا کردیا جیسا کھایا ہوا بھُس﴿۵﴾

تفسیر و معارف

سورۂ فیل مکی سورتوں میں شمار کی جاتی ہے۔

واقعہ کا تاریخی پس منظر:

یہ واقعہ اس سال پیش آیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا سال ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب یمن کے بادشاہ ذونواس نے مسلمان ہونے والوں کو خندقوں میں آگ بھروا کر اُن میں گرا کر جلا دیا تھا تو قیصرِ روم چونکہ اُس دور کا مسلمان تھا یعنی دینِ عیسوی پر تھا۔ یاد رہے کہ اس وقت دینِ عیسوی ہی اسلام تھا۔ چنانچہ قیصرِ روم نے ذونواس کی سرکوبی کے لیے اپنے دو جرنیل ارباط اور ابرہہ کو لشکر دے کر یمن روانہ کیا۔ وہ یمن پہنچے اور مقابلہ ہوا تو ذونواس شکست کھا کر بھاگا اور سمندر میں غرق ہو کر مر گیا۔ ریاست پر ابرہہ نے قبضہ کر لیا اور ارباط کو بھی قتل کر کے وہ یمن کی ریاست کا خودمختار حکمران بن بیٹھا۔ اُس نے یمن میں بہت بڑا کلیسا تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ اس کا

طواف کیا جائے اور حج بھی یہیں کیا جائے۔ لوگ تو بیت اللہ شریف کے حج اور طواف پر ہی جاتے تھے۔ اس کی ایک عظمت تمام عرب قبائل میں تھی خواہ وہ بت پرست تھے، مشرک تھے لیکن بیت اللہ میں حج کے نام پر رسمیں کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ کلیسا کے حج کے لیے کوئی نہ آیا۔

یہ بھی تاریخ میں ملتا ہے کہ کسی عربی شخص نے اس کلیسے کو ناپاک کر دیا۔ اس پر کوئی غلاظت مل دی، کچھ ایسا کام کیا جس سے ابرہہ سیخ پا ہو گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ مکہ مکرمہ والے بیت اللہ کو مسمار کر دے گا تا کہ جسے حج کرنا ہو وہ یمن ہی آئے گا۔ یمن چونکہ ایک طرف سے افریقہ سے جاملتا ہے اور افریقہ میں ہاتھی ہوتے ہیں، جو عرب میں نہیں پائے جاتے تو یمن کی فوج میں بھی اور شاہی سواری کے لیے بھی سدھائے ہوئے ہاتھی تھے۔ ابرہہ نے ایک بڑا لشکر تیار کیا جس میں ہاتھی بھی شامل کیے گئے۔ اُس کی اپنی سواری کے لیے بہت بڑا ہاتھی تھا جس کا نام محمود تھا۔ ابرہہ یمن سے لشکر لے کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں قبائلِ عرب نے جمع ہو کر مقابلہ کیا لیکن سب شکست کھا گئے اور ابرہہ کا لشکر ہر رکاوٹ کو روندتا ہوا منیٰ کے قریب تک آپہنچا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب جو رئیسِ مکہ تھے انہوں نے اہلِ مکہ کو حکم دیا کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں میں چلے جائیں۔ اُن کا فرمانا تھا کہ جب عرب کے سارے قبائل مل کر ابرہہ کا مقابلہ نہیں کر سکے تو ہم بھی نہیں کر پائیں گے۔ چنانچہ سب پہاڑوں میں چلے جاؤ اور کعبہ کو ربِّ کعبہ کے سپرد کر دو۔ ربِّ کعبہ جانے اور ابرہہ جانے، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

حضرت عبدالمطلب کا عقیدہ:

اسی دوران ایک دن ابرہہ کے چند لشکری حضرت عبدالمطلب کے تقریباً دو سو اونٹ ہانک کر لے گئے۔ حضرت عبدالمطلب ابرہہ سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اُسے خبر دی گئی کہ اہلِ مکہ کے سردار آئے ہیں تو اُس نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ ابرہہ نے آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ آپ کے لشکری میرے اونٹ ہانک کر لے آئے ہیں۔ آپ انہیں حکم دیں کہ مجھے میرے اونٹ واپس کر دیں۔ ابرہہ یہ سن کر بہت حیران ہوا کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہے کہ میں یمن سے چلا ہوں اور یہ جو بیت اللہ کے نام پر آپ نے عمارت بنا رکھی ہے میں اسے مسمار کر کے ختم کرنے آیا ہوں؟ عین ممکن ہے میں اس شہر ہی کی بیخ و بُن ادھیڑ کے رکھ دوں اور آپ اونٹوں کی بات کر رہے

ہیں! میں تو سمجھا تھا کہ آپ قریش کے سردار ہیں، مکہ کے رئیس ہیں تو اس کے بارے میں بات کریں گے۔ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ یہ اونٹ میرے ہیں مجھے اللہ نے دیے ہیں، میں اونٹوں کی بات کر رہا ہوں۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے اُس کی بات وہ خود آپ سے کر لے گا۔

ہمارے ملک میں بعض دیسی کتابیں لکھی گئی ہیں، کوئی نور نامہ کہلاتا ہے کوئی کسی اور نام سے ہے اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ (معاذ اللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا اور والدین مسلمان نہیں تھے اور اس قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ یہ بات سمجھ لی جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عالی سے پہلے توحیدِ باری کا اقرار ہی سارا اسلام تھا۔ وہ عہدِ فترت تھا۔ شریعتِ اسلامیہ کہیں موجود نہیں تھی نماز روزہ، حرام حلال کوئی احکام نہیں تھے کہ نبوت کے احکام ناپید تھے۔ البتہ اللہ کی توحید کا اقرار اور اللہ کو واحد اور لاشریک، حاکمِ مطلق ماننا ہی اسلام تھا۔ یہی دین حضرت عبدالمطلب کا تھا اور اس دور کے جتنے لوگ اللہ کو واحد مانتے تھے سب مسلمان اور نجات یافتہ شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب کا یہ فیصلہ کہ بیت اللہ کا ایک ربّ ہے جو اس کی حفاظت پر قادر ہے اور وہ حفاظت کرے گا، اُن کے پختہ اعتماد علیٰ اللہ کی غمازی کرتا ہے۔ اُن کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔

سپر پاور (SUPER POWER) صرف اللہ ہے:

ابرہہ نے حضرت عبدالمطلب سے ملاقات کے اگلے دن حملے کا حکم دے دیا۔ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں اب بھی بورڈ لگے ہیں کہ وہاں سے جلدی گزر جائے تو وہاں ابرہہ کا لشکر صف آرا ہوا۔

فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اُن کا داؤ غلط نہیں کیا؟ اور اُن پر جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے جانور (پرند) بھیجے۔

ابرہہ کی سواری کا ہاتھی 'محمود' بہت بڑا اور طاقتور تھا۔ اُسے جب مکہ مکرمہ کی طرح رخ کر کے چلنے کا حکم دیا تو اُس نے چلنے سے انکار کر دیا جب اس کا رخ دوسری طرف کرتے تو چل پڑتا۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود ہاتھی نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ سارے سرداروں نے ابرہہ کو مشورہ دیا کہ حملے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے کہ جانور کے دل میں مِن جانبِ اللہ شاید کوئی بات آرہی ہے جو یہ آگے نہیں جانا چاہتا۔ ابرہہ نے ان کا مشورہ مسترد

کر دیا اور وہیں صف بندی کرائی اور لشکر کو حملے کی تیاری کا حکم دے دیا۔ جب لشکر تیار ہو گیا تو سمندر کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول کے غول آ گئے کہ آسمان سیاہ ہو گیا۔ ابابیل ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے۔ اب بھی ہمارے ہاں لوگوں نے ایک چھوٹے سے پرندے کا نام ابابیل رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی پرندہ تھا یا کوئی مختلف تھا یہ اللہ بہتر جانتے ہیں۔ بہر حال اس پرندے کا نام ابابیل تھا جو بہت چھوٹی سی چڑیا تھی۔ اُن چڑیوں کے پنجوں اور چونچوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں۔ فرمایا: تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ جو ان پر کنکر سے پتھر پھینکتے تھے۔ اُن پرندوں نے لشکر پر کنکریاں برسانا شروع کر دیں۔ اللہ کی شان ہے وہ کنکریاں ایسی تھیں جیسے کوئی ایٹم بم ہو۔ وہ جس کے سر میں لگتی تو پورا جسم چھیدتی ہوئی نیچے سے جا نکلتی اور وہ زخم بن کر پھیلنے لگتا جس سے جسم گلنے لگ جاتا۔ جس ہاتھی پر گرتیں پاؤں تک سوراخ کرتی جاتیں اور پھر وہ سوراخ گلنے سڑنے لگتا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، کیا ہم نے اُن کا داؤ الٹ نہیں دیا؟ وہ چلے تھے بیت اللہ کو تباہ کرنے خود ایسی تباہی کا شکار ہوئے کہ نشانِ عبرت بن گئے۔ ابرہہ بری طرح زخمی ہوا، اسے کچھ لوگ سخت زخمی حالت میں وہاں سے بچا کر یمن لے گئے لیکن اس کے زخم خراب ہوتے رہے۔ فرمایا: فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ سو اُن کو ایسا کر دیا جیسا کھایا ہوا بھُس۔

ابرہہ کے زخم ٹھیک نہ ہوئے اور بالآخر اعضاء گل سڑ کر الگ ہونے لگ گئے ہڈیاں بھی گل سڑ کر پانی ہو گئیں اور سارا بدن مائع بن کر بہہ گیا۔ اس بری حالت میں وہ خود بھی تباہ ہوا اور سارا لشکر بھی تباہ ہو گیا۔ اُن پرندوں نے لشکر کا ایسا حال کر دیا جیسے جانور کا کھایا ہوا بھُس یا چارا ہوتا ہے۔ جانور جو چارا کھا رہا ہوتا ہے اگر وہ باہر اگل دے تو وہ ریزہ ریزہ ہو چکا ہوتا ہے۔ فرمایا، ہم نے ان کا بھی یہی حال کر دیا تھا جنہیں ہاتھیوں پر بڑا ناز تھا، طاقت کا بگڑا گھمنڈ تھا کہ کسی کا وجود سلامت نہیں رہا، سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔ سارا لشکر تباہ ہو گیا، جیسے کھایا ہوا چارا ہوتا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ کس کا سر ہے، بازو کس کا ہے، وجود کس کا ہے۔ سارا لشکر ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ کنکریاں تو جیسے ایٹمی ہتھیار بن گئی تھیں۔ اُن میں ایسا زہر تھا کہ مفسرینِ کرام بتاتے ہیں کہ جسے وہ کنکر لگتا وہ کینسر کی طرح پھیلنے لگتا اور جسم گلنے سڑنے لگتا حتیٰ کہ اعضا الگ ہونا شروع ہو جاتے انگلیاں جھڑ جاتیں۔ یہ عبرت ناک انجام ہوا اُن ہاتھی والوں کا!

اللہ کریم قادر ہیں اتنے طاقتور لشکر کے لیے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے۔ نمرود جیسے شہنشاہ کو

مارنے کے لیے ایک مچھر اس کے دماغ میں گھسا دیا اور ایک مطلق العنان بادشاہ نمرود ایک ادنیٰ سے مچھر کی وجہ سے ہلاک ہوگیا۔ وہ بے نیاز ہے!

اسی طرح ہجرت کے موقع پر جب اہلِ مکہ تلاش میں غار تک پہنچ گئے تو کائنات کے سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے مکڑی کا جالا تنوا دیا اور بڑے بڑے مکہ کے جانباز اس جالے کو پار نہ کر سکے۔ اللہ کریم نے بیت اللہ کی حفاظت کے لیے ابابیل بھیج دیے لیکن یاد رہے بعثتِ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیت اللہ کی حفاظت کا فریضہ اب اُمتِ محمدیہ کے ذمے ہے۔ اب اس کی حفاظت کے لیے ابابیل نہیں آئیں گے۔ اگر اب خدانخواستہ امتِ محمدیہ اس کی حفاظت نہ کر سکی تو یہ واقعی گرا دیا جائے گا۔ اس کی حفاظت کے لیے ابابیل اس وقت آئے تھے جب اس کے محافظ نہ تھے اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا گیا۔ بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیت اللہ کی حفاظت، دین اور ارکانِ دین کی حفاظت، قرآنِ حکیم کی حفاظت، حدیثِ پاک کی حفاظت کی سعادت ہر اُس فرد کے ذمے ہے جو خود کو مسلمان کہتا ہے۔ حفاظت صرف بندوق سے ہی نہیں کی جاتی۔ حفاظت درحقیقت ساتھ دے کر کی جاتی ہے۔ تلوار یا بندوق بھی وہی اٹھا سکتا ہے جو ساتھ دے رہا ہو۔ چنانچہ ہر ایک کو اپنی خبر لینی چاہیے کہ وہ عقیدے، نظریات سے لے کر عملی زندگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا ساتھ دے رہا ہے!۔ اللہ کی کتاب کا کتنا ساتھ دے رہا ہے۔ بحیثیتِ امت ہم سب کو دیکھنا چاہیے کہ ہم اللہ کے گھر کی حفاظت کا کتنا حق ادا کر رہے ہیں! ہمارا کردار اور عقائد کتنے مضبوط ہیں۔ دوسروں پر کفر کے فتوے لگانا کوئی کمال نہیں ہے۔ اپنے آپ کو دین میں ڈھالنا مقصدِ حیات ہے۔ اب یہ سب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے اپنے دلوں میں دماغوں اور کردار میں بسا کر اللہ کے دین کی حفاظت کریں۔ اللہ کے گھر کی حفاظت کریں۔ یہ بات سمجھ لیں کہ گو مادّی وسائل اور اسباب یقیناً نتائج پیدا کرتے ہیں لیکن حق کی قوت، دین پر استقامت اور دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا یہ بجائے خود ایک بہت بڑی قوت ہے۔ یہ اتنی بڑی طاقت ہے کہ اس کے سامنے مادّی وسائل نہیں ٹھہر سکتے۔ یہی وہ کلیہ ہے جو آج کے مسلمان کو سمجھ نہیں آ رہا۔ آج ہم جس قوم کا حصہ ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ جدھر مادّی طاقت ہے ذرائع و وسائل ہیں، دولت اور فوجی قوت ہے وہی طاقتور ہے لہٰذا اس کے آگے جھکنا چاہیے۔ یہ سورۂ پاک بتا رہی ہے کہ سب سے تگڑا حق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثتِ عالی اس حال میں ہوئی کہ روئے زمین پر کوئی اسلام سے آشنا نہیں تھا۔حکومتیں بھی تھیں، بادشاہ بھی تھے لشکر بھی تھے، بین الاقوامی سپر پاورز (SUPER POWERS) تھیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیلے توحیدِ باری کا نعرہ بلند فرمایا۔علامہ بازل ایرانی لکھتا ہے:

کجا بود دنیا با مصطفٰے

ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیوی وسائل کہاں تھے!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیوی اسباب نہیں تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم دینِ حق لے کر اُٹھے اور چند برسوں میں وہ سارے مادّی وسائل مغلوب ہو گئے اور دینِ حق غالب آ گیا۔اللہ کرے کہ ہماری قوم کو، اربابِ بست وکشاد کو یہ نکتہ سمجھ آجائے کہ حق پر قائم رہنا سب سے بڑی قوت ہے۔ چونکہ اللہ کریم سب سے بڑی طاقت ہیں، سپر پاور ہیں تو جو حق پر قائم رہے گا اس کے ساتھ حقیقی سپر پاور ہوگی اور روئے زمین کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم اس راز کو سمجھ ہی نہیں پا رہے۔ ہر نماز میں بے شمار دفعہ تکبیر پڑھتے ہیں، اللہ اکبر، اللہ اکبر لیکن پھر بھی دوسروں کی کبریائی مان لیتے ہیں۔ہم قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھیں تو پتا چلے کہ سپر پاور (SUPER POWERS) صرف اللہ ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ مادّی وسائل یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن اللہ کی طاقت کے سامنے اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔غزواتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اگر دیکھیں تو ہر طرح کی مادّی قوتیں تو کفار کے پاس تھیں لیکن فتح اسلام کی ہوتی رہی کیونکہ اللہ کی تائید ونصرت اور طاقت مسلمانوں کے ساتھ تھی۔آج بھی جو حق پر جم جائے گا تو اللہ کی طاقت اسی کے ساتھ ہوگی۔ اللہ کریم ہمیں قرآنِ کریم کو سمجھنے کی اور سمجھ کر قبول کرنے کی اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

سورۃ قریش رکوع 1 آیات 1 تا 4

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ
هٰذَا الْبَیْتِ ﴿۳﴾ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

قریش کے مانوس کرنے کے سبب ﴿۱﴾ (یعنی) ان کو مانوس کرنے کے سبب جاڑے اور گرمی کے سفر سے ﴿۲﴾ تو لوگوں کو چاہیے کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں ﴿۳﴾ جس نے اُن کو بھوک میں کھانا کھلایا اور ان کو خوف سے امن بخشا ﴿۴﴾

تفسیر و معارف

سورۂ قریش مکی سورتوں میں سے ہے۔

اللہ کریم کا احسان کہ بنی آدم کو موسموں کا عادی بنا دیا:

فرمایا: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ﴿۲﴾ ''قریش کے مانوس کرنے کے سبب۔ (یعنی) اُن کو مانوس کرنے کے سبب جاڑے اور گرمی کے سفر سے''۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں، قریش میں مبعوث ہوئے اور یہ مکی سورت ہے تو پہلے خطاب قریش کو فرمایا۔ اللہ کریم کا ان پر احسان ہے کہ انہیں گرمی اور سردی، ہر موسم میں سفر کرنے کی عادات سے مانوس کر دیا۔ انہیں قوتِ برداشت دے دی لہٰذا انہیں کسی موسم میں سفر کرنا مشکل نہیں لگتا تھا۔ عرب میں تجارت ہی چونکہ ذریعہ معاش تھا جس کے لیے سفر ضروری تھا اور ذرائع نقل و حمل آج کی طرح نہیں تھے۔ لوگ تجارتی سامان لے کر قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور دوسرے سے بھی پھر اگلے شہر۔ پہلے شہر میں پڑاؤ ڈالتے کچھ خریدتے، اگلے پڑاؤ پر کچھ بیچ دیتے کچھ وہاں سے خرید لیتے۔ پھر چل پڑتے اور اگلے پڑاؤ پر خرید و فروخت کرتے۔ اس طرح سے کاروبار ہوتا تھا۔ پھر سفر کرنا آسان نہیں تھا کہ آج کل جیسی سہولتیں نہیں تھی۔ سفر میں راشن کا سارا سامان اٹھا کر چلنا پڑتا جہاں رات آ گئی وہاں پڑاؤ ڈال کر کھانا پینا بنانا پڑتا تھا۔

عربوں کا ایک خاص مزاج تھا، عرب کا ایک خاص موسم تھا، انہیں گرم سرد ہر طرح کے علاقوں میں سفر کرنے پڑتے تھے۔ اللہ نے انہیں ان کا عادی کر دیا تھا۔ فرمایا، اللہ کریم کا کتنا احسان ہے کہ گرمی ہو یا سردی یہ لوگ آسانی سے سفر کر لیتے ہیں۔ سارا دن چلتے رہتے ہیں اور راتیں سفر میں، خیموں میں گزارتے ہیں، کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ انہیں موسموں کا اثر تکلیف نہیں دیتا اور سفر کی تھکان محسوس نہیں کرتے۔ اللہ کریم کا یہ احسان تھا کہ انہیں سفر کے لیے مزاجاً آسانیاں بخش دیں۔ یہ احسان اللہ کریم کا تمام اولادِ آدم پر ہے کہ جہاں جہاں کوئی رہتا ہے اُسے وہاں کے موسموں کا عادی کر دیتے ہیں۔ وہ ربِّ کریم ہیں جہاں جس موسم میں کوئی ہے، اُسے اس کی قوتِ برداشت دے دیتے ہیں۔ دنیا میں سخت گرم ترین علاقے ہیں اور لوگ اُن میں بھی بستے ہیں۔ ایسے سرد ترین علاقے بھی ہیں جہاں سارا سال برف پڑتی رہتی ہے، انسان وہاں بھی بستے ہیں۔ افریقہ میں بعض انتہائی گرم علاقے ہیں جہاں سارا سال گرمی پڑتی ہے چونکہ خطِ استوا پر ہے اور سورج عموماً خطِ استوا پر رہتا ہے۔ سورج جنوب کی طرف جدی تک یا شمال کی طرف سرطان تک آتا ہے۔ جب جنوب کو جاتا ہے تو شمال میں سردیاں آجاتی ہیں اور جب شمال کو جاتا ہے تو جنوب میں سردیاں آجاتی ہیں لیکن اِستوا تو درمیان میں ہے۔ اس کے اوپر ہی سورج شمال جنوب کو ہوتا رہتا ہے لیکن جب عین اس کے اوپر ہوتا ہے تو بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ افریقہ میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں خشک بارش ہوتی ہے۔ جب اس کے بارے میں پڑھا تو بڑی حیرت ہوئی کہ خشک بارش (DRY RAIN) کیا ہے۔ اس کے متعلق لکھا ہوا تھا کہ وہاں بارش تو ہوتی ہے لیکن زمین پر پانی کا کوئی قطرہ نہیں گرتا کہ اتنی گرمی ہوتی ہے کہ زمین پر گرنے سے پہلے ہی پانی بھاپ بن کر واپس ہو جاتا ہے۔ اسے خشک بارش کہتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں ایک علاقہ ہے جس کا نام THE DEATH VALLEY ہے یعنی موت کی وادی۔ وہ سطح زمین سے بہت نیچے ہے اس میں شدید گرمی ہوتی ہے حتیٰ کہ وہاں جو چشموں کا پانی ہے وہ اتنا کھول رہا ہوتا ہے کہ اس کو مزید گرم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر اسی میں چائے کی پتی ڈال دیں تو چائے بن جاتی ہے۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ اس پانی میں بھی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ اُن علاقوں میں بھی لوگ رہتے ہیں وہ وہاں کے عادی ہیں۔ برفستانوں میں جہاں سارا سال برف رہتی ہے وہاں بھی لوگ رہتے ہیں اور کمال ہے انہوں نے برف کے ہی مکان (IGLOO) بنا رکھے ہیں۔ وہ برف میں ہی بسر کرتے ہیں، وہ اس کے عادی ہیں۔ ایسے علاقے بھی ہیں جہاں چھ مہینے سورج ڈوبتا ہی نہیں اور چھ مہینے سورج نظر ہی نہیں آتا لیکن لوگ وہاں بھی رہتے بستے ہیں۔ بنی آدم پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کے موسموں کا اُن کے وجود کو عادی کر دیتے ہیں۔ وجود اس کو برداشت کر لیتا ہے۔ غالباً تین دہایاں پہلے مجھے اس کا ایک ذاتی تجربہ بھی

ہوا کہ اُس سال سردیاں مری میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ لوگ تو گرمیوں میں مری جاتے تھے تو گرمیوں میں آبادی ہوتی تھی سردیوں میں ویران پڑا ہوتا تھا۔ برف پڑی ہوتی تھی اور ہم لوگوں نے گرم جرابوں کے بھی دو دو جوڑے پہن رکھے ہوتے تھے۔ جرابوں کے اوپر بوٹ بھی چڑھا رکھے ہوتے تھے پھر بھی ہمارے پاؤں سردی سے سوجھ جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کچھ بچے جن کی عمر سات آٹھ سال ہوگی سر سے ننگے، پاؤں سے ننگے ایک لمبا سا کرتا پہنے ہوئے مزے سے پھر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں چیڑ کے پھل جسے وہ کھنگلے کہتے تھے، اس کے تھیلے تھے جسے وہ بیچتے پھر رہے تھے۔ کھنگلے میں تیل ہوتا ہے اور اگر وہ گیلا بھی ہو تو بھی جل اٹھتا ہے لہٰذا لوگ انگیٹھیوں میں کوئلے کے نیچے رکھ کر کھنگلوں کو جلایا کرتے تھے۔ وہ بچے چار چار آنے کے تھیلے بیچتے پھر رہے تھے۔ اُن کے پاؤں ننگے تھے لیکن سوجھے ہوئے نہیں تھے۔ ایک کُرتے میں، سر سے بھی ننگے پھر رہے تھے لیکن سردی محسوس نہیں کرتے تھے جبکہ ہم گرم کپڑوں، بوٹ جرابوں کے باوجود سردی سے کانپتے تھے اور پاؤں سوجھ جاتے تھے۔ یہ اللہ کریم کا اولادِ آدم پر احسان ہے کہ جہاں کوئی جس موسم میں بستا ہے اُسے اس کی برداشت کی قوت دے دیتا ہے۔

خوشحالی اور امن اللہ کی نعمتیں ہیں جن کا شکر اطاعت ہے:

فرمایا: فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِيٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿٤﴾ تو لوگوں کو چاہیے کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے اُن کو بھوک میں کھانا کھلایا اور اُن کو خوف سے امن بخشا۔

اللہ کریم کے احسانات تو تمام انسانوں پر ہیں لیکن یہاں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر تو اللہ کریم کے بڑے احسانات ہیں چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش میں مبعوث ہوئے تو پہلی آواز قریش تک پہنچی لیکن اس میں سبق ساری انسانیت کے لیے ہے۔ فرمایا، اللہ کریم نے اے! قریش تم پر بڑے احسان کیے تمہیں گرمی سردی برداشت کرنے کی ہمت دی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی جرأت دی۔ پھر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ تم جہاں ہو یہاں بیت اللہ شریف ہے جس کا وہ مالک ہے ربّ ہے۔ بیت اللہ شریف کی برکت سے تمہاری دو بہت بنیادی اور اہم ترین انسانی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ دو بنیادی ضرورتیں غذا اور تحفظ ہیں۔ ان کے بغیر بقائے زندگی ناممکن ہے۔ اگر کسی کو کھانا مل جائے لیکن جان کی امان نہ ہو، قتل ہونے کا اندیشہ ہو، ڈاکے کا خوف ہو، بدامنی ہو تو کھانا بھی بے لطف ہو جاتا ہے۔ جہاں امن ہو لیکن کھانے پینے کو کچھ نہ ملے تو وہاں بھی بندہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ

دونوں نعمتیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر اُسے کسی چیز کی کمی نہیں رہتی۔ فرمایا، یہ جو بیت اللہ شریف کا پڑوس تمہیں نصیب ہے یہ بھی اس کے پروردگار کا تم پر کرم ہے۔ تمہیں ہر طرح کے سفر کا عادی کر دیا کہ تم روئے زمین سے چکر لگا کر آتے ہو، روزی کماتے ہو، خوشحال ہو اور جب واپس مکہ پہنچتے ہو تو ہر طرح کا امن نصیب ہے۔ اس شہر کو شہرِ امن بنا دیا ہے۔ یہاں کوئی مشرک و کافر بھی بدامنی نہیں کرتا۔ دنیا کے ہر طرح کے رزق کو وہاں جمع کر دیا۔

یہ وہ دور تھا جسے عہدِ فترت کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صدیاں بیت گئیں تھیں۔ لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن بیت اللہ شریف کی عظمت لوگوں کے دلوں میں برقرار رہی۔ اس زمانے میں بھی اہلِ مکہ پر کوئی زیادتی نہیں کرتا تھا۔ کوئی اس شہر پر حملہ نہیں کرتا تھا، قتل و غارت گری یا لوٹ مار نہیں کرتا تھا یعنی اہلِ مکہ کا اتنا لحاظ کرتا تھا۔ فرمایا، اسے شہرِ امن بنایا ہے۔ دوسری نعمت یہ ہے کہ دعائے ابراہیمی علیہ السلام کی طفیل شہرِ مکہ میں ہر غذا ہر پھل سارا سال دستیاب رہتا ہے۔ اس مبارک شہر کا یہ حال ہے کہ وہاں موسموں کی کوئی قید نہیں۔ سردیوں کا پھل گرمیوں میں دستیاب ہے اور گرمیوں کی سبزیاں اور پھل سردیوں میں ملتا ہے یعنی سارا سال ہر پھل، ہر سبزی ہر جنس دستیاب ہے، کبھی کمی نہیں ہوتی۔ اُس عہد میں تو اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوتا تھا لیکن اب اتنا بڑا اجتماع ہوتا ہے کہ پچیس تیس لاکھ حجاج آٹھ ذوالحج کو سب مکہ مکرمہ میں فجر ادا کرتے ہیں۔ ایک شہر میں اگر اتنے مہمان باہر سے آ جائیں تو کتنی سبزی، کتنا پھل، کتنی غذائی ضرورتیں پوری کر پائے گا! وہاں تو آٹا، دالیں، چاول ختم ہو جانا چاہیے۔ اللہ کی شان ہے کہ مکہ مکرمہ میں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہر وقت دکانیں بھری کی بھری رہتی ہیں اللہ کی مخلوق روئے زمین سے آتی رہتی ہے۔ ایک ہجومِ عاشقاں ہے جو ہمہ وقت سرگرداں ہے۔ فرمایا، قریش کو اللہ کے یہ احسانات یاد رکھنا چاہییں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ جب اللہ نے قریش پر اتنے احسان کیے ہیں کہ انہیں ہر طرح کے سفر کا عادی کر دیا ہے، ان کے لیے سفر کو زندگی کا معمول بنا دیا ہے۔ روئے زمین کا چکر لگا آتے ہیں اور انہیں تکلیف نہیں ہوتی ان تجارتی اسفار سے روزی کماتے ہیں، خوشحال ہیں اور جب واپس گھر لوٹتے ہیں تو مکہ مکرمہ میں ہر طرح سے امن نصیب ہے، شہر میں راشن کی فراوانی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ یہ امن اور فراوانی بیت اللہ کی وجہ سے انہیں نصیب ہے تو پھر انہیں بیت اللہ کے پروردگار کی عبادت یعنی اطاعت کرنی چاہیے اور وہ اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہوگی۔ قریش کو چاہیے کہ ان نعمتوں کا شکر بجا لائیں اور شکر کا طریقہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیں اور اتباع اختیار کریں۔ قریش چونکہ مخاطبِ اوّل تھے اور پہلی دعوت اُن تک پہنچی تو پہلی مخالفت بھی قریش ہی سے شروع ہوئی۔ ان پر اللہ کریم نے بے شمار احسانات کیے اور ان کے جواب میں شکر بجا لانے کا فرمایا۔ اس حکم کو ساری نسلِ انسانی پر پھیلا کر دیکھا جائے تو روئے زمین کے ہر انسان پر ربّ کریم کے یہی احسانات ہیں اور بے پناہ احسانات ہیں جن کا تقاضا ہے کہ اسے اللہ

کریم کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اللہ کریم نے اسے زندگی دی اور جہاں جس حال میں بستا ہے اس میں وہاں کے گرم وسرد کے برداشت کی قوت دی۔ اسے موسموں کا عادی کر دیا، سفر کرنے میں سہولتیں دیں اور اس کے لیے قوتِ برداشت دی۔ زندگی کی نعمتوں کی فراوانی عطا کی، وسائل اور ٹھکانے دیے، گھر جائیدادیں دیں۔ اسے رشتے دیے۔ والدین دیے، اولادیں دیں، بہن بھائی عزیز و اقارب دیے۔ یہ ساری نعمتیں اللہ جلّ شانہٗ کی عطا کردہ ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ انسانی زندگی میں یہ سب چیزیں ناگزیر ہیں جس طرف سے بھی کمی ہو جائے تو اس میں محرومی نظر آتی ہے اور وہ بھرپور زندگی نہیں ہوتی۔ ایسا پھر کون ہے جو یہ نعمتیں استعمال نہیں کر رہا! جب ہر انسان، اللہ کے انعامات استعمال کر رہا ہے تو پھر اسے اس کا شکر بھی بجالانا چاہیے۔ جس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

انسان تو خالی ہاتھ ہے، بھوکا ننگا ہے۔ اس کے اپنے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ہر حال میں محتاج ہے۔ صبح پیٹ بھرتا ہے، شام کو پھر بھوکا ہوتا ہے۔ یہ تو وہ ربّ کریم ہے جو مسلسل عطا کیے جا رہا ہے، فرمایا: الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۔۔۔ بھوک میں رزق پہنچائے جا رہا ہے کہ انسان کی حاجات مسلسل ہیں۔ طلب اور بھوک مسلسل ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ زندگی میں ایک دفعہ کھانا کھایا اور کافی ہو گیا۔ نہیں! اس کی احتیاج ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ ایک ضرورت پوری کرتا ہے، دوسری شروع ہو جاتی ہے۔ وہ پوری کرتا ہے ایک اور شروع ہو جاتی ہے تو یہ سدا بھوکا ہے، سدا محتاج ہے اور وہ ایسا کریم ہے کہ وہ اس کی ضرورتیں ہمیشہ پوری کرتا رہتا ہے۔ مسلسل عطا کرتا رہتا ہے۔ دنیا میں خوف وخطر سے امن عطا کرتا ہے۔

قریش کو تو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اُن کا شہر شہرِ امن ہے، مکہ مکرمہ ہے۔ جب ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا اور لوگوں کو، بچوں کو پکڑ کر غلام بنا کر بیچ دیا جاتا تھا تب بھی شہرِ مکہ کا یہ احترام تھا کہ یہاں کسی کو اُٹھایا یا پکڑا نہیں تھا کسی کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ کوئی مشرک و کافر بھی اس شہر کی بے حرمتی نہیں کرتا تھا۔ جب یہاں اتنا امن ہے تو پھر کم از کم قریش کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لینا چاہیے کہ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔ اللہ کریم کسی کی عبادت کے محتاج نہیں۔ اللہ کی شان اُن کی ذات کی طرح دائمی اور ابدی ہے۔ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے یا اطاعت کرنے یا عدمِ اطاعت سے اللہ کریم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی کے ماننے کی احتیاج نہیں ہے۔ کوئی مان لے تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور امام الانبیا ہیں۔ اگر کوئی نہ مانے تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ماننے کا اجر تو بندے کو خود ملتا ہے اور نہ ماننے کے اثرات اور نتائج خود اسے ہی بھگتنے ہیں۔ چنانچہ بندے کو اپنے فائدے کے لیے دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم تھام لینا چاہیے اور اللہ کریم کی اطاعت کرنی چاہیے۔

سورۃ الماعون رکوع 1 آیات 1 تا 7

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَا
یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ؕ﴿۳﴾ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ﴿۴﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ
صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۙ﴿۶﴾ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ٪﴿۷﴾

بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جھٹلاتا ہے جزا (کے دن) کو؟﴿۱﴾ تو یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے﴿۲﴾ اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا﴿۳﴾ پس ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے﴿۴﴾ جو اپنی نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں﴿۵﴾ جو دکھاوا کرتے ہیں﴿۶﴾ اور برتنے کی چیزیں عاریتاً نہیں دیتے﴿۷﴾

تفسیر و معارف

سورۃ الماعون مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کا شمار بھی مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔

روزِ جزا کے منکرین کا کردار:

ارشادِ باری ہے، فرمایا: اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۱﴾ بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جھٹلاتا ہے جزا (کے دن) کو؟

اے مخاطب! کیا آپ اس شخص کا حال جانتے ہیں جو حساب کتاب کے دن یعنی قیامت کا انکار کرتا ہے!

لوگ قیامت کا انکار دو طرح سے کرتے ہیں۔ ایک تو کفار اور مشرکین تھے جن کے متعلق قرآن ارشاد فرماتا ہے کہ وَمَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ (الجاثیہ:24) ہمیں تو صرف زمانہ مار دیتا ہے۔

اُن کا خیال تھا کہ بس یہی ایک زندگی ہے۔ ہر ایک کو زمانہ ہی مار دیتا ہے۔ جب مر گیا، مٹی میں مل گیا، وجود کو مٹی کھا گئی ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں تو اب اسے کون زندہ کرے گا! یہ انکار تو بڑا واضح ہے اور یہ منکرین ظاہر باہر تھے۔ فرمایا، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر انکار نہیں کرتے لیکن ان کا کردار اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ قیامت کے قائل نہیں ہیں۔ جس بندے کو جزا و سزا پر یقین ہو وہ اپنے کردار میں یقیناً احتیاط برتتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام کے دو جزو ہیں، عبادات اور معاملات جبکہ بنیاد عقیدہ ہے۔ عقائد کا اظہار کردار سے ہوتا ہے یعنی کردار عقائد کا گواہ ہوتا ہے۔ کردار کے دو پہلو دو جزو ہیں، ایک عبادات اور دوسرا معاملات۔ عبادات میں یہ کردار ہوگا کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہو، اللہ کے حکم کے مطابق ہو، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے اور سنت کے مطابق ہوگی۔ اللہ کا حکم کیا ہے اس کی دلیل بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اس کا طریقہ سلیقہ بھی سارا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیا ہوا ہے۔ عبادات سے کیا حاصل ہوگا؟ اس کا جواب ہمیشہ سے یہ دیا جاتا ہے کہ عبادات کا حاصل ثواب ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ ثواب ہوتا کیا ہے۔ کیا یہ کوئی جنس ہے، کوئی نقدی ہے؟ کیا ہے یہ ثواب؟ ثواب کا معنی اس کام کا اجر، معاوضہ یا بدلہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کافر کو اس کے کفر پر، اُس کی برائی پر ملنے والی سزا کو بھی ثواب کہا ہے۔ فرماتا ہے: هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المطففین:36) تو کافروں کو ان کے کردار کا (پورا پورا) بدلہ مل گیا۔

اسی طرح عبادات اور نیکی کا اجر بھی نیک ہوتا ہے۔ سو عبادات کا معاوضہ یہ ہے جس کی تشریح یہ آیہ کریمہ فرما رہی ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت:45) بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

سو عبادات کا ثواب یہ ہے کہ بندہ بے حیائی اور برائی سے رک جاتا ہے۔ قیامت کو جو اجر ملے گا وہ نیک اعمال پر ملے گا۔ دنیا میں عبادات کا اجر نیکی کی توفیق ہے۔ عبادات کی بنیاد عقائد ہیں۔ جس کا روزِ جزا پر اعتماد نہیں ہے فرمایا، اس کا کردار یہ ہوتا ہے، فرمایا: فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ﴿۲﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳﴾ ''تو یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا''۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس نے حقوق اور فرائض میں توازن رکھا ہے۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں، طاقتور بھی ہیں

کمزور بھی ہیں۔لوگ امیر بھی ہیں غریب بھی ہیں، صحتمند بھی ہیں، بیمار بھی ہیں۔ایسے بھی ہیں جو بہت بڑا قبیلہ، کنبہ رکھتے ہیں برادری والے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو یتیم و بے بس ہیں۔جو بے کس ہیں جنہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔اسلام نے ہر ایک کے لیے حقوق اور فرائض مقرر کر دیے ہیں۔کوئی کسی کا حق نہیں چھین سکتا، کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔فرمایا، جنہیں روزِ جزا یعنی قیامت کا یقین نہیں ہے وہ لوگ نظامِ اسلام کو قبول نہیں کرتے۔یہ دولتِ دنیا میں اندھے ہو کر کمزوروں کا حق چھینتے ہیں۔یتیموں، بے بسوں، بے کسوں کی جائیدادیں اور مال چھین لیتے ہیں۔اُن کے حقوق غصب کر لیتے ہیں۔یہ انہیں انسان ہی نہیں سمجھتے، اُن کا اکرام نہیں کرتے۔یہ خود تو کسی کو کیا دیں گے یہ کسی دوسرے کو بھی غریب اور مسکین کی مدد کرنے کی ترغیب نہیں دیتے۔انہیں زبانی بھی کوئی نیکی کی بات کہنے کی توفیق نہیں ہوتی یعنی نیک عمل کرنے کے لیے تو قوت لگتی ہے، یہ نیک مشورہ بھی نہیں دیتے۔گویا دینِ حق زبانی کہنے کی بات نہیں ہے۔ دینِ حق عمل کا نام ہے۔جو لوگ کلمہ بھی پڑھتے رہیں، قیامت کو ماننے کا اقرار بھی کریں، مسلمان بنے ہوں لیکن اُن کا کردار یہ ہو کہ نظامِ اسلام کو قبول نہ کریں جو حقوق اللہ نے بندوں کے مقرر کیے ہیں اُن کی پروانہ کریں اور محض دولت سمیٹنے کے لیے دوسروں کے حقوق غصب کریں۔درحقیقت یہی لوگ قیامت کے منکر ہیں۔اگر انہیں قیامت پر ایمان ہوتا، جزا و سزا کا یقین ہوتا تو کسی غریب کے ساتھ زیادتی کرتے؟ کسی یتیم کا، کسی کمزور کا مال چھینتے؟ ان لوگوں کو دولتِ دنیا نے اندھا کر دیا ہے اسی لیے یہ کمزوروں اور بے بسوں کو دھکے دیتے ہیں اُن کے حقوق چھین لیتے ہیں۔اسلام نے تو مطلق انسان کو حقوق دیے ہیں خواہ وہ کافر ہو، بے دین یا مشرک ہو لیکن اس کے انسانی حقوق محفوظ ہیں۔کافر کا استحقاق رکھتا ہے۔جو زندگی دے نہیں سکتا وہ لے بھی نہیں سکتا۔کافر بھی اگر قتل کیا جائے گا تو صرف اللہ کے حکم پر قتل کیا جائے گا۔اسی طرح کافر کا مال اور آبرو کوئی نہیں چھین سکتا۔اگر ریاستِ اسلامی میں کافر بستے ہیں تو یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اُن کے لیے زندگی کے وسائل مہیا کرے۔اُن کے بچوں کی تعلیم علاج معالجہ روزگار کے مواقع فراہم کرے حتیٰ کہ اگر ملک پر حملہ ہو جاتا ہے تو کافروں کی حفاظت بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔کفار کو فوج میں شامل نہیں کیا جاتا۔اُن سے جزیہ لیا جاتا ہے لیکن اُن کا تحفظ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔گویا جہاد ہو گا تو جانیں مسلمان دیں گے، شہید مسلمان ہوں گے، زخمی مسلمان ہوں گے اور کافر گھر بیٹھے حفاظت کا مزہ لیں گے۔اس حد تک تو کافر کو بھی اللہ نے حقوق دیے ہیں چہ جائیکہ مسلمان، مسلمان کے حقوق چھین لے۔آج ہمارا جو عہد چل رہا ہے اس میں مالک کو

ملازم پر اعتبار نہیں اور ملازم کو مالک پر اعتبار نہیں۔ مالک کا داؤ لگتا ہے تو وہ ملازم کی تنخواہ مار لیتا ہے ملازم کا داؤ لگتا ہے وہ مالک کے پیسے مار لیتا ہے۔ عوام کو حکومت اور حکومت کو عوام پر اعتماد نہیں ہے ایک ایسا افراتفری کا دور ہے کہ ہر بندے سے جتنی ممکن ہے اتنی کوشش وہ پیسہ حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، اتنی بے ایمانی سے باز نہیں آتا۔ اس کے ساتھ اگر وہ کلمہ بھی پڑھتے رہیں، نماز پڑھتے رہیں تو پھر فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ پس ایسے نمازیوں کی خرابی ہے۔

فرمایا، جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جو یتیموں، کمزوروں کے حقوق غصب کرتے ہیں اور یہ صرف کافروں میں نہیں ہوتے۔ ان میں برائے نام مسلمان بھی ہیں جنہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ لوگوں کو غریبوں کے ساتھ صلہ رحمی کا مشورہ ہی دے دیں فرمایا، ایسے لوگ تباہ ہو گئے جن کا کردار ایسا ہے اور وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی کا بڑا گھمنڈ ہے، پارسائی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں۔ تسبیحات لیے پھرتے ہیں، مسلمانوں جیسا حلیہ تو بنا رکھا ہے لیکن کردار یہ ہے کہ کمزوروں کا حق مار لیتے ہیں۔ کسی کا مال ان سے محفوظ نہیں۔ ان کا تو کردار بتا رہا ہے کہ یہ قیامت کے ہی منکر ہیں۔ جو لوگ کردار سے عاری ہوتے ہیں درحقیقت انہیں قیامِ قیامت پر اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ زبانی اقرار کرتے رہتے ہیں لیکن اندر سے نہیں مانتے۔ اسلام تو کردار کا نام ہے اور عقیدہ ایک دعویٰ ہے۔ یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں یہ ایک دعویٰ ہے اس کا کردار اس دعویٰ کا گواہ ہے۔ اعمال اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اگر گواہ ہی جھوٹے ہوں تو دعوے کا کیا اعتبار! فرمایا، ایسے نمازیوں کے تباہی ہے، بربادی ہے جن کے دل میں قیامت کا یقین نہیں ہے۔ فرمایا: الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾ جو اپنی نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

وہ لوگ جو بظاہر نماز ادا کرتے ہیں لیکن حقیقتِ صلوٰۃ اس میں نہیں ہے۔ یہ بڑی بے دلی سے نماز پڑھتے ہیں۔ وضو کرتے ہیں تو محض چھینٹے اڑائے چہرہ آدھا گیلا آدھا خشک ہوتا ہے۔ مسجد میں بھاگتے دوڑتے آئے مرغ کی طرح ٹھونگے مارے، اٹھک بیٹھک کر کے جلدی جلدی نماز پڑھی۔ یہ کون سی نماز ہے! یہ لوگ نماز کے اجر سے ہی غافل ہیں۔ یہ تو اُن لوگوں کا حال ہے جو عملی زندگی میں اللہ کے بنائے ہوئے نظام پر عمل نہیں کرتے لیکن عبادات نماز روزہ بہت کرتے ہیں۔

اب ہماری اکثریت ان لوگوں کی ہے جو یہ بھی نہیں کرتے یعنی اللہ کے نظام کو بھی نہیں مانتے اور نہ نماز روزے کو مانتے ہیں۔ جو لوگ سیدھا سیدھا انکار کر دیتے ہیں وہ تو سامنے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں اور نمازیں

بھی پڑھتے ہیں لیکن اس سے ان کے کردار میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو اللہ کریم فرماتے ہیں یہ بہت برے لوگ ہیں یہ بظاہر نماز ادا کرتے ہیں تو فرمایا: هُمْ يُرَآءُونَ ۝ جو دکھاوا کرتے ہیں۔

فرمایا، یہ لوگ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے رکوع سجود کرتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی نمازیں نہیں پڑھتے یہ لوگوں کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ اگر اللہ کی نماز پڑھتے تو ان کی اصلاح ہو جاتی۔ ان کا عقیدہ درست ہوتا۔ ان کے اعمال سے نماز کی خوشبو آتی۔ یہ گناہ سے ڈرتے نیکی کی طرف بڑھتے لیکن یہ لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اس لیے ان کو نیکی کا خیال نہیں آتا۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں پارسا سمجھیں۔ اس لیے ان کی نماز میں حقیقت نہیں ہے کہ وہ محض دکھاوا ہے۔ یہ بندوں کی نمازیں ہیں، اللہ کے لیے نہیں ہیں۔ دراصل ذاتی عبادات آسان ہوتی ہیں لیکن معاملات میں دیانت و امانت رکھنا، دوسروں کا حق نہ مارنا اپنے حق سے تجاوز نہ کرنا یہ مشکل ہوتا ہے۔

عبادات کا ثواب یہ ہوتا ہے کہ اعمال کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ شریعت کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔ اگر کوئی نمازیں بھی پڑھ رہا ہو، حج اور عمرے بھی کر رہا ہو، روزے بھی رکھتا ہو، تبلیغ اور وعظ بھی کرے لیکن لوگوں کا مال بھی دبائے جا رہا ہو۔ رشوتیں لے رہا ہو، سود کھا رہا ہو تو پھر اس کے سجدوں کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ دکھاوے کی نمازیں ہیں اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہیں۔ اگر اللہ کی رضا پانے کے لیے ہوتیں تو ان کو اللہ کریم کردار میں اصلاح کی توفیق دیتے، انہیں اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہو جاتا۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ فرمایا:

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ اور برتنے کی چیزیں عاریتاً نہیں دیتے۔

معاشرے میں انسان مل جل کر رہتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اللہ کی ایسی مخلوق ہے جو زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے کی محتاج ہے۔ غریب سمجھتا ہے کہ وہ امیر کا محتاج ہے لیکن امیر کی امارت بھی غریبوں کے سر پر قائم ہوتی ہے۔ غریب نہ ہوں تو اُسے بھی خود مزدوری کرنا پڑے۔ ہم کپڑا خریدتے ہیں تو جب تک درزی نہ سیئے لباس نہیں بنتا۔ جوتا بنانے کے لیے موچی کی ضرورت ہے تو بال بنوانے کے لیے حجام چاہیے۔ ان سب کو ہماری ضرورت ہے کہ انہیں مزدوری چاہیے۔ انسانی معاشرہ مل جل کر رہنے سے بنتا ہے، ایک دوسرے سے ملنا برتنا پڑتا ہے۔ اب بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے چاہیے ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے مانگ لی جاتی ہیں۔ پھر استعمال کے بعد لوٹا دی جاتی ہیں۔ یہ دکھاوے کی نمازوں والے لوگ اس قابل بھی نہیں رہتے کہ یہ عام برتنے کی چیزیں بھی انسانوں کے ساتھ برت لیں۔ یہ کسی کا حق تو کیا دیں گے یہ مانگنے پر برتنے کی چیز بھی دینے کے

رواداری نہیں۔ یہ کیسے انسان ہیں جنہیں کسی دوسرے کے حال کی خبر ہی نہیں۔ کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہی نہیں ہیں۔

ہم آج جس معاشرے کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اس نئی روشنی کے اندھیر دیکھو کہ برتنے کی چیزیں تو دوسرے کو کیا دیں گے اب تو پڑوسی ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ اس نئی تہذیب نے انسانوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ ساتھ والے گھر میں کون رہتا ہے اس کے حالات کیسے ہیں وہ بے بس اور مجبور تو نہیں ہے۔ ایک گھر میں شادی ہے دوسرے میں موت ہو جاتی ہے لیکن کسی کو ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے سروکار نہیں ہے۔ ایک گھر میں فاقے ہیں جبکہ پڑوسی کے کتے بھی بسکٹ اور مکھن کھا رہے ہیں۔ اس رئیس کو خبر ہے کہ پڑوس میں انسان بھوکے بیٹھے ہیں نہ ان غریبوں کو خبر ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

خلاصہ:

سورۃ الماعون میں یہی بات زیرِ بحث لائی گئی ہے کہ لوگ ماننے کا زبانی اقرار تو کرتے ہیں لیکن مانتے نہیں ہیں۔ قیامت کے قائل نہیں ہیں اگر ہوتے تو محض دنیا کی چھینا جھپٹی میں نہ لگے رہتے۔ یہ ساری عمر اس پر نہ ضائع کرتے کہ دوسروں کا مال چھین لیں، فلاں عہدہ لے لیں فلاں کی عزت چھین لیں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق چھین لیں۔ ایسے لوگوں کی عبادت بھی دکھاوے کی ہوتی ہے جو اُن کے کردار کی اصلاح نہیں کرتی۔ ان کی پیشانیاں خاک آشنا تو ہوتیں ہیں لیکن عظمتِ الٰہی سے آشنا نہیں ہوتیں۔ یہ دکھاوے کے سجدے ہیں۔ اگر اللہ کے لیے ہوں تو اتباع نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام نصیب ہو جائے۔ ایثار کا جذبہ نصیب ہو جائے۔ ورنہ تو دنیا میں اتنا حسن اور اتنی لذتیں ہیں کہ لوگ اللہ جلّ شانہٗ کے جمال کو چھوڑ کر دنیا پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ جس نے انسانوں سے اللہ کی بارگاہ چھڑا دی تو وہ کم لذیذ تو نہیں ہے! سوال یہ ہے کہ کیا واقعی دنیا میں اتنی لذّت ہے کہ یہ جمالِ باری سے محروم کر دے؟ ہرگز نہیں! جمالِ باری کے مقابلے میں دنیا میں لذّت نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جسے جمالِ باری سے آشنائی نہ ہو وہ دنیا پر فدا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی لذّتوں کا اسیر ہونے سے بچنے کے لیے اللہ سے آشنائی چاہیے، جب کلمہ پڑھے تو اسے پتا چلے کہ اللہ کو ماننے میں کیا لذّت ہے، کیسی شیرینی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی لے تو اسے نام لینے کی مٹھاس اور لذّت محسوس ہو۔ ورنہ زبانی باتوں سے فائدہ نہیں ہوتا جب تک وہ لذّت نہ آئے۔ وہ لذّت حاصل ہوتی ہے برکاتِ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اور اسے حاصل کرنے کی استعداد اللہ کریم نے انسانوں کو عطا کر دی ہے۔

ہر سینے میں ایک چراغ ہے، اس میں تیل اور بتی بھی ہے لیکن اسے دیا سلائی کون دکھائے گا؟ اس کام کے لیے اللہ کریم نے انبیاؑ کو مبعوث فرمایا۔ ایسے انسان ازل سے چن کر پیدا فرمائے جن کے قلوب ازل سے جمالِ الٰہی

سے آشنا تھے اور انہیں دنیا میں آ کر کسی استاد سے سیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ انہیں کسی عالم سے پڑھنے کی ضرورت تھی نہ کسی صاحبِ حال سے توجہ لینے کی ضرورت تھی۔ انہیں ازل سے ہی وہ نورِ نبوت نصیب تھا۔ چونکہ انسانی عقل، شعور اور انسانی استعداد مخلوق ہے اور خالق مخلوق کی رسائی سے بالاتر ہے۔ انسانی عقل و شعور کی حد ہے چنانچہ جو چیز مخلوق کے شعور کی حد میں سما جائے وہ بھی مخلوق ہوگی۔ لہٰذا اللہ کریم کا جمال اور معرفت پانا انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ چنانچہ انبیاؑ کو نورِ نبوت، دردِ دل، وہ لذّتِ آشنائی کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ جو بھی نبیؑ کا دامن تھام لے تو نبیؑ میں وہ قوت ہوتی ہے کہ اس کا دل روشن کردے۔ اُسے جمالِ باری کی لذّت آئے، اُس کا ادراک اور شعور ہو۔ جب انسان کلمہ پڑھے تو اس کا منہ شیرینی سے بھر جائے۔ جب درود پڑھے تو بادِ سحر چلے۔ جب خیال کرے تو جہاں بھر کے عطر اس پر قربان ہو جائیں۔ یہ اسلام ہے۔ اب اگر کوئی اس لذّت سے آشنا ہی نہ ہو تو وہ دنیا میں ہی کھو جائے گا۔ سارے نبیؑ اللہ کے نبیؑ تھے اور اُن میں یہ قوت تھی کہ وہ دلوں کو روشن کردیں۔ سب انبیاؑ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایمان لانے والے صحابیؓ کہلائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سارے زمانوں کے لیے، ساری انسانیت کے لیے ہوئی۔ شرفِ صحابیت کی شرط صرف ایک نگاہ تھی کہ حالتِ ایمان میں کسی کو ایک نگاہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیب ہوگئی یا کسی کی نگاہ حالتِ ایمان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ عالی پر پڑ گئی۔ صحابیؓ کی عظمت یہ ہے کہ اگر سارے انسان ولی بن جائیں اور اُن کی ولایت کا مینار بنایا جائے تو صحابیؓ کے خاکِ پا کو نہیں پہنچتا۔ ولایت جتنی بھی بلند ہو جائے، ولایت ہی رہے گی، صحابیت نہیں بنتی۔ صحابیؓ صرف رتبے میں بلند نہیں ہو جاتا بلکہ عقیدے، ایمان، یقین، عادات و خصائل اور مزاج ہر چیز میں بہت بلند ہو جاتا ہے۔ ایک نگاہ کی بات تھی جو نصیب ہوگئی اور دل میں وہ روشنی پیدا کر گئی کہ اللہ کا نام لینے کی لذّت کا پتا چل گیا۔ ایمان کی حلاوت چکھ لی، رکوع سجود میں خشوع خضوع اور لذّتیں نصیب ہونے لگیں۔ نیکی کی مٹھاس اور گناہ کی کڑواہٹ محسوس ہونے لگے۔ بتقاضائے بشریت گناہ ہو گیا تو ایسا لگتا کہ منہ میں انگارہ لے لیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں میں مبعوث ہوئے وہ معاشرہ انتہائی بگڑا ہوا تھا۔ بعثتِ عالی سے پہلے وہاں ہر جرم پایا جاتا تھا۔ بات بات پر قتل کر دینا، شراب پینا جوا کھیلنا، چوری ڈاکا، ایک دوسرے کا مال لوٹنا عمومی زندگی تھی۔ بعض قبائل بطورِ روزگار ڈاکا زنی کرتے تھے لیکن عرب قوم بڑی عجیب تھی۔ اسی لیے اللہ کریم نے اکثر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اس کے گرد و نواح میں پیدا فرمایا۔ اس قوم کا مزاج یہ تھا کہ اگر بات نہیں مانتے تھے تو پھر نہیں مانتے تھے اور اگر مان لیتے تو ماننے کا حق ادا کر دیتے تھے۔ اس طرح کے لوگ بہت ہی کم تھے جو زبانی مانتے اور دل سے انکار کرتے ہوں۔ وہی لوگ جو چھین کر کھانے کے عادی تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایمان لائے تو انہوں نے ایثار کا حق ادا کر دیا۔ ایک واقعہ مشہور ہے جس میں ایک صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک میدانِ جنگ میں ایک زخمی ساتھی کی آواز آئی وہ پانی مانگ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ میں پانی لے کر اس کے قریب گیا تو دوسرے زخمی نے بھی پانی مانگا۔ پہلے زخمی نے کہا کہ پہلے دوسرے کو دے آؤ۔ دوسرے کے قریب پہنچا تو ایک تیسرے زخمی کی آواز آئی اس نے بھی پانی مانگا تو دوسرے نے کہا پہلے اُدھر جاؤ۔ میں تیسرے کے پاس پہنچا تو وہ شہید ہو چکا تھا، واپس پلٹا کہ دوسرے کو پلا دوں لیکن وہ بھی شہید ہو چکا تھا پھر پہلے کے پاس پہنچا تو وہ بھی شہید ہو چکا تھا۔

یہ لوگ کہاں سے چلے اور کہاں پہنچ گئے کہ نزع کے عالم میں بھی پانی کا گھونٹ ایثار کرنے والے بن گئے۔ انہوں نے اللہ کو ماننے کا حق ادا کر دیا۔ جو اسلام آج ہم نے اپنا رکھا ہے اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہمارا نظامِ ریاست اسلامی نہیں ہے۔ معاشی تعلیمی، عدالتی، کسی نظام میں اسلام کا نشان نہیں ہے۔ یہ ریاست کا حال ہے جبکہ ہمارا ذاتی حال یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تسبیح اُٹھائے پھرتے ہیں، تبلیغ کرتے پھرتے ہیں لیکن سود بھی کھا لیتے ہیں جھوٹ بھی بول لیتے ہیں، لوگوں کا حق بھی مار لیتے ہیں، برائی بھی کر لیتے ہیں اور مسلمان بھی ہیں۔ درحقیقت اس کردار کا سبب قیامِ قیامت پر اعتماد میں کمی ہے۔

ایمان کا تقاضا تو یہ تھا کہ نیکی میں لطف آئے اور گناہ بے قرار کر دے لہٰذا انسان نیکی کی طرف تو ایسے لپکے جیسے بہت بڑی دولت اور نعمت ہو۔ اُسے پانے کے لیے جان لڑا دے۔ اور گناہ سے ایسے بھاگے جیسے بندہ آگ سے بچتا ہے۔ یہ دولت، یہ نعمتیں آج بھی بٹ رہی ہیں اور قیامت تک تقسیم ہوتی رہیں گی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت قیامت تک ہے۔ اللہ کریم نے جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔ اس کی حفاظت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن محفوظ رہے گا، اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا۔ اس کو جاننے والے لوگ بھی رہیں گے، اس کی تفسیر جاننے والے بھی رہیں گے۔ اس پر عمل کرنے والے بھی رہیں گے۔ جن کے سینوں میں قرآن ہوگا وہ لوگ بھی ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کریم ایسے تمام لوگوں کو محفوظ رکھیں گے جن کا قرآن کے ساتھ عقیدے، علم اور عمل کا رشتہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا کلام بندوں تک پہنچایا، اس کے مفاہیم اور برکات پہنچائیں اُن کے دلوں کو روشن کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کیا عجیب لوگ تھے جو دنیا سے تو گزر گئے لیکن موت اُن کی زندگی نہ چھین سکی۔ مر کر بھی زندہ رہے جن کی قبور بھی ذکرِ الٰہی سے روشن ہیں۔ وہ دین کی، قرآن کی حفاظت کا حق ادا کر گئے۔ یہی روشنی، برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک سینہ بسینہ دلوں کو منور کرتی رہیں گی۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم اس کی حفاظت کی کتنی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی کا حساب کرنا چاہیے کہ آج فرصت ہے۔ اللہ نے تو اس کی ہمہ رخ

حفاظت فرمائی ہے۔اللہ نے تو ایسے بندے رکھے ہیں جو قرآن کو مانتے ہوں، جانتے ہوں اس کو بیان کرتے ہوں۔ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا ہم ساری زندگی اسی بات پر لڑتے رہیں گے کہ میں امیر ہو جاؤں، مجھے فلاں نوکری مل جائے، فلاں عہدہ مل جائے؟ کیا ہم دنیا کی چھینا جھپٹی میں ہی لگے رہیں گے؟ کہاں تک دنیا لے جائیں گے! ایک چھوٹی سی بیماری آجائے ساری لذتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ موت کی تلخی سب لذتیں مٹا دیتی ہے۔ ساری عمر کی جمع پونجی، دوسروں کا مال بن جاتی ہے۔ عالیشان محلات، قیمتی گاڑیاں، نرم بستر چھوڑ کر خاک کی خوراک بننا پڑتا ہے۔ پھر کیا وہ زندگی بہتر نہیں ہے کہ آنکھ بند ہو تو جنت میں آنکھ کھلے؟ وہ نعمتیں جو دنیا میں نایاب اور انمول ہیں وہ قبر میں میسر ہوں؟ جن نعمتوں کا دنیا میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہے وہ بعد از وفات نصیب ہو جائیں؟ اصل مزہ تو یہ ہے۔ اللہ کریم کی بارگاہ کی راہ روشن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوضات و برکات قیامت تک کائنات میں تقسیم ہوتے رہیں گے۔ ایسے خادمانِ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک چلیں گے جو دلوں کو روشنی بانٹتے رہیں گے، دردآشنا کرتے رہیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال عرض کیا گیا کہ قیامت کب قائم ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حَتّٰی لَا یُقَالَ اَللّٰہ اَللّٰہ (رواہ المسلم) (او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہیں رہے گا۔ قیامت قائم ہو جائے گی۔

اس کا مطلب ہے کہ برکاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام، ذکرِ قلبی، ذکرِ الٰہی اس کائنات کی حیات ہے۔ جیسے ہر جسم میں ایک زندگی ہے اس کائنات کی زندگی اللہ کا ذکر ہے جس دن ذکر اللہ کرنے والے نہیں رہیں گے اس کی حیات نہیں رہے گی تو یہ ختم ہو جائے گی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دنیا میں اہل اللہ ہیں جو برکات نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام تقسیم کر رہے ہیں۔ اب یہ ہماری طلب کی بات ہے کہ ہم کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ کون سی نعمت لینا چاہتے ہیں! آج اللہ کے بندے موجود ہیں لیکن ہم کہیں کھو گئے ہیں۔ ہماری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ ہم محض دنیا کے پیچھے عمریں ضائع کر رہے ہیں اس چیز کو تلاش ہی نہیں کر رہے۔ اللہ کریم ہمیں ہدایت نصیب فرمائے، توبہ کی توفیق نصیب فرمائے اور توبہ قبول فرمائے۔ اللہ کریم ہمارے گناہ معاف فرمائے اور برکات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہمارے سینے روشن فرمائے۔ یاد رہے یہ تعلق مع اللہ، تعلق مع الرسول اللہ، آخرت پر پختہ ایمان محض یومِ ولادت کے جشن منانے سے، ڈھول بجانے میں نہیں ہے اس تعلق کی شہادت کردار سے ملے گی۔ جتنا کسی کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگا اتنا اس کا کردار سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوگا۔ اتنا ہی اس کا تعلق اللہ سے ہوگا۔ ورنہ دکھاوے کے لیے کچھ کرنا بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوگا۔

سورۃ الکوثر رکوع 1 آیات 1 تا 3

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③

(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی ﴿۱﴾ تو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیا کریں ﴿۲﴾ یقیناً آپ کا دشمن ہی بے اولاد رہے گا ﴿۳﴾

تفسیر و معارف

سورۂ کوثر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

خیرِ کثیر:

فرمایا: اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① ''(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی۔'' مفسرین کرام کے مطابق کوثر جنت کی ایک نہر ہے۔ اور وہ حوض ہے جس پر قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی سیراب ہونے کے لیے آئیں گے۔

اس سے مراد خیرِ کثیر بھی ہے۔ خیرِ کثیر میں ہر طرح کی بھلائی آجاتی ہے۔ دنیا و آخرت میں جو بھی بھلائی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دی گئی۔ قرآنِ حکیم کی دوسری آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ: 3) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی'' یعنی بندہ، اللہ کریم سے جتنی نعمتیں لے سکتا ہے۔ جتنی عطائے باری ہو سکتی ہے وہ ساری اس دین میں سمو دی گئی۔ یہاں بھی علمائے حق کے نزدیک نعمتی سے مراد خیرِ کثیر ہے۔ کسی بھی طرح کی بھلائی جسے خیر کہا جاتا ہے وہ ساری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں سمو دی گئی ہے۔

آج دنیا مادّے کی لپیٹ میں ہے۔ طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوئیں اور سب کی بنیاد مادّی مال و دولت

ٹھہری کہ ساری سہولتیں، ساری آسانیاں، سارے آرام اس کے لیے ہیں جس کے پاس دولت ہے۔ ابھی نہ جانے مزید اور کتنی ایجادات ہوں گی، اللہ کریم ہی بہتر جانتے ہیں لیکن ہر چیز اپنے انجام سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر کسی نے بہت سا مال جمع کر لیا اور وہ مال اسے ابدی زندگی میں جہنم لے جانے کا سبب بن گیا تو اس میں خیر کہاں؟ اگر کسی نے حکومت حاصل کر لی، اقتدار حاصل کر لیا لیکن وہ اسے آخرت کے عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن گیا تو اس میں خیر کا تصور کہاں ہے؟ وقتی اور لمحاتی لذتوں کا اعتبار نہیں، نتائج کا اعتبار ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے کہ ہر طرح کی خیر، ہر طرح کی بھلائی، اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ اگر تم اپنی بھلائی چاہتے ہو تو سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کے کہیں اور نہیں ملے گی۔ اگر تم اولاد کی بھلائی چاہتے ہو، کنبے، خاندان کی بھلائی چاہتے ہو، ملک وقوم کی، تمام انسانیت کی بھلائی چاہتے ہو تو کوئی بھی بھلائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے باہر نہیں ہے۔ اس دنیا کی بھلائی ہو یا آخرت کی!

اس کے برعکس صرف محرومی ہے اور کفر سب سے بڑی محرومی ہے۔ کافر دنیا کو محض دنیا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی نظر دنیوی نتائج پر ہوتی ہے۔ کافر کی پیروی میں اس کے اثرات ہمارے ہاں بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ باوجود مسلمان ہونے کے ہمیں بھی یہ حسرت ہے کہ فلاں پر اللہ کا بڑا احسان ہے، اس کے پاس دولت ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ہندو کے کاروبار میں بڑی برکت ہے۔ یہ غیر اسلامی تصورات ہیں۔

مومن بستا تو اسی دنیا میں ہے۔ اسی آب وہوا میں اور اسی زمین پر جیتا ہے لیکن ایمان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی جنت میں رہتا ہے۔ اس کا عقیدہ ونظریہ اسے سکون دیتا ہے۔ اس کا کردار اسے سکون دیتا ہے۔

اسی زمین پر کافر بھی بستا ہے۔ وہ دولت کما لے، حکومت بھی لے لے، لیکن وہ سکون نہیں پا سکتا۔ ایک بے قراری، ایک بے چینی اس کا مقدر ہوتی ہے۔ مزاجِ انسانی نتائج کے اعتبار سے قرار پاتا ہے۔ ہر چیز کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ کوئی کام بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کا بھی ایک نتیجہ، ایک ماحصل اور انجام ہے۔ وہ انجام ہے دارالآخرت، ہمیشہ کا گھر۔ جیسا آخرت کا گھر ہوگا ویسا اثر دنیوی زندگی پر آئے گا۔ خلافِ اسلام زندگی ایسے ہے جیسے کوئی دہکتی آگ پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ دولت بھی جمع کر لے، قیمتی لباس بھی خرید لے اچھی گاڑیاں بھی رکھ لے اسے آگ پر سکون نہیں مل سکتا، آرام نہیں مل سکتا۔ طرح طرح کی بے چینیاں، بے قراریاں اور طرح طرح کی مصیبتیں اسے گھیرے رہتی ہیں۔

فرمایا، سارا چین، سارا سکون، سارا آرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت سے وابستہ ہونے میں ہے۔ اللہ نے ساری خیرِ کثیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دی۔ کل انسانیت کو وہیں سے تقسیم ہو رہی ہے، وہیں

سے ہوتی رہے گی! فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② تو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیا کریں۔

فرمایا، جب ربِ کریم نے، اس عطا کرنے والے نے اتنی بڑی نعمت عطا کردی جس کی مثال نہیں ملتی تو پھر ضروری ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے۔ اور قربانی کی جائے۔ اونٹ کے پاؤں باندھ کر حلقوم میں نیزہ مار کر خون بہا دینا، جس سے وہ گر جاتا ہے پھر ذبح کر لیتے ہیں۔ یہ اونٹ کی قربانی کا ایک انداز ہے جسے نحر کہتے ہیں۔ نزولِ قرآن عرب میں ہوا۔ عربوں کے ہاں اونٹ قیمتی اثاثہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اچھا اور خوبصورت مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ ہم جو قربانی عیدِ قربان پر کرتے ہیں یہ سنتِ ابراہیمی اس اعتبار سے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی اور قربانی دینے کی یہ بنیاد پڑی۔ ورنہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیہء مبارکہ میں قربانی کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ قربانی کی بلکہ حجۃ الوداع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سو (100) اونٹ قربان فرمائے۔ جن میں سے تریسٹھ (63) اونٹ اپنے دستِ اقدس سے نحر کیے اور حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ باقی آپؓ کردیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی اس قدر پسند تھی کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علیؓ کو وصیت فرمائی کہ جب تک زندہ رہو، اپنی قربانی کے ساتھ میرے لیے بھی ایک قربانی کیا کرو۔

یہاں عمومی مراد یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں دنیا کے مفادات رکاوٹ نہ بنیں بلکہ دنیا کا عزیز ترین مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے جس کی صورت عیدِ قرباں کی قربانی کی صورت بنی۔

رحمتِ حق بہا نہ می جوید رحمتِ حق بہانہ می جوید

یعنی اللہ کی رحمت کسی بہا، کسی قیمت کی طلبگار نہیں۔ وہ تو رحمت لٹانے کا بہانہ چاہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد عطا ہوئی۔ اسمٰعیل علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا جو خود نبی اور رسول علیہ السلام تھے جن کی پیشانی میں نورِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ گر تھا تو وہ بچہ کتنا حسین، کتنا پیارا ہوگا! اللہ کریم نے اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم دیا تو باپ بیٹے نے تعمیلِ ارشاد کی۔ اللہ نے قربانی قبول فرمائی۔ اسمٰعیل علیہ السلام کی جگہ جنت سے ایک مینڈھا بھیج دیا۔ اور ابراہیم علیہ السلام کی چھری کے نیچے سے اسمٰعیل علیہ السلام کو نکال کر مینڈھا رکھ دیا۔ اسمٰعیل علیہ السلام کو بچا لیا۔ ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا (الصّٰفّٰت: 105) ''آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ یعنی آپؑ نے بیٹا ذبح کر دیا باقی ہماری مرضی''۔

یہ کام آسان نہیں ہے۔ اللہ کریم نے اس امت پر یہ آسانی فرما دی کہ اچھا جانور لے کر اللہ کے لیے ذبح کر دو۔ تمہاری نیت، ارادے اور خلوص کے مطابق تمہیں ان برکات میں سے حصہ مل جائے گا جس طرح کی رحمتیں برکتیں اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرتے وقت ابراہیم علیہ السلام متوجہ ہوئی ہوں گی۔ سنتِ ابراہیمی سے مراد یہ ہے کہ اس فعل

کی ابتدا وہاں سے ہوئی۔ وہ قربانی انتہائے کمال تھا۔ ہمیں یہ حکم دیا کہ تم نقل کرو تو تمہیں ان برکات میں سے اپنی حیثیت کے مطابق حصّہ ملے گا۔ بہتر ہے کہ قربانی کا جانور خود ذبح کرے لیکن اگر خود ذبح نہیں کر سکتا تو ذبح کے وقت پاس کھڑا ہو تو جو انوارات اس وقت نازل ہوتے ہیں وہ نصیب ہوں۔

آج جو دین کا اور ارکانِ دین کا مذاق اڑائے وہ بڑا مہذب اور تہذیب یافتہ کہلاتا ہے۔ اس کا آخرت میں تو پتا چلے گا ہی اس دنیا میں بھی پتا چلتا رہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگیاں ویران، بے سکون اور دکھوں سے پُر ہوتی ہیں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳ ''یقیناً آپ کا دشمن ہی بے اولا د رہے گا۔''

اس آیت میں کفار کے طعنوں کا جواب ہے۔ مشرکینِ مکہ سے جب کچھ نہ بن سکا اور وہ اسلام کی راہ نہ روک سکے تو پھر ایک دوسرے کو تسلی دینے کے لیے کہتے تھے کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ تو ہے نہیں۔ جب دنیا سے اٹھ جائیں گے تو ان کا نام ختم ہو جائے گا۔ ہر بندے نے جانا ہے۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی یہ سارا کچھ مٹ جائے گا۔

اللہ کریم نے فرمایا، مٹنے کے لیے کفر ہے، تم ہو، یہ کہنے والے ہیں۔ جو بھی میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کرے گا مٹ جائے گا۔ محلات کھنڈر ہو جائیں گے۔ گھر ویران اور نسلیں تباہ ہو جائیں گی۔ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی قیامت تک گونجتا رہے گا۔ اسلام میں داخلے کا دروازہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پنج وقتہ نمازوں کا حصّہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صلوٰۃ، درود و سلام سے مزّین۔ درود و سلام عبادات کا حصّہ، قبولیتِ دعا کے لیے اکسیر اور دنیا و آخرت کی بھلائی کے لیے بہترین وظیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود!

جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کرے گا وہ مٹ جائے گا، تباہ ہو جائے گا، اس کا کچھ نہیں بچے گا۔ پندرہ صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ بربادی ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے حصّے میں آئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے والے مر کر بھی جیت گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں نے مر کر موت کو بھی شکست دے دی۔ وہ مر کر بھی زندہ ہو گئے۔

اس مختصر سی سورت میں بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات طے کر دی گئی کہ ہر طرح کی بھلائی، وہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، ذاتی ہو یا خاندانی، قومی ہو یا بین الاقوامی۔ ہر بھلائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور غلامی میں ہے۔

جو قدم جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے باہر اٹھتا ہے وہ سراسر نقصان ہے۔ اللہ ہمیں توفیق دیں کہ ہم حقِ غلامی ادا کریں۔ یہ توفیق دیں کہ اپنا جائزہ لے سکیں کہ ہم کتنی اطاعت کر رہے ہیں اور کتنا وقت ضائع کر رہے ہیں!

سورۃ الکٰفرون رکوع 1 آیات 1 تا 6

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾ لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾

کہہ دیجیے اے کافرو! ﴿۱﴾ نہیں عبادت کرتا میں ان (بتوں) کی جن کی تم عبادت کرتے ہو ﴿۲﴾ اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے ﴿۳﴾ اور جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں ﴿۴﴾ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں ﴿۵﴾ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ﴿۶﴾

تفسیر و معارف

سورۂ کافرون مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ مکی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

ارشادِ باری ہے قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ ''کہہ دیجیے اے کافرو! لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ ''نہیں عبادت کرتا میں ان (بتوں) کی جن کی تم عبادت کرتے ہو''یعنی جن کی تم پوجا کرتے ہو میں کبھی بھی ان کی پوجا نہیں کرسکتا۔

ہوا یہ کہ مشرکینِ مکہ نے جب دیکھا کہ یہ ایک موومنٹ (MOVEMENT) ایک تحریک بن گئی ہے اور لوگ ہزار رکاوٹوں کے باوجود، ڈھائے گئے مظالم سہنے کے باوجود، سختی کے باوجود بھی اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں اور جو قبول کرتے ہیں وہ چھوڑتے بھی نہیں تو اُنہوں نے سوچا کہ کوئی سمجھوتے کی راہ نکالنی چاہیے۔ بارگاہِ رسالت پناہی میں

حاضر ہوئے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ربّ کی عبادت کرتے ہیں کرتے رہیے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ مانتے ہیں مانیے لیکن ہمارے معبودوں کو، ہمارے بتوں کو غلط کہنا چھوڑ دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ربّ کے ساتھ خوش رہیں۔ ہمارے اپنے رب ہیں، ہمارے اپنے معبود ہیں، ہمیں ہمارے معبودوں کے ساتھ رہنے دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق کو حق کہنا تب ہی سچ بنتا ہے جب باطل کو بھی باطل سمجھا جائے۔ اگر باطل کا رد نہ کیا جائے تو پھر حق ثابت نہیں ہوتا۔ رات کو رات نہ مانا جائے۔ دن بھی، رات بھی، برابر ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ رات کو رات مانا جائے گا۔ کفر کو کفر کہا جائے گا۔ غلط کو غلط کہا جائے گا۔ اسلام اور کفر میں سمجھوتا ممکن نہیں۔ آج کل ایک تحریک چل رہی ہے اور بڑے بڑے مشہور لوگ اس کا حصّہ ہیں، اس تحریک کا کہنا ہے کہ اصل مذہب تو انسانیت ہے۔ انسان سب سے اُوپر ہے۔ ظالموں کو یہ نہیں پتا کہ انسانیت، اسلامی عقائد اور دینِ اسلام کا ایک جزو ہے۔ انسان کا مقام، انسانی حقوق، انسانی عظمت کس نے بیان کی ہے؟ کیا یہ انسانیت ہے کہ انسان کو بتوں اور جانوروں کے آگے جھکا دیا جائے؟ انسان انسانی عظمت چھوڑ کر بندروں اور کتوں بلیوں کی پوجا کرتا پھرے، یہ انسانیت ہے؟ پھر یہ کونسی انسانیت ہے کہ کچھ لوگوں کو تو آپ سر پر اٹھالیں اور باقی کے ساتھ ظلم ہوتا رہے؟ انسانی اقدار اور انسانی معیار تو اسلام نے ہی مقرر کیے ہیں کہ ہر انسان کا کیا حق ہے اور ہر انسان پر کیا فرض ہے اور کون یہ حقوق و فرائض مقرر کرے گا؟ میں کروں گا تو میری اپنی پسند ہوگی۔ شاید آپ کی پسند مجھ سے نہ ملے۔ آپ کریں گے تو آپ کی اپنی پسند ہوگی۔ کوئی اور آپ سے متفق نہ ہو۔ ہر فرد کی اپنی سوچ ہوگی۔ یہ حقوق و فرائض کا تعین وہی ہستی کرسکتی ہے جو انسان کی خالق ہے، جس نے انسان کو انسان پیدا کیا ہے۔ اسی کو زیبا ہے کہ وہ اس کے حق میں فیصلے کرے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور اس کے حقوق کیا ہیں اور اسی کو انسانیت کہا جاتا ہے۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جھوٹ ہے ہی کوئی نہیں۔ دونوں سچ ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جھوٹ کو جھوٹ کہا جائے گا تب سچ ثابت ہوگا۔ ایک خبر سچ ہے ایک جھوٹ ہے۔ اب جھوٹ کو بھی مانا جائے گا کہ یہ بھی جھوٹ نہیں ہے اور یہ بھی سچ ہے یعنی جو جھوٹ نہیں ہے وہ سچ ہے۔ دو سچ کیسے ہوگئے؟ آج بھی کفار کو یہی شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں

"ISLAM CLAIMS TO HAVE MONOPLY OVER THE TRUTH"

کہ اسلام کی سچائی پر اجارہ داری ہے۔ اجارہ داری یا MONOPLY ناجائز قبضے کو کہتے ہیں۔ زبردستی کسی چیز پر قبضہ کرلینا۔ اس نے اجارہ داری بنالی ہے یعنی غلط طریقے سے قابض ہوگیا تو ان کا خیال ہے کہ اسلام ساری سچائی پر قبضہ جمائے ہوئے۔ ہے یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "ISLAM IS THE ONLY TRUTH"۔

اسلام ہی ایک حقیقت ہے اور سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ جھوٹ ہوتی ہیں۔ کوئی زیادہ جھوٹ کوئی تھوڑا جھوٹ۔ لیکن ہوتا جھوٹ ہی ہے۔ اور اسلام کی ابتدا لَآ سے ہوتی ہے۔ لَآ اِلٰہَ۔ کوئی عبادت کے لائق ہے ہی نہیں۔ کوئی اس قابل ہے ہی نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے کوئی معبود نہیں، کوئی بھی خالق، مالک، رازق نہیں۔ کوئی کچھ ہے ہی نہیں اسلام شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ پہلے سب کی نفی کر دو، کوئی نہیں رہا۔ لوحِ دل صاف ہوگئی، اب اس پر لکھو کہ! اللہ ہے۔ وہ اکیلا ہے وہ واحدہ لاشریک ہے۔ کوئی اُس جیسا نہیں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو لا نافیہ سے شروع ہوتا ہے یعنی پہلے ہر قسم کے کفر وشرک کی تردید کرو۔ کوئی اس قابل ہے ہی نہیں۔ جب کوئی بھی نہیں رہا تو اب اس پر لکھو اِلَّا اللّٰہ ہاں اللہ ہے۔ بندے نے یہ حقیقت کہاں سے جانی؟ کیا دلیل ہے اس کی کہ صرف اللہ ہے باقی کوئی نہیں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ یہ خبر ہمیں اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔

آج کل بھی یہ موومنٹ چل رہی ہے اتحاد بین المذاہب کے نام سے اس پر کمیٹیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ اسلام نے پہلے ہی کہا ہے کہ کسی مذہب پر کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ جو شخص جو عقیدہ چاہے اسے وہ عقیدہ رکھنے کا اختیار ہے اس عقیدے کے مطابق اس کے اپنے حقوق ہیں۔ اس کی جان، مال، آبرو کا تحفظ کیا جائے گا کسی پر زبردستی کوئی عقیدہ نہیں ٹھونسا جائے گا۔ اللہ کریم نے ہر فرد کو دو حق دیے ہیں۔ ایک زندہ رہنے کا اور ایک عقیدہ رکھنے کا۔ قرآنِ کریم میں انبیاؑ کے جہاں تذکرے آتے ہیں تو تقریباً ہر نبیؑ کے ذکر کے ساتھ یہ آتا ہے کہ آپ ان پر دین مسلط نہیں کر سکتے۔ زبردستی نہیں منوا سکتے۔ آپ کا کام ان تک دین کی بات پہنچانا ہے آگے معاملہ میرا اور میرے بندے کا ہے۔ وہ مانے گا تو معاملہ میرے ساتھ ہے۔ انکار کرے گا تو جواب میرے سامنے دے گا۔ آپ میرا پیغام پہنچا دیجیے۔ میں جانوں میرے بندے جانیں تو زبردستی کسی سے نہیں منوایا جا سکتا۔ حقیقی اتحاد بین المذاہب یہ ہے کہ حق' حق ہے اور باطل' باطل ہے لیکن کسی کے غلط عقیدے کی بنیاد پر اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی عزت، جان، مال، آبرو کو نہیں لوٹا جا سکتا۔ اس کے انسانی حقوق بحال ہیں۔ اگر اسلامی ریاست میں رہتا ہے تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس کے سارے حقوق کا تحفظ کرے لیکن اس کے غلط عقیدے کو سچ نہیں مانا جائے گا۔ سچ ایک ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر ایک سیدھا خط بنایا اور اس میں سے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے بے شمار خط نکالے۔ فرمایا، یہ جو سیدھا خط ہے، یہ اللہ کا دین ہے۔ کوئی دائیں نکل گیا کوئی بائیں نکل گیا سب بے دینی ہے۔

باطل کو باطل نہ کہنا اسے قبول کرنا ہے:

فرمایا، انہیں بڑا واضح اعلان کر دیجیے کہ اے کافرو! لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۝۲ نہیں عبادت کرتا میں ان (بتوں) کی جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

فرما دیجیے میں تو مؤحد ہوں میں تو اللہ کا رسولؐ ہوں میں تو خلقِ خدا کو توحید کی دعوت دینے والا ہوں لہٰذا مجھ سے یہ اُمید نہ رکھو کہ میں تمہارے بتوں کا اقرار کرلوں گا یا اُن کی تردید نہیں کروں گا۔ اگر اُن کی تردید نہیں کرتا ہوں تو یہ بھی تو اُن کی پوجا کا ایک انداز ہے۔ غلط کو غلط نہ کہنا بھی تو اسے ٹھیک ماننا ہی ہے۔ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ۝۳ ''اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔'' اور جب تک تم اس کفر و شرک میں مبتلا ہو اور اس سے توبہ کر کے پاک نہیں ہوتے تمہیں میرے پروردگار کی عبادت نصیب نہیں ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تم بتوں کی پوجا بھی کرو بتوں سے امیدیں بھی رکھو اور کہو کہ ہم اللہ کو بھی مانتے ہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ دو باتیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ وہ کیا خوب کہا تھا اس پنجابی شاعر نے کہ:

مومن ہرگز ہوندا نئیں دو دھراں دا سانجھا
یکے جوگا راسی ہیرے راسی یا کھیڑے راسی

یہ ایمان نہیں ہے کہ یہ بھی سچ ہے وہ بھی سچ ہے۔ سچ ایک ہے اس کے علاوہ سب جھوٹ ہے۔ فرمایا، مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں بتوں کی تردید نہیں کروں گا۔ تردید نہ کرنا بھی ایک درجے میں قبول کرنا ہے۔ کفار کا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کو مان لیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کی تردید نہ کریں۔ فرمایا تردید نہ کرنا بھی ایک درجے میں مان لینا ہے لہٰذا میں تو ڈٹ کر تردید کروں گا کہ یہ کفر ہے شرک ہے۔ یہ پتھر ہیں بے اثر ہیں، کوئی چیز نہیں ہیں۔ لہٰذا مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں ان کی تردید نہیں کروں گا اور تم جب تک کفر و شرک میں مبتلا ہو تم توحید کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتے۔ جس کی میں عبادت کرتا ہوں اُس کی عبادت تم نہیں کرسکتے جب تک کفر و شرک سے نکلتے نہیں۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۝۴ ''اور جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں۔'' وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ ۝۵ ''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔''

مجھ سے یہ امید نہ رکھنا کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوتے ہوئے بھی ان بتوں کی تردید نہ کروں گا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمیشہ ان کو رد کرتا رہوں گا یعنی کبھی مجھ سے یہ امید نہ رکھنا کہ میں تمہارے بتوں کی پوجا کروں گا۔ حالانکہ کفار نے پوجا

کرنے کا تو نہیں کہا تھا یہ عرض کیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تردید نہ فرمایا کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تردید نہ کرنا بھی تو ایک درجے میں مان لینا ہے۔ اقرار نہ کرنا لیکن ردّ بھی نہ کرنا مان لینے کے برابر ہے۔ لہٰذا مجھ سے آئندہ بھی کبھی ایسی امید نہ رکھو۔ میں ہمیشہ ان کی تردید کرتا رہوں گا اور تم بھی جب تک شرک میں مبتلا ہو بتوں کو ردّ نہیں کرتے، ان کو چھوڑ نہیں دیتے، ان کی تردید نہیں کرتے تم بھی لذتِ توحید سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ جس کی میں پوجا کرتا ہوں اُس کی عبادت کی لذّت سے تم آشنا نہیں ہو سکتے۔ یعنی عبادتِ الٰہی کی لذّت تب آئے گی جب غیر اللہ سے تمہاری امیدیں منقطع ہو جائیں گی۔

یاد رہے کہ بُت صرف پتھر کے نہیں ہوتے، بے شمار بت ہوتے ہیں۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ کلمہ بھی پڑھتے رہتے ہیں، نمازیں بھی پڑھتے رہتے ہیں لیکن بہت سے خدا بنا رکھے ہیں۔ کسی کی دکان اس کا خدا ہے، کسی کی ملازمت اس کا خدا ہے، کسی کا افسر اس کا خدا ہے یعنی جس سے اُنہوں نے امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ وہی ان کا خدا ہے۔ ایک رسم ہے کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے مسلمانی گلے پڑ گئی۔ اسلام تو یہ ہے کہ امیدیں ساری اللہ سے وابستہ کی جائیں۔ دنیا کے اسباب اختیار کیے جائیں اس لیے کہ اللہ نے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، عقل دی ہے، شعور دیا ہے، ہاتھ پاؤں دیے ہیں، کام کرنے کی استعداد دی ہے تو شریعت کے مطابق وہ کام کیا جائے لیکن اُس پر نتیجہ کیا آئے گا؟ اس کی امید اللہ پر رکھیں۔ کم آئے تو بھی الحمد للہ، زیادہ آئے تو بھی الحمد للہ! یہ نہیں کہ زیادہ آ گیا تو کہا کہ یہ تو میری دانش ہے کم آ گیا تو کہا کہ یہ اللہ کی مرضی۔ نقصان ہو جائے تو کہتے ہیں اللہ نے کر دیا فائدہ ہو تو کہتے ہیں یہ میرا کمال ہے تو فرمایا یہ نہیں چلے گا۔ اُمیدیں اللہ سے وابستہ ہوں گی نتائج اللہ کی طرف سے ہوں گے۔ کاشت کار زمین جوتتا ہے، بیج ڈالتا ہے پانی دیتا ہے، کھاد دیتا ہے، حفاظت کرتا ہے، محنت کرتا ہے اس سے حاصل کتنا ہوگا یہ اللہ کی مرضی۔ یہ بندے کے بس میں نہیں ہے کہ اپنی فصل پر پھل بھی خود لگا لے یہ اس کے بس میں نہیں ہے یہ مالک کی مرضی ہے وہ اپنی مرضی سے دے گا زیادہ دے اُس کا انعام ہے، کم دے اس کا شکر ہے، اور جو وہ دیتا ہے وہی حق ہے۔ جو فیصلے اللہ کریم کی طرف سے ہوتے ہیں اس بندے کے حق میں اُس وقت وہی بہترین فیصلہ ہوتا ہے۔ فرمایا: وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ ''اور جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں۔'' مجھ سے آئندہ بھی کبھی یہ اُمید نہ رکھنا کہ جن کی تم پوجا کرتے ہو میں اُن کی پوجا کروں گا۔ اب یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے پوجا کا نہیں کہا تھا ماننے کا نہیں کہا، بتوں کی عبادت کا نہیں کہا تھا صرف یہ عرض کیا تھا کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کی تردید نہ فرمائیں۔ یہ نہ کہیں کہ یہ باطل ہیں آپ اپنے دین کے مطابق یہ کہتے رہیں اللہ حق ہے، اللہ برحق ہے، اللہ پر ایمان لانا چاہیے لیکن بتوں کو ردّ نہ فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ردّ نہ کرنا بھی ایک درجے میں قبول کرنا ہے۔ لہٰذا یہ دورنگ کا اسلام نہیں ہے۔ حق کو حق تب مانا جاتا ہے جب باطل کو باطل مانا جائے۔ دن تب دن ثابت ہوگا جب آپ رات کو رات مانیں گے۔ آپ کہیں دن، دن ہے لیکن رات بھی خیر ہے ٹھیک ہے۔ جب ٹھیک ہے تو پھر دن میں کیا بچا؟ پھر تو دونوں برابر ہو گئے اور فرمایا کبھی بھی مجھ سے یہ امید نہ رکھنا کہ میں ان کی تردید چھوڑ دوں گا میں ہمیشہ اِن کو ردّ کرتا رہوں گا۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۝ ''اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔'' اور مجھے تم سے کوئی امید نہیں ہے کہ تمہاری امیدیں بتوں سے وابستہ ہوں اور تم میرے پروردگار کی عبادت کی لذت پا سکو یہ ممکن نہیں ہے جب تک ساری اُمیدیں اس ذاتِ وحدہٗ لاشریک سے وابستہ نہیں کرو گے اس کی عبادت کی لذت نہیں پا سکو گے۔ بندہ رسمیں تو نبھا سکتا ہے لیکن عبادت یا عبادت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کو رب بھی مانے۔ رب وہ ہستی ہے جو ہر ضرورت مند کی ہر ضرورت ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں پوری فرماتا ہو تو جب ایک ایسی ہستی جو ہر چیز پر قادر ہے جو ہمہ وقت موجود ہے جس کے خزانوں کی کوئی حد نہیں۔ جس کی عطا کی کوئی حد نہیں۔ ہمہ وقت دینے کے لیے تیار ہے ہمارے بغیر مانگے، ہمارے بغیر جانے ہماری ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ انسان کو نہیں پتا اس کے اپنے وجود کے اندر ایک لمحے میں کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ دس کھرب سیل ہیں ایک وجود میں۔ ایک لمحے میں کتنے نئے سیل پیدا ہوتے ہیں اور کتنے مرتے ہیں گنے نہیں جا سکتے۔ سائنس کہتی ہے کہ کوئی سیل چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ اگر چھ مہینے میں دس کھرب سیل مر جاتے ہیں دس کھرب نئے پیدا ہوتے ہیں تو پھر ضرب تقسیم دے کر نکال لیجیے کہ ایک ایک منٹ میں کتنے سیل مرتے ہیں اور کتنے پیدا ہوتے۔ ایک سیکنڈ میں کتنے مرتے ہیں کتنے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کو کوئی خبر ہے؟ کون موت دے رہا ہے انہیں، کون نئے پیدا کر رہا ہے؟ آنکھ کا نازک ترین آئینہ بھی اُنہی سیلز (CELLS) سے بنا ہے، بہترین کمپیوٹر دماغ کا بھی انہی سیلز (CELLS) سے بنا ہے، ہاتھ اور پاؤں بھی انہی سیلز (CELLS) سے بنے ہیں۔ دل وجگر انہی سیلز (CELLS) سے بنے ہیں۔ کون ہے جو ہر جگہ کے سیل (CELL) بنا کر ہر جگہ فِٹ (FIT) کر رہا ہے۔ نئے بن رہے ہیں پرانے جھڑ رہے ہیں، جو غذا، دوا آتی ہے وہ سیل ہی لے کے آتی ہے۔ اگر اتنی باریکی کا کام انسان کے جانے بغیر وہ کر رہا ہے تو جن چند ضرورتوں کا انسان کو پتا ہے کیا وہ پوری نہیں کرتا! اُن کے لیے بتوں کے

آگے دوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا، اس کفر وشرک کی حالت میں تم کبھی میرے رب کی عبادت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ وہی عبادت کی لذّت پائے گا جو غیر اللہ سے امیدیں وابستہ نہیں رکھتا۔ جو دوسروں سے ساری امیدیں منقطع کر کے اللہ سے وابستہ کرلے گا اسے سمجھ آئے گی کہ دین کیا ہے اور عبادت میں کیا لذّت ہے!

میرا اور تمہارا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا:

فرمایا: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ''تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔'' تمہارے لیے تمہارا دین جس کا انجام ضرور نامرادی ہے اور میرے لیے میرا دین ہے جس کا انجام کامیابی ہے بامراد ہونا ہے اس عالم میں بھی اور اُس عالم میں بھی۔ یہ تمہاری پسند ہے اُس پر رہنا چاہو تو بربادی تمہارا انتظار کررہی ہے۔ اِدھر آنا چاہو تو دو عالم کی کامیابی تمہارے لیے ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ تم بتوں کو بھی مانتے رہو اور توحید سے بھی آشنا ہوجاؤ۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اس وقت کی چلی ہوئی مشرکین وکفار کی تحریک آج بھی زوروں پر ہے اور آج بھی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ سارے ہی حق ہیں۔ سارے کس طرح حق ہیں؟ سارے حق ہیں تو باطل کیا ہے؟

جو باطل کو باطل مانتے ہیں وہ پھر دوسری طرف حد سے گزر جاتے ہیں کہ یہ جو باطل پر ہے اسے گولی ماردو۔ یہ درست نہیں ہے۔ ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ زندگی جس نے دی ہے وہ لے سکتا ہے۔ کوئی قتل کیا جائے گا تو اللہ کے حکم کے مطابق کیا جائے گا۔ جس نے زندگی دی ہے وہ لے بھی سکتا ہے۔ جو زندگی دے نہیں سکتا وہ لے بھی نہیں سکتا۔ انسان اپنی مرضی سے کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ وہ اُس کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ ہر انسان کا دوسرا حق عقیدہ رکھنے کا ہے۔ کوئی پتھر کو خدا مانے، کوئی جانور کو خدا مانے، کوئی شرک کرے یا بت پرستی کرے اسے اس کا اختیار ہے۔ آپ اس کے انسانی حقوق نہیں چھین سکتے۔ اس سے اللہ حساب لے گا، ہاں کفر اور اسلام میں سمجھوتے ممکن نہیں ہیں۔ اسلام، اسلام ہے کفر، کفر ہے۔ وہ اپنے انداز پر زندہ رہے۔ مسلمان اپنے انداز پر زندہ رہے۔ اس میں کوئی لڑائی کی، جھگڑے کی، فساد کی بات نہیں ہے آج کی تو بدبختی یہ ہے کہ مسلمان اب مسلمانوں کو ماررہے ہیں کہ یہ کافر ہے، دوسرا کہتا ہے یہ کافر ہے۔ یہ ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کوئی کسی کافر کو بھی اس لیے قتل نہیں کرسکتا کہ یہ کافر ہے اِسے مار دو۔ اسے کفر پر رہنے کا حق اللہ نے دیا ہے، اس کا حساب اللہ کریم لیں گے بندہ حساب نہیں لے سکتا۔

فرمایا، میرے لیے میرا دین ہے جو سراسر خیر ہے۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے جو سراسر باطل ہے۔

سورۃ النصر رکوع 1 آیات 1 تا 3

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

جب اللہ کی مدد آئی اور فتح (حاصل ہوگئی) ﴿۱﴾ اور آپ نے دیکھا کہ لوگ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں ﴿۲﴾ تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کریں اور اُس سے مغفرت مانگیں بے شک وہ معاف کرنے والا ہے ﴿۳﴾

تفسیر و معارف

سورۂ نصر مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ مدنی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔

ارشادِ باری ہے: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ جب اللہ کی مدد آئی اور فتح (حاصل ہوگئی)

اللہ کریم کی مدد تو ہمیشہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ جب یہ مدد کفار کو بھی نظر آنے لگی کہ واقعی اللہ کی مدد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ جب کفار کو، مخالفین کو، مشرکین کو بھی اس بات کا یقین ہو چکا اور فتح عظیم یعنی فتح مکہ ہوئی۔

قریش ہر لحاظ سے بہت طاقتور تھے۔ مالی اور جنگی اعتبار سے بھی طاقتور تھے اور قبائلِ عرب پر ان کا ایک خاص رعب تھا۔ چونکہ مشرکین میں بھی حج رائج تھا اگرچہ بطور رسم ہی تھا۔ وہ ہر سال مکہ آتے اپنے جاہلیت کے طریقوں کے مطابق حج کرتے۔ اس رسمِ حج میں بھی وہ قریش کے محتاج تھے۔

ان قبائل میں بہت سے ایسے قبائل تھے جو قریش کے ڈر سے اسلام قبول نہیں کر رہے تھے۔ جبکہ بعض متذبذب تھے اور قریش کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قریش عرب کی ایک مسلمہ قوت ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق پر نہیں تو قریش اُن پر غالب آ جائیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے

بے سروسامانی میں قریش کو للکارا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آجاتے ہیں تو پھر حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ پھر اسلام قبول کرلیں گے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جب ہر ایک کو، منکرین کو بھی نظر آنے لگ گیا کہ حق کی فتح ہونے کو ہے۔ اللہ کی مدد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں اور فتح عظیم ہوئی یعنی مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اور قریش کی شوکت ٹوٹ گئی۔ فرمایا: وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ "اور آپ نے دیکھا کہ لوگ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہورہے ہیں۔" یعنی قبائلِ عرب نے اسلام قبول کرنا شروع کردیا۔ جبکہ بعض مفسرین کے نزدیک اس سورت کا نزول فتحِ مکہ سے پہلے ہے۔ بعض اس کا نزول فتحِ مکہ پر لیتے ہیں۔ اس سورت کے نزول کے دوسال بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے اس سے یہ اخذ کیا کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی پیشگوئی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی تکمیل کا ذکر آگیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام مکمل ہوگیا تو پھر یہ دنیا اس قابل نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں قیام فرمائیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس مقصد کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے وہ کارِ عظیم تکمیل کو پہنچ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت بڑا انقلاب برپا کردیا۔ ان آخری دوسالوں میں تقریباً پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام میں داخل ہوگیا۔ وہاں عملی طور پر اسلامی نظام نافذ ہوا۔ انصاف فراہم ہوا۔ گورنر، قاضی مقرر ہوئے۔ نظامِ زکوٰۃ نافذ ہوا۔ عدالتی نظام نافذ ہوا، تعلیم و تعلم، معیشت و معاشرت ہر شعبۂ زندگی مکمل ہوا۔

ایک وہ وقت تھا کہ جب بعثتِ عالی ہوئی تو روئے زمین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے اللہ کا نام لینے والے تھے۔ ایک وہ وقت آیا کہ بہت بڑی اسلامی حکومت بن گئی۔ اللہ کے بندوں پر اللہ کا دین عملی صورت میں نافذ ہوگیا۔ بعد میں حجۃ الوداع پر تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرامؓ ہمرکاب تھے۔ عرفات میں موجود تھے۔ سوا لاکھ صحابہؓ سے مراد یہ ہے کہ سوا لاکھ مسلمان گھرانے تھے۔ ہر گھر سے چند لوگ ہی حج پر جاتے ہیں۔ سارا گھرانا تو نہیں آجاتا۔ کئی ایسے بھی تھے جو بوجوہ مجبوری حاضر نہ ہوسکے۔ تو کس قدر تعداد ہوگی!

اب اسلام ایک مضبوط طاقت اور بہترین ریاست قائم کرچکا تھا۔ اس بلندی تک پہنچانے میں ساری محنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمان صحابہ کرامؓ کی تھی۔ اتنا عظیم کام تھا۔ اتنے بڑے کام کو انجام دینے کے بعد حکم آیا: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۔۔۔ تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے مغفرت مانگیں۔

نیکی کر کے دو کام کرنے چاہییں :

ایک تو اللہ کی تعریف کرنی چاہیے کہ اس نے مجھے توفیق دی اور مجھ سے یہ نیک کام کروایا دوسرا یہ کہ پھر توبہ کرنی چاہیے کہ اللہ! آپ کی شان ارفع و اعلیٰ ہے میرے سجدے میرے رکوع و سجود، میرا ذکر اللہ کرنا، تلاوت کرنا آپ کی بارگاہ کے لائق نہیں۔ اس میں جتنا خلوص ہے، عاجزی ہے یا ورع و تقویٰ ہے یہ سب آپ کی عطا ہے۔ میرے عمل سے بہرحال آپ جلّ شانہٗ کی شان بلند ہے!

جب کسی دُنیوی حکمران یا بادشاہ کے سامنے تحفہ پیش کیا جائے اور وہ اس کے شایانِ شان نہ ہو تو پھر معذرت بھی کرنا پڑتی ہے کہ میری حیثیت یہی تھی جو میں لے آیا۔ یہ آپ کی شان کے لائق تو نہیں لیکن میری حیثیت ہی اتنی تھی۔ یہاں یہی مراد ہے کہ نیکی کر کے ناز نہ کرو بلکہ اللہ کا احسان مانو کہ اس نے نیکی کی توفیق دی۔ یہ احساس بھی رکھو کہ تمہاری نیکی اس کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳ ''بے شک وہ معاف کرنے والا ہے'' اس کی شان یہ ہے کہ وہ توبہ قبول فرماتا ہے یعنی نیکی کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ تمہاری توبہ بھی شامل ہو کہ جیسا ہونا چاہیے تھا۔ جو آپ کے شان کے شایان تھا ویسا میں نہ کر سکا۔ میں عاجز بندہ ہو، یا اللہ آپ کا محتاج ہوں۔ میں نے اپنی طرف سے پورے خلوص اور پوری احتیاط سے کیا لیکن آپ کی شان تو بہت بلند ہے۔ میرے نیک عمل میں بھی کمی رہ گئی اس لیے مجھے معاف کر دے۔

ہم ٹوٹی پھوٹی چار نمازیں کیا پڑھ لیں، ہم سمجھتے ہیں ہم نے اللہ پر احسان کر دیا۔ ہم پارسا ہو گئے، تو ہم پر حادثات کیوں وارد ہو جاتے ہیں؟ قرآنِ حکیم میں اس موضوع کو مختلف انداز میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اللہ کریم گناہوں پر فوری گرفت فرماتے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ بچتا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کریم بڑے بڑے گناہوں سے بچانے کے لیے تنبیہ کے طور پر چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر سزا دیتے ہیں تاکہ انسان بے مہار نہ ہو جائے۔ ایک اور جگہ ایک جامع اصول بنایا گیا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الروم:41) ''لوگوں کے اعمال کے باعث خشکی اور دریا میں فساد پھیل رہا ہے تاکہ وہ (اللہ) ان کو ان کے بعض اعمال (کا مزہ) چکھائیں عجب نہیں کہ وہ باز آ جائیں''۔

گویا زمینوں اور سمندروں میں تباہی آجاتی ہے۔ زلزلے آجاتے ہیں، جنگیں چھڑ جاتی ہیں، طوفان آجاتے ہیں، بربادی ہوجاتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے؟ لوگ ایسے کام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں تباہی آتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی ناپسندیدہ بات ہوتی ہے تو ہمارے ہی کسی جرم کی سزا ہے۔ اس کا علاج توبہ ہے۔

انسان بھی کیسا عجیب ہے۔ اللہ کی عظمت کو جب نہیں پہچانتا تو اس پر الزام دھرتا ہے۔ کہتا ہے آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ یہ کتنی لرزا دینے والی سوچ ہے! اس بات کا مطلب یہ ہے کہ میں تو بڑا نیک، پارسا، بڑے اچھے مقام پر ہوں یہ تو اللہ نے غلط کردیا (معاذ اللہ) میرے ساتھ ظلم ہوگیا، زیادتی ہوگئی۔ اس کا مطلب ہے اللہ کریم پر الزام لگا رہا ہے کہ میں تو بالکل درست ہوں، کرنے والے نے زیادتی کردی۔ یہ بڑی خطرناک سوچ ہے۔

قرآن میں ہمیں تعلیم کیا جارہا ہے کہ ہم جتنی بھی نیکی کرلیں، ہم نے اپنے پاس سے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ سب اللہ کی عطا ہے، توفیق ہے اور اس کی عنایت ہے۔ اگر ہم اس کی راہ میں جان بھی قربان کردیں تو جان کس نے دی؟

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زندگی اس کی عطا تھی۔ جان اس نے دی تھی۔ اگر اس کی راہ میں دے دی اور اس نے قبول کرلی تو یہ اس کا احسان ہے۔ ہم نے کیا کیا؟ آج اللہ کی توفیق سے ہم ذکر کررہے ہیں۔ ذکر کرارہے ہیں تو یہ پکی بات ہے ہم نہیں کرا رہے۔ اس نے دنیا میں ایک توازن قائم رکھنا ہے۔ نیکی اور بدی کا توازن قائم رکھنا ہے۔ یہ اللہ کا ہم پر احسان ہے کہ ہمیں اس کا سبب بنادیا۔ جس طرح زمین کا توازن قائم رکھنے کے لیے بڑے بڑے پہاڑ ایستادہ کردیے اسی طرح ماحول میں جب برائی پھیل جائے تو اللہ کریم نیکی کے ذرائع بھی وسیع کردیتے ہیں کہ رات ہی نہ رہے، کوئی روشنی بھی رہے کیونکہ اگر صرف برائی رہ جائے گی تو قیامت قائم ہوجائے گی۔ جب کوئی نیکی نہیں کرے گا تو پھر دنیا کی عمر ختم ہوجائے گی۔ یہ اللہ کا اپنا نظام ہے۔ اس نے اسے متوازن رکھنا ہے۔ میں نہیں کروں گا تو کوئی اور کرلے گا۔ آپ نہیں کریں گے تو کوئی اور کرلے گا۔ یہ اس کی مرضی کہ کس کو توفیق عطا کرتا ہے۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص، اس پر اللہ کا کتنا احسان ہے جو برائی کے مقابلے میں نیکی پھیلا رہا ہے لیکن یہ اس کا کمال نہیں۔ اس پر اللہ کا احسان ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نیکی کرکے یہ احساس رکھے کہ یہ اس کا ذاتی کمال نہیں۔ عطائے باری ہے۔ یہ بھی احساس زندہ رکھے کہ اس کی ساری نیکیاں اللہ کی بارگاہ کی شان کے شایان نہیں لہٰذا اس پر اللہ سے معافی چاہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ۔۔۔کا خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہا ہے کہ پہلے تو اللہ کی تعریف بیان کیجیے کہ یہ ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی۔ دیکھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس نے اللہ جلّ شانہٗ کی تعریف کی ہوگی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی قربانیاں کون دے گا، اتنا خلوص کس میں ہوگا، اتنی سچائی اور للّٰہیت کوئی کہاں سے لے گا! پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد ہو رہا ہے تو اس کا معنی ہے کہ باقی سب کے لیے اس حکم کی زیادہ تاکید ہے۔

صحابہ کرامؓ کیا عجیب ہستیاں تھیں! بدر میں صف بندی ہو چکی تھی۔ تین سو تیرہ افراد جن میں بچے اور بوڑھے شامل تھے۔ جن کے پاس نہ ہونے کے برابر اسلحہ تھا، نہ ہونے کے برابر سواری تھی اور راشن بے حد قلیل تھا۔ ان کے مقابل قریش کے مانے ہوئے جنگجو، ایک ہزار سے زیادہ کا لشکرِ جرّار اسلحے سے لیس اور وافر راشن کے ساتھ تھے۔ صحابہ کرامؓ اللہ کے بھروسے پر، اللہ پر یقین کی دولت سے مالا مال مقابلے کے لیے تیار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک کو پانچ پانچ کھجوریں بطورِ راشن دیں۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا، اگر میں شہید ہو گیا تو جنت جاؤں گا؟ فرمایا، بے شک! اس نے وہ کھجوریں ہاتھ سے گرا دیں اور کہا اب جنت جا کر ہی وہاں کی نعمتوں سے پیٹ بھروں گا اور وہ واقعی شہید ہو گئے۔ کیا لوگ تھے، کیا ایمان تھا، کتنا یقین تھا اور کتنا خلوص تھا! انہوں نے جانیں دے کر اسلام کی عمارت کو سینچا۔ انہیں بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ اس سب کے باوجود یہ تمہارا کمال نہیں۔ میں نے تمہیں توفیق دی۔ تم پر احسان کیا کہ تم سے یہ کام لیا اور تمہیں شہادت سے سرفراز فرمایا۔

اسلامی فکر کی بنیاد اس بات پر ہے کہ بندہ سوچے میرا، سارا مجاہدہ، اس کی توفیق سے ہے۔ اس میں خلوص وللّٰہیت ایسی نہیں کہ اللہ کریم کی بارگاہ کے لائق ہو تو اے میرے ربّ آپ اسے محض اپنے کرم سے قبول فرمالیں میں اپنی کوتاہیوں کی توبہ کرتا ہوں۔ اللہ فرماتے ہیں، میں توبہ قبول کرنے والا ہوں۔

کوئی کتنی بھی نیکی کر لے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خادمانِ رسالت رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسا نہ خلوص ہے نہ اس پائے کی کوئی نیکی کر سکتا ہے اور نہ ان سے کوئی مقابلہ ہے۔ انہیں بھی ارشاد ہو رہا ہے کہ لوگوں نے دیکھا، اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اللہ کی تسبیح بیان کیجیے اور اس سے بخشش چاہیں!

جب ہم اپنی زندگیوں پر غور کریں تو جو ہم سوچتے ہیں، جو ہمارا کردار ہے، ہم شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پھر اس کا کرم ہے کہ ہمیں سجدہ ریز ہونے کی توفیق دے رکھی ہے۔ اس کا احسان ہے کہ حلال ذرائع سے رزق دے رکھا ہے اور جائز جگہ خرچ کرنے کی توفیق دے دی لیکن ہم ہیں کہ خود کو پارسا سمجھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ دنیا ہمارے آسرے پر قائم ہے۔ ہم نہ ہوں تو یہ کام ہی نہ ہو سکے۔ ہم بہت دور جا چکے ہیں۔ آج کہا جاتا ہے کہ میں نمازیں بھی پڑھتا ہوں لیکن میری دکان نہیں چلتی۔ بیٹے کو نوکری نہیں ملتی۔ یہ کون سا اندازِ فکر ہے؟ نمازیں پڑھ کر تم کیا پروردگار بن گئے ہو کہ اب جو تم چاہو وہ ہوا کرے؟ افسوس کہ اسلامی انداز فکر کیا ہے اور ہم کیا سوچتے ہیں!

بلاشبہ اللہ کریم معاف کرنے والے ہیں۔ اللہ ہی کی ذات ہے جس کی بخشش کی کوئی حد نہیں۔ حجاج بن یوسف تاریخِ اسلام کی بہت متنازعہ شخصیت ہے۔ اس نے بہت بڑے بڑے نیک کام بھی کیے۔ جہاد بھی کیے لیکن اس کے جرائم بھی بہت بڑے ہیں۔ بڑی عظیم المرتبت شخصیات کے قتل کا مرتکب بھی ہوا اور بھی بہت سے ظلم روا رکھے۔ اس کے دورِ حکومت کا واقعہ ہے کہ کوئی نوجوان حجاج کے دربار کے سامنے سے گزرا تو اس نے یہ سورت اس طرح پڑھی: إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ o وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَخْرُجُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا o کہ جب فتح آئے گی، اللہ کی مدد آئے گی تو دیکھو گے کہ لوگ فوج در فوج اسلام سے نکل رہے ہیں۔ حجاج نے اسے بلوایا اور پوچھا کہ وہ اس سورت کو غلط کیوں پڑھ رہا تھا؟ اس نے کہا جب یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو اس وقت اس کے الفاظ وہی تھے جو قرآن میں ہیں۔ آج حجاج بن یوسف کی حکومت ہے تو لوگ اسلام سے بھاگ رہے ہیں۔ حجاج نے کہا، میں نے تمہارے جیسا جرأت مند کوئی نہیں دیکھا کہ تم میرے سامنے یہ بات کہہ رہے ہو لیکن تُو بھی میرے جیسا بندہ نہ دیکھے گا۔ جا! میں نے تجھے معاف کیا۔ جاتے جاتے اس نے عربی میں جو کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ اللہ آپ کا ٹخنہ اونچا کرے اور چہرہ سفید کرے۔ حجاج نے درباریوں سے پوچھا یہ کیا کہہ گیا ہے؟ انہوں نے عرض کی وہ آپ کو بددعا دے کر گیا ہے کہ ٹخنہ اس کا اونچا ہوتا ہے جس کو سولی دی جائے۔ وہ ہوا میں لٹک رہا ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے اور چہرہ اس کا سفید ہو جاتا ہے جسے جذام ہو جائے۔ وہ جاتے ہوئے بددعا ہی دے گیا تھا۔

حضرت حسن بصریؒ کے زمانے میں حجاج کا دورِ حکومت تھا۔ وہ اس کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ اس زمانے میں لوگ اس سے بہت تنگ تھے۔ ایک پورے صوبے میں اس کے خلاف تحریک چل گئی کہ تلواریں لے کر نکلو تا کہ

حجاج کو ہٹا دیا جائے۔ حضرت حسن بصریؒ نے اپنے شاگردوں کو پھیلا دیا اور لوگوں کو روکا کہ تلواریں رکھ دو اور باہر نہ نکلو اس لیے کہ یہ شخص عذابِ الٰہی ہے اور عذاب تلواروں سے نہیں ہٹتا۔ توبہ سے ہٹتا ہے۔ خلوصِ دل سے توبہ کرو۔ اپنے کردار کی اصلاح کرو کہ اللہ اس عذاب کو ہٹا دے۔

مورخین اس کی موت کا بڑا عجیب واقعہ لکھتے ہیں کہ اس کے آخری وقت میں اس کی والدہ اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے کہا، کتنے ہی لوگ میرے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اماں! آج میری باری آ گئی۔ مرنا تو ہر ایک نے ہے۔ یہ تو کوئی عجیب بات نہیں۔ والدہ نے کہا میں تیرے مرنے پر نہیں رو رہی۔ میں تیرے کردار پر رو رہی ہوں کہ تیرا آخرت میں کیا ہوگا؟ وہ کہنے لگا، اگر اللہ میرا حساب کتاب تیرے سپرد کر دے تو تُو میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ کہنے لگی جیسا بھی ہے تُو میرا بیٹا ہے۔ میں تجھے معاف کر دوں گی۔ اس نے کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ تُو میرے آخری وقت میں اس سے مایوس کرنے لگی ہے؟

اس بات کی خبر حضرت حسن بصریؒ کو ہوئی۔ یہ واقعہ سنایا گیا تو حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ اسے اللہ سے حسنِ ظن بچا لے گا۔ یہ وہاں بھی بچ جائے گا۔ اللہ کی بارگاہ بہت عظیم ہے کوئی اس کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار تو کرے!

یہ دو باتیں ہر حال میں بندے کو اختیار کرنی چاہییں۔ اپنے کسی عمل پر فخر یا ناز نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے یہ کر دیا، وہ کر دیا۔ اگر ہم سے کوئی نیکی ہو رہی ہے تو اس کی توفیق شاملِ حال ہے۔ وہ چاہے تو پتھر سے بھی کام لے سکتا ہے۔ کام کی توفیق، اس کا احسان ہے۔ دوسرا یہ یاد رہے کہ اللہ کی توفیق سے نیک کام تو ہو گیا لیکن میرا عمل اس کی بارگاہ کی شان کے لائق نہیں۔ میں ویسا نہیں کر سکا لہٰذا توبہ کرتے رہنا چاہیے۔

اللہ کریم معاف فرمائیں، قبول فرمائیں اور اپنی مہربانی سے نوازیں۔ (آمین)

سورۃ اللھب رکوع 1 آیات 1 تا 5

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴿١﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴿٢﴾ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿٣﴾ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿٤﴾ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿٥﴾

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو ﴿۱﴾ نہ اس کا مال ہی اس کے کام آیا اور نہ وہ (کردار) جو اس نے کمایا ﴿۲﴾ وہ جلد بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا ﴿۳﴾ اور اُس کی بیوی بھی جو ایندھن اُٹھائے پھرتی ہے ﴿۴﴾ اس کے گلے میں پوست کھجور کی رسی ہوگی ﴿۵﴾

تفسیر و معارف

سورۃ اللّھب مکی حیاتِ طیبہ میں نازل ہوئی لہٰذا اس کا شمار مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔ ابی لہب کا نام عبدالعزیٰ تھا اور یہ حضرت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ عربی میں 'لہب' بھڑکتے ہوئے شعلہ کو کہا جاتا ہے اور ابی لہب کا رنگ چونکہ سرخ وسفید تھا تو عرب اس طرح کے نام ڈال دیتے تھے۔ جس طرح سیدنا ابوبکر دراز قد ہونے کی وجہ سے ''ابی بکر'' مشہور ہو گئے کیونکہ بکر اونٹ کو کہتے ہیں جو دراز قد ہوتا ہے۔ عبدالعزیٰ ابی لہب یعنی شعلے والا کے نام سے مشہور تھا کہ بہت خوبصورت جوان تھا اور سرخ وسفید رنگت تھی۔

بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت محتاط رہنا چاہیے:

بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر تشریف لے جا کر قریش کی مختلف شاخوں کو یعنی اہلِ مکہ کو آواز دے کر بلایا کہ سب ان کی بات سن لیں۔ سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم میں عمر کا ایک حصّہ گزارا ہے تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ چونکہ بعثتِ عالی چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی تو فرمایا، میری جوانی تمہارے درمیان گزر گئی تم مجھے جانتے ہو تو میرے بارے تمہاری کیا رائے ہے؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین ہیں۔

یہ دو الفاظ ایسے ہیں جن میں تمام انسانی خوبیاں آجاتی ہیں۔ تمام انسانی کمالات ان میں سمو جاتے ہیں کہ ایک بندہ سچا ہے کوئی غلط بات نہیں کہتا اور امین ہے کوئی غلط کام نہیں کرتا۔

سب نے یک زبان کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق بھی ہیں اور امین بھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جہاں کھڑا ہوں میرے سامنے پہاڑ کا یہ رخ بھی ہے جہاں تم سب کھڑے ہو اور دوسرا رخ بھی میری نگاہ میں ہے جو تم لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ دوسری طرف ایک فوج ہے جو تم پر حملہ کرنا چاہتی ہے تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟ سب نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں اگر آپ کہیں گے تو ہم یہ سچ مان کر اپنے دفاع کی تیاری کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسی طرح میرے سامنے دونوں جہاں ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم شرک میں مبتلا ہو اور آخرت میں شرک کا نتیجہ جہنم اور آگ ہے۔ تم توحیدِ باری کا اقرار کرلو۔ اللہ کو واحد و لاشریک مان لو۔ نبوت پر ایمان لاؤ، اللہ کی اطاعت اختیار کرو تو کامیابی ہے، اگلی دنیا میں جنت ہے، اللہ کی رضا ہے۔ اس بات پر ابی لہب نے کہا 'تَبَّتْ یَدَاکَ یَا مُحَمَّدُ''، اس لیے آپ نے ہمیں یہاں بلایا تھا؟ یہ بات کرنے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ تَبَّتْ یَدَا ایک محاورہ ہے کہ 'تیرے ہاتھ ٹوٹیں' تو اس سے یہی مراد ہوتا تھا کہ تیرے پاس کچھ بھی نہ بچے ہر طرح سے تباہ ہوجائے۔ یہ بہت سخت جملہ کہہ دیا ابی لہب نے جس کا جواب ربِّ کریم نے دیا۔ اسی لیے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بات کرتے ہوئے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی پر کسی سے مناظرہ نہیں کرنا چاہیے۔ مناظرے میں جب بحث ہوتی تو حق میں اور مخالفت میں دلائل دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر مناظرہ نہیں کرنا چاہیے مبادا کہ توہین کا پہلو نکل آئے۔ آپ رحمۃ اللہ تاکید فرماتے تھے کہ کبھی بھول کر بھی ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو موضوعِ بحث نہ بنایا جائے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی اور رسول مانتے ہیں اور بات ختم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی عظمتیں ہیں، کتنی بلندیاں ہیں، کتنے درجات ہیں یہ ربّ جانے یا ربّ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانے۔ ہمارے پاس پیمائش کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ اپنے سے کم کو تولا جاسکتا ہے لیکن اپنے سے زیادہ کو کم وزن والا نہیں تول سکتا۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا اندازہ نہیں کرسکتے، ہمارے علوم بھی اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ یہ اللہ کریم ہی جانتے ہیں یا اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں لہٰذا یہ ادب کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر لب کشائی نہ کی جائے۔ اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں تقابل جائز نہیں ہے۔ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے لوگوں نے اس پر بھی بحث کی ہے اور اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں کہ فلاں نبیؑ سے یہ کام نہ ہوسکا یا فلاں یہ نہ کرسکے۔ یہ ہرگز جائز نہیں ہے۔ کسی نبیؑ کی

شان میں ایسا جملہ کہنا جس میں خواہ کہنے والے کی نیت توہین کرنا نہ ہو لیکن جملے میں ایسا امکان ہو کہ سننے والا اُسے توہین سمجھے تو یہ بھی حرام ہے چنانچہ ایسی بات نہ کی جائے کہ سننے والے کو گمان گزرنے کا بھی امکان ہو کہ کہنے والا توہین کر رہا ہے، اس کی اجازت نہیں ہے۔

یہی احترام بطفیلِ نبوت مشائخِ عظام کو نصیب ہوتا ہے لہٰذا اہلِ اللہ میں بھی تقابل جائز نہیں۔ یہ اصول قرآن کریم نے عطا فرمایا ہے رسولوںؑ میں بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے یعنی سب اچھے ہیں بعض اچھوں میں سے بھی اچھے ہیں۔ کسی کو کم تر نہیں کہا۔ اسی لیے اہل اللہ یا علمائے حق میں یہ تقابل کرنا کہ فلاں کا درجہ کم ہے، فلاں کا زیادہ ہے یہ قطعی حرام ہے۔ یہی اصول ہے کہ سب اچھے ہیں بعض اچھوں میں اور بھی اچھے ہیں۔

ہر گل را رنگ و بوے دیگر است

ہر پھول، پھول ہے ہر ایک کا اپنا رنگ اور خوشبو ہے۔ سب اچھے ہیں۔ سب کی خوشبو اچھی ہے کسی کی بہت اچھی ہے۔ کسی کی تنقیص جائز نہیں ہے۔ ابی لہب نے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت بات کہی وہ اللہ کریم کو اتنی ناگوار گزری کہ اس کا جواب بارگاہِ الٰہی سے آیا، فرمایا: تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ① ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔

ابی لہب نے تو تَبَّتۡ یَدَاۤ ، کہا تھا لیکن اللہ کریم نے اس پر تَبَّ بڑھا دیا کہ اس کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو جائے تباہ ہو جائے، اس کا کچھ نہ بچے اس پر اتنا غضبِ الٰہی نازل ہوا، فرمایا: مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ② نہ اس کا مال ہی اس کے کام آیا اور نہ وہ (کردار) جو اس نے کمایا۔

ابی لہب ایک کامیاب تاجر تھا۔ امیر آدمی تھا، اللہ کریم نے فرمایا، اس کی دولت، اس کا مال جس پر اسے ناز ہے سب ضائع جائے، اس کے کسی کام نہ آئے۔ جو بھی اس نے کمایا ہے یا جو اس کا کردار ہے، سب اس پر الٹ پڑے اور پھر آگے کی خبر دی، فرمایا: سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ③ وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

فرمایا، یہ تو عنقریب شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا۔ یہ تو بھڑکتی ہوئی آگ میں جا رہا ہے۔ اس کا نام ابی لہب یعنی شعلے والا اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

ابی لہب اور اس کی بیوی کا انجام:

جب معرکہ ءبدر ہوا تو تمام اہلِ مکہ نے بھرپور حصہ ڈالا تھا حتیٰ کہ بعض لوگ جو کسی مصروفیت یا بیماری کی وجہ سے خود شامل نہیں ہو سکے تھے اُنہیں یہ تاکید کی گئی تھی کہ اپنی جگہ کسی جوان جنگجو کو پیسے دے کر لڑنے بھیجیں۔ ابی لہب

بھی خود لڑائی میں نہ جا سکا لیکن اس نے اپنی جگہ ایک جوان کو اجرت پر بدر میں لڑنے بھیجا تھا۔

جب بدر میں شکست ہوئی تو اہلِ مکہ کی شکست خوردہ فوج نے بدر سے مکہ کی طرف ایک قاصد دوڑایا۔ اُس قاصد نے مکہ کے باہر پہنچ کر اپنا کرتا پھاڑ کر الٹا پہن لیا۔ سانڈھنی کی نکیل پیچھے تک کاٹ دی، اس کے کان کاٹ دیے، پالان الٹی رکھ دی اور اس پر دوسری طرف منہ کر کے سانڈھنی پر سوار ہو کر بیٹھ گیا۔ اپنے بال بکھیر کر ایک انتہائی بری ہیت بنالی تاکہ ایک انتہائی بری خبر دے۔ یہ اہلِ مکہ کا انداز تھا کہ کوئی بہت بری خبر دینے کے لیے بہت برا منظر پیش کرتے چنانچہ حلیہ بگاڑ کر خبر دیتے۔ وہ سوار اس حالت میں مکہ داخل ہوا کہ سانڈھنی پر الٹی سمت میں بیٹھ کر برے حال میں یہ کہتا جاتا کہ اہلِ مکہ کو شکست ہوگئی! فلاں بھی مارا گیا، فلاں بھی مارا گیا! ان ناموں میں اکثر رؤسائے مکہ کے بیٹے تھے جو خود بھی بہت جنگجو اور مشہور تھے۔ جیسے جیسے وہ مرنے والوں کے نام لیتا گیا، مکہ میں کہرام مچ گیا، طوفان آ گیا کہ یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تین سو تیرہ نہتے آدمی ایک ہزار کے لشکرِ جرار اور جنگجو فوج کو اس طرح کاٹ کر پھینک دیں گے۔ مکہ میں تو گویا قیامت آ گئی، بڑا کہرام مچا۔ بیت اللہ شریف کے دروازے کے باہر ایک لوہار بیٹھتا تھا۔ وہ مسلمان ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اہلِ مکہ سے ڈر کر خاموش رہتا تھا۔ ابی لہب اس وقت اُس لوہار کے پاس بیٹھا کوئی کام کروا رہا تھا یا ویسے بیٹھا ہوا تھا۔ جب شور مچا اور اس مسلمان نے سنا کہ مسلمانوں کو بدر میں فتح ہوئی ہے اور اہلِ مکہ کو شکستِ فاش ہوئی ہے تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا 'الحمد للہ!'۔

ابی لہب نے سنا تو بھڑک اٹھا اور اپنی کمان اس مسلمان لوہار کے گھٹنے پر زور سے ماری۔ اب جس مقام پر اس کو ماری ابی لہب کے اپنے گھٹنے پر عین اسی جگہ ایک پھوڑا نکل آیا۔ وہ اتنا تکلیف دہ پھوڑا تھا کہ ابی لہب بمشکل ٹانگ گھسیٹتا ہوا گھر پہنچا۔ اس پھوڑے نے عجیب صورت اختیار کر لی۔ وہ پھٹتا، اس سے پانی خارج ہوتا اور جہاں پانی لگتا وہاں پھوڑا بن جاتا۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں اس کا پورا جسم پھوڑوں سے بھر گیا اور اُن میں پیپ پڑ گئی۔ اُن میں اتنی بدبو پڑ گئی کہ کوئی بندہ اس کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ جو اسے دیکھنے آتا اسے ناک بند کر کے منہ لپیٹ کر آنا پڑتا، بالآخر کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ اسی حال میں وہ مر گیا تو اتنی بدبو اور تعفن پھیلا کہ کوئی اس کی لاش کے قریب جانے کا سوچ بھی نہ سکا کہ اسے نکال کر دفن کیا جائے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ یہی مکان اس پر گرا دیا جائے اور یہی اس کا مدفن بن جائے لہٰذا ارد گرد سے پتھر نکال کر اس پر چھت گرا دی گئی۔ اس کے اوپر دیواریں ڈھا دی گئیں۔ وہ وہیں دفن ہو گیا۔

اس کی بیوی، فرمایا: وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝۴ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ اور اس کی بیوی جو ایندھن اٹھائے پھرتی تھی۔ اس کے گلے میں پوست کھجور کی رسی ہوگی۔

جب ابی لہب تباہ ہوگیا، مرگیا تو اس کی بیوہ رہ گئی۔ وہ ایندھن کے لیے لکڑیاں چُن کر گٹھا باندھ کر لایا کرتی تھی۔ یہ عورت کچھ خاردار لکڑیاں بھی لے آیا کرتی اور اُن کے کانٹے نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں بچھانے کے لیے بھی مشہور تھی۔ ایک رواج یا عام طریقہ تھا کہ ایندھن یا لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اس کے آگے ایک ڈھیلی سی رسی باندھ لیتے جسے ماتھے کے گرد اٹکا لیتے اور گٹھا کندھوں پر رکھ لیا جاتا۔ اس طرح بوجھ تقسیم ہو جاتا تھا۔ کچھ سر پر ہوتا کچھ کندھوں پر تو آرام سے لوگ اٹھا لیتے۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ یہ عورت ستانے کے لیے کسی دیوار کے ساتھ بیٹھی اور گٹھا دیوار پر رکھ کر رسی ماتھے سے اتاری ہی تھی کہ وہ گٹھا پیچھے گر گیا اور رسی گلے میں آ گئی۔ اس کے لیے وہ پھانسی کا پھندا بن گئی اور وہ مر گئی۔ اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہے کہ دوزخ میں اس کے گلے میں جو طوق ڈالے جائیں گے وہ ایسے ہوں گے جیسے بٹی ہوئی رسی ہوتی ہے۔ آگ ہی کے بٹے ہوئے رسے اور آگ ہی کے طوق ہوں گے۔

ہر ایک کا معاملہ اللہ کریم کے ساتھ ہے:

یہ سورت نازل ہوئی اور قرآن کا حصہ بن گئی۔ مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے ایک صحابیؓ کی شکایت کی کہ وہ ہر نماز میں سورۂ لہب ضرور پڑھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں طلب فرمایا اور پوچھا کہ کیا ایسا کرتے ہو۔ انہوں نے عرض کی جی میں ہر نماز میں ضرور پڑھتا ہوں مجھے یہ پسند ہے کیونکہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی اور اللہ نے نام لے کر اس کو جواب دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ اُن سے فرمایا کہ تمہیں تیس پارے قرآنِ کریم میں اور کوئی سورت پڑھنے کو نہیں ملتی ؟ اسے وظیفہ تو نہ بنالو۔ وہ جیسا بھی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار تو تھا، چچا تھا۔ جیسا بھی تھا وہ جانے، اس کا اللہ جانے۔ اس کے متعلق جو اللہ کریم نے ارشاد فرمایا، وہ مالک ہے، فرما سکتا ہے۔ اس سورت کے پڑھے بغیر قرآن مکمل نہیں ہوتا لہٰذا اس کی تلاوت ضروری ہے لیکن اسے وظیفہ نہ بنایا جائے۔ اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

اسی طرح مریدوں کو بھی مشائخ کا احترام کرنا چاہیے۔ خود شیخ کی توہین کا تو کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ شیخ کے کسی رشتہ دار کی بھی توہین یا گلہ شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ جو کوئی جیسا بھی ہے وہ جانے اس کا ربّ جانے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ جو مسلمان مرتا ہے اس کے ساتھ اچھا گمان رکھو حسنِ ظن رکھو۔ اللہ بڑا کریم ہے۔ بہت معاف کرنے والا ہے۔ کوئی اگر زمین اور آسمان کو گناہوں سے بھرنے کے بعد توبہ کرلے تو وہ قبول فرمالیتا ہے۔ ہمیں کیا خبر مرنے والے نے مرنے سے پہلے رجوع الی اللہ کرلیا ہو، موت سے پہلے

توبہ کر چکا ہو لہٰذا دنیا سے جانے والوں کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہم ہر مومن سے حسنِ ظن رکھتے ہیں اور ہمیں کسی کافر کے انجام کا شبہ نہیں ہے۔

صحابہؓ خوش نصیب لوگ تھے کہ ذرا سی بات ہوتی تو بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچ جاتے تو دو صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں کسی بات پر الجھ پڑے۔ بات بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچی معاملہ پوچھا گیا تو ایک صحابیؓ نے عرض کی کہ میں نے سچ کہا ہے۔ اس کا دادا، باپ، چچا سب دوزخی ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان نہیں لائے اور کفر پر مرے ہیں۔ اُن کے دوزخی ہونے میں کیا شبہ ہے؟ میں نے کیا غلط کہا ہے؟ یہ مجھ سے اس بات پر ناراض ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن صحابیؓ کی طرف توجہ فرمائی تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ میرے رشتہ دار کفر پر مرے وہ جہنمی ہیں لیکن اس کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ انہیں دوزخی کہتا پھرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ درست کہہ رہا ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں کہ تم ان کا نام لے کر اس طرح کہتے پھرو۔ یہ ناجائز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔

اہلِ کشف کے لیے انتباہ:

بعض دوستوں کو جو خود کو صاحب کشف کہتے ہیں انہیں عموماً یہ شوق ہوتا ہے کہ کوئی معروف سیاستدان یا مولوی یا کسی طبقے کا آدمی مر جائے تو انہیں کشف شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنا کشف بیان کرنا شروع ہو جاتے ہیں کہ مرنے والے کی نجات ہوئی یا وہ عذاب میں ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ مجھے ان ساتھیوں سے بہت شکایت ہے اور وہ یہ سمجھ لیں کہ وہ جو مرنے والوں کے بارے رائے دیتے ہیں، ایسا کرنا حرام ہے۔ اُن کا کشف وحی تو نہیں ہے کہ وہ یہ جرأت کریں۔ ہر ایک کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے اگر کسی صاحبِ کشف کو کسی عام مسلمان کے بارے کوئی بات سمجھ آتی ہے تو انہیں چاہیے کہ مرنے والے کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ ان کا اعلان نہ کرتے پھریں۔ کوئی کافر بھی ہے تو ہر کوئی جانتا ہے کفر پر مرنے کا انجام دوزخ ہے، بات ختم ہوگئی۔ اس کا نام لے کر بتانے کی یا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ہرگز جائز نہیں ہے چہ جائیکہ کسی مسلمان کے بارے ایسا کہا جائے۔ اہلِ کشف کو بہت محتاط رہنا چاہیے کہ اس بات کی جوابدہی ہوگی، حساب دینا ہوگا۔ کشف کسی کی جاگیر نہیں ہے جس نے دیا ہے وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔ اس کے زعم میں اگر اللہ کی نافرمانی کی جائے گی تو یہ مزید نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اہلِ کشف کو دوسروں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

سورۃ الاخلاص رکوع 1 آیات 1 تا 4

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

کہہ دیجیے وہ اللہ ایک ہے ﴿۱﴾ اللہ بے احتیاج ہے ﴿۲﴾ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا ﴿۳﴾ اور کوئی اُس کی برابری کرنے والا نہیں ﴿۴﴾

تفسیر و معارف

سورۃ الاخلاص مکی سورت ہے۔ یہ اُن سورتوں میں شمار ہوتی ہے جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔

مشرکین نے بے شمار بتوں اور چیزوں میں خدائی اوصاف مان رکھے تھے۔ کہیں دیوی دیوتاؤں کو اللہ کا شریک مانتے تھے تو کہیں درختوں کو جانوروں کو شریک مان کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ اسی طرح بے شمار معبودانِ باطلہ دنیائے کفر نے اختیار کیے ہوئے تھے۔

مشرکینِ مکہ نے جب دیکھا کہ اسلام کی تحریک توڑ کنے والی نظر نہیں آتی کہ ہم تو ظلم کر کے تھک گئے، ان کا راستہ روک کر بھی تھک گئے، ان کا معاشی مقاطعہ کر کے بھی دیکھ لیا لیکن لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟

مشرکینِ مکہ نے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک پیشکش اور شرط رکھی۔ انہوں نے کہا مکہ مکرمہ میں اس شہر میں پہلے ہی متعدد مذاہب ہیں۔ بت پرست بھی ہیں جو خود کسی ایک بت پر متفق نہیں ہیں اور انہوں نے بیت اللہ میں بھی تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کو پوجتا ہے کوئی کسی کو اور پھر یہی نہیں بلکہ ہر خاندان نے اپنا بت بنایا ہوا ہے۔ ہر گھر کے ہر فرد کا اپنا ایک ذاتی بت ہے جسے جیب میں لیے پھرتا تھا۔ اُن کے تصور کے مطابق وہ سارے بت کسی نہ کسی طرح خدائی میں شریک تھے۔ اب اتنے خداؤں کے پجاری حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ربّ کو جیسا چاہیں ویسا مانیں۔ اپنے دین پر عمل کریں۔ اپنے مذہب کے مطابق رہیں لیکن ہمارے بتوں کو غلط کہنا چھوڑ دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک چیز یا صحیح ہوتی ہے یا غلط، دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک رویہ ہے بات کو صحیح تسلیم کر لینا تو بات ختم ہوگئی۔ دوسرا رویہ ہے اس کو غلط نہ کہنا تو یہ بھی تسلیم کرنے کے برابر ہے۔ جو تم مطالبہ کر رہے ہو کہ تمہارے بتوں کو غلط نہ کہا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں ایک درجے میں تسلیم کیا جائے۔ اس مطالبے کا جواب اس سورۂ مبارکہ کی صورت میں نازل ہوا۔

توحیدِ باری کی عظمت:

فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ① کہہ دیجیے وہ اللہ ایک ہے۔

فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر دیجیے، سب کو کھلے الفاظ میں بتا دیجیے کہ اللہ احد ہے۔ ہم عموماً یہ محاورہ کہتے ہیں کہ اللہ واحد ولاشریک ہے۔ اللہ واحد نہیں، اللہ احد ہے۔ 'واحد' اور 'احد' میں بہت فاصلہ ہے۔ ایک انسان کو بھی واحد کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ بطور انسان ایک اکائی ہے لیکن ایک وجود میں اتنے اجزا ہیں کہ شمار نہیں کیے جاسکتے۔ ایک ہاتھ کو بھی واحد کہتے ہیں یعنی گنتی میں جب یہ کہنا ہو کہ ایک ہاتھ ہے تو وہاں واحد کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ اب ایک ہاتھ میں کتنے اجزا ہیں۔ ایک انگلی بھی واحد کہلاتی ہے لیکن کیا وہ اکیلی ہے؟ اس اکیلی انگلی کے بے شمار اجزا ہیں، رگیں، پٹھے، ہڈیاں جلد، ناخن ہیں۔ واحد کوئی بھی اکیلی چیز ہوسکتی ہے جس کے آگے بہت سے اجزا ہوسکتے ہیں۔ ایک انسانی وجود میں جدید سائنس کے مطابق دس کھرب سیل (CELL) ہیں۔ جس وجود کو ہم واحد کہتے ہیں اس میں دس کھرب کی آبادی ہے۔ ایک سیل میں بھی حیات ہے اور اس کے بھی آگے اجزا ہیں۔ دنیا کی کسی چیز کا تجزیہ کرتے جائیں اس کے حصّے ہیں۔ وہ اجزا سے مل کر، بن کر بنتی ہے۔ وہ واحد تو ہوسکتی ہے لیکن احد نہیں ہوتی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا اس سے مراد نر و مادہ بھی ہے لیکن جوڑا سے مراد یہ بھی ہے کہ بدن کے جتنے اجزا ہیں اُن میں کوئی بھی اکیلا نہیں اس کے ساتھ اس کا جوڑا ہے۔ بدن کا ایک ذرّہ بھی اکیلا نہیں۔ اس جیسے کھربوں ذرّے ہیں۔ اس ایک ذرّے کو جب کھولتے ہیں تو اس میں نہ جانے کتنے راز ہیں۔ یہ عہدِ جدید کی ایٹمی دریافت اسی غیر منقسم ذرّے کو توڑ کر ہی دریافت کی گئی ہے۔ اب اور کیا کیا دریافت ہوگا یہ وقت بتائے گا۔

یہ صرف اللہ کی ذات ہے جو واحد نہیں بلکہ احد ہے، جو خالصاً اکیلا ہے، غیر منقسم ہے۔ احد ایسی اکائی ہے جس کا کوئی حصّہ نہیں بن سکتا۔ جو آگے تقسیم نہیں ہوسکتی۔ وہ ذات صرف اللہ کی ہے جو احد ہے۔ اس کا کوئی جزو، کوئی حصّہ، کوئی تقسیم نہیں ہے۔ مشرکین نے اللہ کے بہت سے شریک بنا لیے تھے، بہت سے حصّے بنا رکھے تھے۔ مختلف چیزوں

میں اللہ کے اوصاف مان رکھے تھے۔ اپنی حاجات اُن چیزوں کے سامنے رکھتے تھے۔ اس امید پر مختلف چیزوں کی پوجا کرتے تھے۔ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! فرمادیجیے کہ اللہ احد ہے۔ وہ واحد بھی نہیں بلکہ احد ہے۔ اس کی ذات لامنقسم ہے۔ اس کے اوصاف کسی مخلوق میں تقسیم نہیں ہوسکتے۔ کسی بت، کسی پتھر، کسی انسان، کسی فرشتے، کسی میں اللہ کے اوصاف تقسیم نہیں کہ وہ احد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ مخلوق میں مدارج ہیں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے ہیں نبیؑ ہیں، ولی ہیں، فرشتے ہیں لیکن کسی درجے میں بھی خدا کی ذات یا اس کی صفات میں کوئی شریک نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا کوئی جزو تقسیم نہیں ہوسکتا۔ اس کی صفات اور نہ ہی اس کی ذات کا کوئی حصّہ یا جزو تقسیم ہوسکتا ہے۔ وہ احد ہے، غیر منقسم ہے۔ باقی مخلوق کی بنیاد ہی اجزا پر ہے۔ فرمایا، یہ صرف اللہ ہے جو احد ہے لاشریک ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اعلان فرمادیں کسی کو غلط فہمی نہ رہے۔ اس میں کسی کے راضی یا ناراض ہونے یا صلح و سمجھوتہ کرنے کی بات نہیں ہے۔ معاشرے میں انسانی حقوق مقرر کرنا صرف اللہ کو زیب دیتا ہے کہ وہی خالق ہے، وہی ربّ ہے۔ اسی نے سب کو پیدا فرمایا، انسان کی ضرورتیں پیدا فرمائیں اُن کی تکمیل کے ذرائع پیدا فرمائے۔ اب ان میں توازن کیسے قائم ہوگا تو اس کا طریقہ بتانا بھی اُسی ہستی کا کام ہے۔ سو اللہ نے انسانی حقوق معین فرما دیے ہیں۔ اس نے انسان کو حق دیا ہے کہ کوئی اس پر ایمان نہیں لاتا اُسے اختیار ہے۔ یہ معاملہ میرا اور اس کا ہے لیکن اُس کے انسانی حقوق ہیں۔ کوئی اسے زبردستی ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کی جان، مال، آبرو کوئی نہیں چھین سکتا البتہ دعوت دے سکتا ہے اور حق بتانے کا طریقہ نرم ہونا چاہیے محبت آمیز ہو لیکن حق میں کوئی رو رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ حق اور باطل میں سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ حق کیا ہے اور اس کے برعکس باطل کیا ہے یہ بتانے کا طریقہ شریفانہ ہوگا۔ اس میں طنز یا تہمت یا اگلے کی تحقیر نہیں کی جائے گی بلکہ محبت آمیز اور صاف ستھرا ہوگا۔ اس وضاحت سے احقاقِ حق کیا جائے کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ حق پر سمجھوتہ کیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرمادیجے کہ اللہ احد ہے۔ اس کی ذات یا صفات کا کوئی حصّہ کسی دوسرے میں پایا جانا ناممکن ہے۔ وہ احد ہے غیر منقسم ہے۔

کسی بات میں، کسی نبیؑ، کسی رسولؑ میں، کسی فرشتے میں، کسی ولی میں کسی گنبد یا مزار میں اللہ کا کوئی جزو نہیں۔ اللہ احد ہے اس کا جزو نہیں بن سکتا۔ اس کی کوئی مثل ہے نہ مثال ہے نہ ہی کوئی شریک ہے لہٰذا انسان کو صرف اللہ کی عبادت کرنا ہوگی۔ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کا حق نہیں رکھتا۔ یاد رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے گی کہ فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآء: 80) جس نے پیغمبر کی اطاعت کی تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی حکم ارشاد فرماتا ہے جو اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اسی طرح آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام ہیں، صحابہ کرامؓ ہوں، تابعینؒ، تبع تابعینؒ ہوں علمائے حق ہوں یا اولیا اللہ ہوں ان کی اطاعت ہوگی کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پہنچاتے ہیں۔ اُن کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت ہوگی۔ ولی وہی ہے جو وہ کام کرنے کو کہے جس کام کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ جو اپنی طرف سے چیزیں گھڑ کے اُن کو رواج دے وہ ولی اللہ نہیں ہے۔ کوئی بندہ خواہ ہوا میں اڑتا آئے اگر ایسا کام کرنے کو کہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہوا میں تو مکھیاں اور گدھیں بھی اڑتی پھرتی ہیں۔ یہ کون سا کمال ہے؟ بندے نے اڑ لیا تو کیا ہوا؟ اب تو ہوائی جہاز بن گئے ہیں تو اڑنا کون سا کمال ہے! کوئی شعبدہ باز اگر پانی پر چل لیتا ہے تو کیا کمال ہے؟ اب تو بحری جہازوں میں ایک پورا شہر سفر کر رہا ہوتا ہے۔ ولی کا اصل اور سارا کمال یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہم تک پہنچائے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چونکہ اللہ کی بات ہوتی ہے اس لیے اُس ولی اللہ کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہوگی۔

آج کل نئے نئے دعوے کرنے والے نکل آئے ہیں۔ کسی نے یہ سوال بھیجا تھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں آتے ہیں اور انہوں نے حکم دیا ہے کہ آرمی چیف کو جا کر کہو کہ لڑائی شروع کرے۔ سوال پوچھنے والے نے مزید بتایا کہ وہ شخص یہ بھی کہتا ہے مجھے اللہ بھی ملتا ہے اور میں اللہ کا نور دیکھتا ہوں تو اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے اُسے جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا دین مکمل پہنچا دیا، اللہ کریم نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المآئدۃ:3) آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔

اللہ کریم نے دین مکمل فرما دیا اور وہ تمام نعمتیں جو بندہ خالق سے لے سکتا تھا اس دین میں سمو دیں۔ اس میں اضافے یا خوابوں کی کوئی حیثیت نہیں کہ اب کسی کو خواب آئے یا کوئی کہے کہ مجھے حکم ملا ہے۔ پہلے بھی لوگوں نے ایسے دعوے کر رکھے ہیں کہ انہیں خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے لیے جہاز کا ٹکٹ لے لو، میرے لیے کھانا بناؤ تو یہ ساری خرافات ہیں۔ بے شمار لوگ ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

میں نے تو جواب میں تجویز دی تھی کہ ایسا کہنے والے شخص کو کہو کہ لاحول کی تسبیحات پڑھا کرے۔ یہ شیطانی وساوس ہیں کہ دین کے سارے احکام آ چکے۔ قیامت تک ہر معاملے میں راہنمائی فرما دی گئی۔ صلح جنگ کے اصول بھی آ چکے اب خواب میں آ کر دین بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دین میں کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسری بات کہ وہ اللہ کو دیکھنے

کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ دعویٰ تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں کیا۔ علمائے حق جو دیدارِ باری کی بحث کرتے ہیں وہ شبِ معراج کے بارے میں کرتے ہیں۔ اس عالمِ دنیا میں دیدارِ باری کا دعویٰ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا چہ جائیکہ آج کے دور کا عام آدمی اُٹھ کر یہ دعویٰ کرے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ اللہ کی زیارت اس عالمِ آب وگِل میں مادی نگاہ سے نہیں ہوسکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے انہوں نے ذاتی طور پر عرض کی تھی کہ بارِ الٰہا مجھے آپ کے دیدار کی بڑی طلب ہے۔ یا اللہ! مجھے جمال دکھا دے تو یہی جواب ملا تھا کہ آپ نہیں دیکھ سکتے۔ ان آنکھوں سے، اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے۔

جو علمائے حق معراج شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدارِ باری ہونے کے حق میں ہیں وہ یہی دلیل دیتے ہیں کہ وہ اس دنیا کی بات نہیں ہے۔ وہ تو عالمِ بالا کی بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو عالمِ بالا میں جلوہ افروز تھے سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے تشریف لے گئے۔ جنت ودوزخ کا ملاحظہ فرمایا پھر عرش اُولیٰ سے آگے کہاں تک گئے یہ اللہ جانے یا اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جانے۔ وہاں دیدار ہوگیا تو کیا حرج ہے؟ وہ اس دنیا کی بات تو نہیں ہے۔ آج ماوشما اٹھ کر یہ کہے کہ وہ اللہ کو دیکھتا ہے تو اُسے لاحول واللہ قوۃ الا باللہ پڑھنے کا مشورہ ہے کہ خود بھی اللہ کی پناہ مانگے اور لوگوں کو گمراہ نہ کرے۔

ایک واقعہ ملتا ہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں کہ آپ بیٹھے تھے تو اُن کے ہر طرف روشنی پھیل گئی اور آواز آئی، اے عبدالقادر! میں اللہ ہوں اب تُو میری بارگاہ میں پہنچ گیا ہے تو آج سے تجھے نماز روزے کی ضرورت نہیں رہی۔ تجھے جس منزل پر پہنچنا تھا پہنچ گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا تُو مردود ہے۔ انبیاءؑ اس منزل پر نہیں پہنچے جہاں نمازیں معاف ہوجائیں اور عبدالقادر پہنچ گیا؟ تُو شیطان ہے اور بکتا ہے۔ پھر آواز آئی کہ میں نے اس طرح بڑے لوگوں کو گمراہ کیا ہے لیکن تجھے تیرے علم نے بچالیا۔ انہوں نے فرمایا تو جھوٹ بکتا ہے مجھے میرے اللہ نے بچالیا۔ پھر آواز آئی کہ میں نے اس حربے سے بہت لوگوں کو گمراہ کیا تُو یہاں بھی بچ گیا۔ انہوں نے فرمایا میں نہیں بچ گیا اللہ نے مجھے بچالیا۔ سو ہر وقت اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ ایک غیر منقسم اکائی ہے احد ہے۔ وہ تقسیم نہیں ہوتا کہ یہاں اللہ دکھائی دے رہا ہو، وہاں چھپ گیا ہو۔ یہاں اس بندے نے دیکھ لیا دوسرے نے نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی زیارت قیامت کو ہوگی اور جب وہ خود اپنا جلوہ آشکارا کرے گا تو ہر صاحبِ ایمان کو زیارت ہوگی۔ کافر کی آنکھوں کے سامنے کفر کا اندھیرا ہوگا لہٰذا وہ نہیں دیکھ سکے گا۔ جنت میں بڑی لذتیں ہیں جن کے بارے اس دنیا میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ آخرت کی سب سے زیادہ لذیذ نعمت دیدارِ باری ہے، جمالِ باری ہے۔ جنت کی لذتیں اتنی لذیذ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ جنت اُن لوگوں کی رہائش گاہ ہے جنہیں دیدارِ باری نصیب ہوگا۔

جنت وہ جگہ ہے جہاں جمالِ باری کا دیدار ہوگا۔ جیسے کسی بادشاہ یا حکمران سے ملنے جائیں تو جس انتظار گاہ میں بٹھایا جائے گا وہ بھی بادشاہ یا حکمران کی شان کے لائق ہوگی۔ وہاں جو کھانا یا مشروب پیش کیا جائے گا، اس کا معیار بھی اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ جنت چونکہ اللہ کے جمال کا نظارہ کرنے کی جگہ ہے لہٰذا وہاں کی نعمتیں اس کے شان کے لائق ہیں، اس لیے لذیذ ہیں۔ جنت کی طلب کا حکم بھی اس لیے ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مظہر ہے۔

اللہ غیر منقسم اکائی ہے اور فرمایا: اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ اللہ بے احتیاج ہے۔ وہ بے نیاز ہے! یہ بے نیازی کیا ہوتی ہے؟ ہم تو ایک عام آدمی کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ بڑا بے نیاز ہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ ایسا شخص جو سادگی پسند کرتا ہو، لباس وغیرہ کی زیادہ پروا نہ کرے۔

پڑھا لکھا ہو تو ہم کہتے ہیں یہ بے نیاز طبیعت کا ہے۔ اسے لباس کی پروا نہیں ہے۔ درحقیقت بے نیاز صرف اللہ ہے باقی سارے نیاز مند ہیں۔ ساری مخلوق ایک دوسرے کی محتاج ہے ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہے۔ ایک ایک جزوِ بدن بے شمار اجزا کا محتاج ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا بے شمار گیسوں سے بنا ہے۔ پانی کا ایک قطرہ کروڑوں ذرّوں سے بنا ہے۔ اُن ذرّوں کی تصاویر لی گئیں تو ہر ذرّہ ایک پھول کی شکل کا ہے۔ سبحان اللہ! ہر پھول کی شکل جدا ہے اور ایک قطرے میں ایسے بے شمار ذرّے ہیں۔ ہر پھول کی پتیاں اور خوبصورتی الگ ہے اور ان کی جتنی تصاویر دیکھیں سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ہر چیز ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہے۔ صرف اللہ بے نیاز ہے وہ کسی پر انحصار نہیں کرتا۔ کسی کے ماننے یا سجدہ کرنے سے اس کی شان بڑھ نہیں جاتی اور کسی کے کفر یا انکار کرنے سے اس کی شان میں کمی نہیں آجاتی۔ مخلوق محتاج ہے اور مانتی ہے تو کچھ لیتی ہے، اپنا فائدہ کرتی ہے اگر انکار کرتی ہے تو اپنا نقصان کرتی ہے لیکن اس کی ذات بے نیاز ہے مخلوق کے انکار یا اقرار سے متاثر نہیں ہوتی۔ مخلوق تو ہمہ وقت اس کے دستِ قدرت میں ہے۔ اسی نے چیزیں پیدا کی ہیں اور اُن میں تاثیر بھی وہی پیدا فرماتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا کا جھونکا آتا ہے ٹھنڈا ہوتا ہے تو ہم گرم کپڑے پہن لیتے ہیں۔ کوٹ پہن لیتے ہیں، سر پر ٹوپی رکھ لیتے ہیں پھر کان بھی ڈھانپ لیتے ہیں۔ زیادہ سردی لگے تو اوور کوٹ بھی پہن لیتے ہیں، دستانے بھی ہاتھوں پر پہن لیتے ہیں۔ جب اللہ کریم تاثیر بدل دیتا ہے تو وہی ہوا اتنی گرم ہوجاتی ہے کہ پھر انسان ہلکے کپڑے پہن لیتا ہے۔ پنکھا جھل رہا ہوتا ہے۔ کیا یہ وہی ہوا نہیں ہے؟ وہی زمین ہے، وہی ہم ہیں وہی ہوا ہے، وہی سورج ہے۔ وہی ہوا پہلے برف کی طرف یخ بستہ تھی پھر آگ کی طرح گرم ہوگئی۔ اس کے دستِ قدرت میں ہے۔ آگ کو اس نے جلانے کے لیے پیدا فرمایا چنانچہ تپش دینا جلا کر راکھ کر دینا اس کی خصوصیت ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو اللہ کریم نے براہ راست آگ کو حکم دیا، فرمایا: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیآء:69) ''ہم نے (آگ کو) حکم دیا

اے آگ! ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے سلامتی (کا سبب) بن جا"۔ یہاں بہت سے علماء حضرات کو دھوکا لگا ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ جو درخت جل رہے تھے وہ سرسبز ہو کر کھڑے ہو گئے۔ حق یہ ہے کہ اللہ کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ اے آگ تُو بجھ جا اور ان درختوں کو سرسبز کر دے بلکہ فرمایا آج تُو ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جا۔ یہی تو کمال ہے۔ فرمایا! اے آگ تُو جلتی رہ، شعلے لپکتے رہیں، فضاؤں میں بلند ہوتے رہیں لیکن ابراہیم کو ایسے محسوس ہو جیسے بادِ صبا انہیں لوریاں دے رہی ہے۔ فرمایا، آج تیرے شعلے بادِ بہاری بن جائیں، ایسی ٹھنڈی ہوجا کہ انہیں مزا آ جائے اور ٹھنڈ بھی تکلیف دہ نہ ہو بلکہ سلامتی والی ہو۔ ایسا نہ کرنا کہ برف کی طرح یخ بستہ ہو جائے۔ تُو جلتی رہ بھڑکتی رہ لیکن میرے خلیل کے لیے آج بادِ بہاری بن جا۔

چنانچہ شعلے لپکتے رہے، انگارے بنتے رہے آگ بھڑکتی رہی لیکن ابراہیم علیہ السلام کے لیے گل وگلزار بن گیا۔ وہ مزے سے اس میں پھرتے رہے۔ نسیمِ سحر چلتی رہی خوشبو کی لپٹیں آتی رہیں تو سیر کرنے کا مزا آ گیا! اس میں گھومتے پھرتے نکل کر وہ ہجرت کر کے چلے گئے اور نمرود شعلے دیکھتا رہا۔ وہ دور سے دیکھ رہا تھا کہ شعلے بھڑک رہے ہیں اور آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اُسے آگ بجھنے پر پتا چلا کہ وہ تو جا چکے ہیں۔ اللہ کیسا بے نیاز ہے اور مخلوق نیاز مند ہے۔ وہ محتاج نہیں ہے کہ پانی لاتا پھر آگ بجھاتا، اُسے ضرورت نہیں ہے۔ وہ اسباب وذرائع یا وسائل اختیار کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے کہ آگ اس کا حکم نہ مانتی۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے۔ وہ جسے جیسا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ وہ ایسا قادر ہے۔ اپنی ذات میں بے نیاز ہے۔ اس کی شانِ بے نیازی یہ ہے کہ پانی کو ذریعۂ حیات بنایا ہوا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تو وہی پانی جو زندگی کا سبب تھا کفار کے لیے موت کا سبب بن گیا۔ فرمایا: أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا (نوح:25) غرق کیے گئے پھر دوزخ میں داخل کیے گئے۔

سبحان اللہ! وہ کفار پانی میں غرق ہوئے لیکن پہنچ آگ میں گئے۔ ابراہیم علیہ السلام آگ میں گرے لیکن نسیمِ سحر کی گود میں چلے گئے۔ وہ بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ ساری مخلوق کا انحصار ایک دوسرے پر ہے، کچھ چیزوں پر ہے، کچھ عنایات پر ہے۔ اس کی عطا پر ہے لیکن اس بے نیاز کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ چاہے تو آگ کو بادِ بہاری کر دے۔ وہ چاہے تو پانی میں آگ بھر دے۔ وہ قادر ہے جیسا چاہے کرے۔ وہ اپنی ذات میں بے نیاز ہے۔ اسے کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ چار دن نمازیں پڑھ کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا اللہ پر بڑا احسان ہے اور پھر ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ اب دنیا میں ویسا ہونا چاہیے جیسا ہم چاہیں۔ اللہ کے بندے! نمازیں پڑھ کر تو تجھ میں بندگی آنی چاہیے تُو نمازیں پڑھ کر خدا بننا چاہتا ہے؟ کائنات میں تو وہی ہوگا

جو اللہ چاہے گا۔ بندہ تو خدا نہیں بن سکتا۔ تُو نمازیں پڑھ، وظیفے اور تسبیحات پڑھ، تہجد پڑھ تُو مزید بندہ بنے گا تُو اللہ کا شریک تو نہیں بن سکتا۔ وہ تو احد ہے، صمد ہے۔ اسے تیری کیا ضرورت! تیری نمازوں سے کیا اُس کی شان بڑھ جائے گی؟ تُو اس پر احسان کر رہا ہے؟ اگر تُو ساری عمر صرف سجدے ہی کرتا رہے تو اس کی کسی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ کس باریکی سے تیری تخلیق فرمائی، کتنے انعامات دیے۔ تیرے ایک ہی وجود میں کھربوں سیل (CELL) بنا رہا ہے، مٹا رہا ہے۔ ایک ایک سیل میں کیا کیا چیزیں رکھیں ہیں۔ تجھے خود بھی علم نہیں ہے کہ تیرے اندر کیا کیا ہے اور کب کیا ہو، کہاں ہو! تُو تو اتنا بے بس ہے کہ وجود تیرا ہے لیکن تجھے طبیب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے سامنے اپنا وجود پیش کر دیتا ہے وہ تیرا پیٹ کاٹ دیتا ہے اور تُو اسے فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ پیٹ تیرا ہے، وجود تیرا ہے اُس سے کیوں کٹوا رہا ہے؟ کہتا ہے، وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ پھر تُو اللہ کا شریک کب سے بن گیا کہ جو تو چاہے وہ ہو؟ کائنات میں وہ ہوگا جو وہ چاہے گا، وہ صمد ہے۔ کسی کی عبادت کا بھی محتاج نہیں ہے وہ ضرورت مند نہیں بلکہ ضرورت مند ہم ہیں۔ کسی نے بہت اچھا شعر کہا تھا:

منت منہ کہ خدمت سلطان مے کنی
منت او بداں کہ بخدمت گزاشتن

اگر تُو بادشاہ کی نوکری کر رہا ہے تو بادشاہ پر احسان نہیں کر رہا۔ یہ تو بادشاہ کا احسان ہے کہ اس نے تجھے نوکر رکھ لیا ہے ورنہ اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر کوئی عبادت کرتا ہے تو یہ اللہ کا اس پر احسان ہے کہ عبادت کی توفیق دے دی جسے چاہے دے دے۔ تُو نے اللہ پر کون سا احسان کر دیا کہ اب دنیا میں جو تُو چاہے وہی ہو؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

یہ بہت لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ میری دعا سے ایسا ہوا۔ کیا تُو اور کیا تیری دعا! اتنے وسیع نظام کی جسے تجھے سمجھ ہی نہیں ہے تُو اس میں کیا تبدیلی لا سکتا ہے! دعا تو اللہ کریم سے براہ راست بات کرنے کا بہانہ ہے اور یہ بہت بڑا مقام ہے ایک بندے کے لیے کہ وہ اللہ سے بات کر رہا ہو۔ دعا میں ایک عاجز مخلوق بارگاہِ الٰہی میں پہلے درود شریف پڑھتی ہے کہ بابِ رحمت وا ہو پھر اپنی گزارشات پیش کرتی ہے۔ اس کی دعا سے کام نہیں ہونا کہ ہونا وہ ہے جو وہ بے نیاز چاہتا ہے۔ دعا کرنے والے کو اپنے اللہ سے ہمکلام ہونے کا شرف مل گیا۔ یہ بہت بڑا مقام ہے کہ ایک بندہ اللہ سے بات کر رہا ہو اور اس سے زیادہ دعا کچھ بھی نہیں ہے لیکن یہ کتنی عظمت ہے! جس کی بات گھر میں کوئی نہیں سنتا بھلا اس کی دعا سے کائنات میں کیا بدل جائے گا؟ سب فیصلے وہ خود کرتا ہے اس لیے کہ وہ صمد ہے۔ اسے کسی سے پوچھنے کی یا مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کریم ہے اپنے کرم سے اپنی کائنات اپنی پسند سے چلا رہا ہے۔ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے کہ اللہ ایک ہے احد ہے اور وہ بے نیاز ہے، صمد ہے۔

فرمایا: لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے۔ وہ کسی چیز سے بنا نہ آگے اس سے کوئی بنا۔ ساری مخلوق کا ایک انداز ہے۔ ہر شے کی ایک بنیاد ہے، کسی چیز سے بنتے ہیں پھر آگے ان سے ایک چیز بنتی ہے۔ کوئی OUTPUT ہوتی ہے۔ ہر مخلوق کے والدین ہیں، اولاد ہے۔ جن اور انسان اجزا سے بنے ہیں پھر آگے ان سے اجزا ہیں۔ فرشتہ نوری مخلوق ہے۔ اس میں نر و مادہ نہیں ہے توالدو تناسل نہیں ہے لیکن تخلیق تو ہوا۔ ایک نوری مادّے سے ہی سہی لیکن ایک مادّہ تو ہے جس سے بنا۔ قیامت کے دن موت اسے بھی آئے گی، مٹ جائے گا۔ قیامت کے روز، سوائے اُن کے جنہیں اللہ چاہے، جنہیں استثنٰی دی ہے باقی تمام مخلوق فنا ہوجائے گی۔ مخلوق سب فانی ہے۔ سب کے اجزا ہیں اور آگے ان سے اجزا بنتے ہیں۔ یہ صرف وہ اللہ ہے جو کسی کی اولاد ہے نہ اس کی آگے کوئی اولاد ہے۔ وہ از خود ہے۔ یہاں یہ تصور بھی باطل ہو گیا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہود کا تصور کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں کا عقیدہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں وہ بھی باطل ہوگیا۔ فرمایا: لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا ہے۔ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ آگے کوئی انتہا ہے۔ وہ کسی سے ہے نہ کوئی آگے اس سے ہے۔ وہی اوّل ہے، وہی سب سے آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے۔ سب سے آشکارا بھی وہی ہے اور وہی باطن ہے کہ سب سے پوشیدہ راز بھی وہی ہے۔ سب سے نہاں بھی وہی ہے۔ سب سے عیاں بھی وہی ہے۔ وہی ایک اپنی ذات میں یکتا ہے وہ احد ہے۔ یہ ساری تشریح احد کی ہو رہی ہے۔ احد بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کا انحصار کسی پر نہیں ہوتا، اس لیے وہ بے نیاز ہے۔ کیسا احد ہے کہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اس سے آگے کوئی بنا نہ وہ کسی سے بن گیا۔ وہ اپنی ذات میں خود ہی ہے۔ وہ سب کو بنانے والا ہے لیکن اُسے کوئی بنانے والا نہیں۔ اس کا علم اس کا ذاتی ہے کوئی اُسے سکھانے والا نہیں ہے۔ اس کی صفات اس کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اس کی صفات میں کوئی کمی بیشی کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی بت، کوئی جانور، کوئی مکاں، کوئی انسان کسی میں ربّ کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ کوئی نبیؑ، کوئی صحابیؓ، کوئی ولی، کوئی پیر فقیر ربّ کا شریک نہیں ہے۔ وہ احد ہے، واحد ہے لاشریک ہے بے نیاز ہے۔ کسی کا جزو ہے نہ آگے اس کا کوئی جزو ہے اور: وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ اور کوئی اس کی برابری کرنے والا نہیں۔

یہاں بات ختم ہوجاتی ہے کہ کسی بھی طرح، کسی صفت میں کوئی بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہ حتمی بات ہے۔ ہر کمال میں وہ یکتا ہے۔ سمع ہو، بصارت ہو، کلام ہو کوئی صفت ہو ہر کمال میں وہ بے مثال ہے۔ مخلوق ہمہ وقت اس کی محتاج ہے وہ بے نیاز ہے۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ وہ احد ہے۔

سورۃ الاخلاص کی فضیلت :

علما، فرماتے ہیں کہ یہ سورۂ مبارکہ تہائی قرآن ہے۔ اگر تین دفعہ اس کی تلاوت کی جائے تو ختمِ قرآن کے برابر ثواب ملتا ہے۔ وہ بجا فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے تیس پاروں میں سے تقریباً دس پاروں میں توحیدِ باری کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک تہائی حصہ قرآن کریم کا توحیدِ باری پر ہی بحث کرتا ہے اور وہ ساری ان چار آیات میں سمو دی گئی ہے۔ جتنی توحیدِ باری تیس پاروں میں ارشاد فرمائی ہے اس کا ماحصل، اُس کا جو مغز ہے، جو نتیجہ ہے وہ سارا ان چار مقدس آیات میں اللہ کریم نے سمو دیا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝١ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرما دیجیے تا کہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ اللہ کی یکتائی پر کوئی سمجھوتہ ممکن ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ سب کو سچ مان لیا جائے۔ احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل ضروری ہے۔ ایک ہی سچ ہے کہ اللہ ہی احد ہے۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝٢ وہ اکیلا بے نیاز ہے۔ اس کے علاوہ سب محتاج ہیں، نیاز مند ہیں۔ ایک وہ اکیلی ذات ہے جسے کوئی احتیاج نہیں، وہ اسباب اور نتائج خود پیدا کرتا ہے۔ قادرِ مطلق ہے جو چاہے کرے۔ وہ چاہے تو پانی کو حیات کی بجائے موت کا سبب بنا دے، چاہے تو آگ کو بادِ بہاری بنا دے۔ وہ چاہے تو پانی میں ڈوبنے والوں کو آگ میں پہنچا دے۔ وہ چاہے تو آگ میں گرنے والوں کو گلزار میں کھڑا کر دے۔ وہ جو چاہے کرے۔ چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝٣ وہ کسی کا جزو ہے نہ اس کی ذات سے آگے کوئی جزو ہے۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝٤ کسی اعتبار سے، ذات یا صفات میں کوئی بھی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

لمحہ فکریہ :

اس سورۂ مبارکہ میں تبلیغ کا بہترین انداز تعلیم فرمایا گیا ہے۔ اسلام کو بہتر انداز میں پیش تو کیا جا سکتا ہے، کسی پر زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ پھر دعوت دینے کے آداب بھی قرآن نے تعلیم فرمائے ہیں۔ بہترین انداز وہی ہے جو اللہ نے انبیاؑ کو تعلیم فرمائے۔ آج کل کی مروجہ طنزیہ تقریریں درست نہیں ہیں۔ یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ دوسروں کی محض عیب جوئی کرنا انہیں باطل اور دوزخی ثابت کرنا لعنت ملامت کرنا شرعی قاعدہ نہیں ہے۔ بھلا فرعون جیسا برا کون ہوگا؟ چار صدیاں فراعنہ مصر لوگوں سے سجدے کراتے رہے اور لوگ نسلاً بعد نسلاً ان کی پوجا کرتے رہے۔ جب اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور انہیں فرعون کی طرف بھیجا تو حکم دیا کہ اس سے بات نرمی

سے کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کا مزاج من جانب اللہ تیز تھا۔ اُن کو ایسے شخص کے پاس بھیجا گیا جو سخت متکبر خدائی دعویدار ہے لیکن یہ کہا جا رہا ہے اس سے بات نرمی سے کریں۔ وہ قیامت کو یہ نہ کہہ سکے کہ تیرے نبیؑ نے مجھے طعنے دیے تھے اس لیے بات سمجھ نہیں سکا۔

آج اگر کوئی باطل فرقہ ہے، کوئی گمراہ ہے تو فرعون سے تو کم ہی ہو گا تو ہمیں چاہیے کہ اس کے سامنے حق پیش کریں۔ پیار اور نرمی سے بات کریں۔ اس پر طعن و تشنیع اور فتوے لگانے سے گریز کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی تکلیفیں برداشت کیں، دکھ اٹھائے زخم سہے اور مالی، جسمانی، مادّی تکلیف اٹھائی لیکن کبھی کافروں پر بھی بددعا نہیں فرمائی۔ طائف کے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے گئے تو اللہ کریم نے ملک الجبال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالی میں بھیجا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے طائف کے پہاڑوں کو اہلِ طائف پر الٹا دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک الجبال سے بات کرنے کی بجائے بارگاہِ الٰہی میں دستِ مبارک اٹھا دیے اور اہلِ طائف کے لیے عفو و درگزر کی دعا فرمائی۔ یہ عذر پیش کیا کہ یہ لوگ مجھے اپنا قریشی بھائی سمجھ کر پتھر برسا رہے ہیں انہیں یہ نہیں پتا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اے اللہ! یہ مجھے نہیں جانتے۔ اگر انہیں ایمان نصیب نہیں ہے تو ان کی اولادوں میں سے شاید کسی کو ایمان نصیب ہو جائے۔ ان پر پہاڑ نہ اُلٹا۔ انہیں بخش دے۔ یہ طریقہ تبلیغ سکھایا ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعلانِ حق بتانے میں طریقہ محبت آمیز ہونا چاہیے لیکن حق بتانے میں کوئی رعایت نہ ہو۔ حق اور باطل کو خلط ملط نہ کیا جائے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک ہے۔ آج کل یہ کام ہمارے ملک میں اتحاد بین المذاہب کے نام سے سرکاری طور پر شروع کیا گیا ہے۔ مذہبی ہم آہنگی کے نام سے یہ نہیں کیا جا سکتا کہ سارے سچ ہیں۔ یہ ہم آہنگی تو ہو سکتی ہے کہ جسے جو عقیدہ پسند ہو وہ اپنائے لیکن یہ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا کہ سارے ٹھیک ہیں، سارے سچ ہیں۔ سچ ایک ہوتا ہے۔ ہاں یہ بتانے کا طریقہ شریفانہ ہو گا۔ اس میں تہمت یا توہین نہیں ہو گی محبت ہو گی لیکن بات کھری ہو گی کہ کسی کو غلط فہمی نہ رہے۔

سورۃ الفلق رکوع 1 آیات 1 تا 5

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿١﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿٢﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿٣﴾
وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿٤﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾

کہہ دیجیے کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ﴿١﴾ ہر چیز کی برائی سے جو اُس نے پیدا کی ﴿٢﴾ اور شبِ تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے ﴿٣﴾ اور گرہوں پر (پڑھ کر) پھونکنے والیوں کی برائی سے ﴿٤﴾ اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے ﴿٥﴾

تفسیر و معارف

سورۂ فلق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

نظرِ بد اور جادو:

فرمایا، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿١﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿٢﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿٣﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴿٤﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾ ربِّ کریم نے جس طرح اسبابِ ظاہری پیدا فرمائے ہیں جنہیں ہر آدمی دیکھتا ہے سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر عمل ہر فعل کی کچھ کیفیات بھی ہیں۔ کیفیات نظر تو نہیں آتیں لیکن صاحبِ ادراک محسوس کر لیتا ہے۔ ظاہری اسباب کو دیکھنے کے لیے تو ظاہری نگاہ چاہیے۔ کیفیات کو محسوس کرنے کے لیے دل کی نگاہ چاہیے ہوتی ہے۔ جس طرح اسبابِ ظاہری کے نتائج ہیں آپ کسی کو پتھر ماریں اُس کا اثر ہوگا۔ ڈھیلا ماریں اور اثر ہوگا۔ لاٹھی مارتے ہیں اور اثر ہوگا۔ گولی مارتے ہیں اور اثر ہوگا۔ دھکا دیتے ہیں ایک اور اثر ہوگا۔ ہر فعل کا ایک نتیجہ ہے اور یہ ہمیں سامنے نظر آتا ہے۔

اسی طرح بعض انسانی سوچوں کا اثر ہوتا ہے جیسے نظرِ بد ہے۔ یہ ایک انسانی احساسات کا اور سوچوں کا اثر

ہے۔ جب کسی کے دل میں ایک حسد بھری حسرت پیدا ہوتی ہے تو اُس سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو اگلے کو جس کے متعلق پیدا ہوئی اُس کو نقصان پہنچا جاتی ہیں۔ بظاہر نظر نہیں آتیں لیکن وہ کیفیات ہوتی ہیں اور اُن کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کا ایک علم، جادو بھی ہے۔ یہ نظر کی کیفیات جو ہیں یہ تو محض انسانی احساسات پر ہیں۔ جادو میں دو چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک تو انسانی احساسات ہوتے ہیں کسی کے بارے، اُس کی بُرائی چاہتا ہے نقصان کرنا چاہتا ہے۔ ایک وہ FEELINGS اور وہ کیفیات ہوتی ہیں۔ دوسرا یہ ہوتا ہے کہ جادو میں شیطان کا بہت عمل دخل ہوتا ہے اور بنیادی طور پر جادوگروں کو شیطان تعلیم کرتا ہے۔ وہ ایسے کلمات سکھاتا ہے جو سخت مشرکانہ اور کفریہ ہوتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو شیطان کوشش کرتا ہے کہ اُس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ دکھایا جائے تاکہ جادوگر کو اطمینان رہے کہ میرے کام کا اثر ہے پھر لوگوں کو اعتبار آئے اور لوگ اُس کا کہا مانیں۔ جادوگر سمجھتا ہے کہ جنّ یا شیطان اُس نے قابو کر رکھا ہے لیکن دراصل شیطان اسے استعمال کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہا ہوتا ہے۔ شیطان کا کام تو گمراہی پھیلانا ہے۔ اُس کو کسی کے نفع نقصان سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن اس طرح سے جادوگر کا کمال ثابت ہونے پر لوگ جادوگر کی بات ماننا شروع کر دیتے ہیں اور خود جادوگر شیطان کی مان رہا ہوتا ہے۔ اُلٹے سیدھے کام کرتا ہے۔ اُلٹے سیدھے نظریات اختیار کرتا ہے، عقائد تباہ ہو جاتے ہیں، کردار تباہ ہو جاتا ہے تو لوگ بھی اُس کے پھندے میں آ کر اُس طرح کے عقائد میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اُس طرح کا کردار اختیار کر لیتے ہیں۔ بظاہر جادوگر یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے جنّ قابو کر رکھے ہیں۔ اُسے آپ عامل کہہ لیں جادوگر کہہ لیں تو اُس نے جنّ قابو کر رکھے ہیں اُس کی بات مانتے ہیں لیکن جنات اور شیاطین کو پتا ہوتا ہے کہ ہم اسے آلۂ کار بنا کر مخلوقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ دراصل جادوگر خود شیاطین کا اسیر ہوتا ہے۔

ان سورتوں میں گیارہ آیات ہیں یہ دونوں آخری سورتیں ہیں۔ ان کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا۔ مشرکینِ مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے کا کوئی طریقہ رہنے نہ دیا۔ ہر طرح سے مشرکین و کفار نے ایذا کی کوشش کی تو یہ ایک یہودی تھا، مفسرین اس کا نام لبید بن عاصم بتاتے ہیں۔ یہ اور اس کی بیٹیاں مل کر جادو کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس کام میں عورتوں کو بڑا دخل ہے یعنی مردوں کی نسبت عورتوں کا جادو زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ شاید اُس کی وجہ یہ بھی ہو کہ عورتوں میں مردوں کی نسبت حسد زیادہ ہوتا ہے۔ عورتیں معمولی معمولی بات پر ضد کرنے لگتی ہیں۔ اس کا کپڑا مجھ سے اچھا کیوں ہے، اس کا چہرہ مجھ سے اچھا کیوں لگ رہا ہے۔ اس کا جوتا مجھ سے اچھا کیوں ہے! چھوٹی چھوٹی باتوں پر حسد کرنے لگے جاتی ہیں تو جتنی حسد کی کیفیت کسی وجود میں زیادہ ہوگی اتنا یہ چیزیں اُس سے زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ تو وہ اپنی بیٹیوں کو بھی ساتھ رکھتا تھا اور اُن سے جادو کروایا کرتا تھا۔ چنانچہ اُس کی خدمات لی گئیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سے ایذا دی جائے۔

اُنہوں نے کوشش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ نے عمر بھر بال مبارک کانوں تک رکھے عادتِ مبارک تھی کہ کانوں کے آدھ تک بال مبارک رکھتے تھے پھر وہ بڑھتے رہتے، بڑھتے رہتے جب شانہء مبارک تک آجاتے تو پھر آدھ تک کٹوا دیے جاتے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارک تھی۔ مشرکین نے کہیں سے موئے مبارک حاصل کیے اور نہایت تیز اور سخت قسم کا جادو جو شیطان نے انہیں سکھایا کرنے کے لیے پھر وہ شیطانی کلمات پڑھ کر ایک کنگھی لے کر اُس میں گرہیں لگائیں۔ گیارہ گرہیں اُنہوں نے لگائیں۔ پھر کوئی ویران کنواں تھا اُس میں اُتر کر اس کنگھی کو کسی پتھر کے نیچے دبا دیا۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے اور زبان مبارک سے کچھ اور نکل جاتا تھا لیکن یہ ساری باتیں فضول ہیں۔ یہ اس لیے فضول ہیں کہ ارشاداتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کی طرف سے حفاظت حاصل ہے۔ اگر زندگیء مبارک میں یہ مان لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا کچھ اور چاہتے تھے اور فرمایا کچھ اور اب سننے والوں نے تو اُس پر عمل کرنا ہے جو اُنہوں نے سُنا تو اس طرح تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے کہ اب کون سا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوش میں فرمایا اور کون سا حکم معاذ اللہ بے ہوشی میں لب مبارک سے نکل گیا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اور کہنا چاہتے تھے اور ادا کچھ اور ہو گیا تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا، ناممکن ہے چونکہ حفاظتِ الٰہیہ حاصل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری حدیث بھی وحی ہے اور وحی کو ہمیشہ حفاظتِ الٰہیہ حاصل رہی ہے، اُس میں شیطان مداخلت نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علیل ہو گئے، یہ بھی غلط ہے۔ ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کر لیا کہ کچھ غلط کام کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک فطری بات ہے ہر صحیح الطبع آدمی، آپ کا ہر خادم جس کا مزاج درست ہے کو بات کھٹک تو جائے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محسوس کرنے پر وحیء الٰہی آئی۔ جبرائیل امین تشریف لائے عرض کی، یا رسول اللہ! فلاں شخص نے اس طرح جادو کر کے موئے مبارک فلاں کنویں میں پتھر کے نیچے دبا دیے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدام کو حکم دیا، صحابہ کرامؓ گئے۔ کنوئیں کی نشاندہی بھی تھی، پتھر کی بھی تھی۔ نیچے اُترے پتھر اٹھایا تو نیچے ایک کنگھی پڑی ہوئی تھی، لے آئے۔ اُس میں موئے مبارک الجھا کر گرہیں لگائی گئیں تھیں۔ جو گیارہ گرہیں تھیں۔ انسانی بال کو گرہ لگا دی جائے تو اُس کا کھولنا آسان نہیں ہوتا۔ ان دونوں سورتوں میں کل گیارہ آیتیں ہیں۔ جبرائیل امین ایک آیہء کریمہ پڑھتے جاتے تھے اور وہ گرہ کھلتی جاتی تھی۔ یوں گیارہ آیات پڑھنے کے بعد گیارہ گرہیں کھل گئیں اور اُس کا وہ سارا اثر ختم ہو گیا، جاتا رہا۔

عظمتِ نبوت:

یہ باتیں درست نہیں ہیں کہ جادو کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم علیل ہو گئے۔ ہاں! آپ نے محسوس فرما لیا۔ یہ جو جادو کا زور ہے یہ صدیوں بعد بھی، ہزار سال پندرہ سو سال بعد بھی، آج بھی کسی ولی اللہ پر بھی کیا نہیں جا سکتا بطفیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ اُس کی حفاظت فرماتے ہیں۔ یہ ایک حد تک چونکہ انسانی کیفیات سے متعلق ہے تو اس میں ایک عجیب بات ہوتی ہے کہ انسانی کیفیت یا تو اگلے پر اثر انداز ہوتی ہے یا واپس خود اُس پر لوٹ آتی ہے۔

آپ کسی کے ساتھ حسد یا آپ کسی کا مذاق اُڑاتے ہیں تو خیال تو یہ ہوتا ہے کہ اُسے تکلیف ہو گی لیکن وہ اگر مسکرا رہا ہے اُس کی پروا نہیں کرتا خوش رہتا ہے تو وہ جو دکھ آپ اُسے دینا چاہتے تھے وہ پریشانی آپ پر آ جاتی ہے کہ یار میں نے اتنی جھک ماری اس کا بگڑا تو کچھ نہیں! اسی طرح کسی کو آپ گالی دیتے ہیں وہ کہتا ہے چھوڑ یار کیا غلط باتیں کرتا ہے تو بندہ حیران رہ جاتا ہے وہ جو اُس پر غصہ نکالنا چاہتا تھا اس کا اثر اپنی طبیعت پر آ جاتا ہے۔ گرانی اپنی طبیعت پر آ جاتی ہے۔

اسی طرح جو جادو کرتا ہے اُس میں شیطان کا عمل دخل بھی ہوتا ہے اُس کی ذاتی کیفیات بھی ہوتی ہیں۔ اگر اگلے پر اثر نہیں کرتا تو واپس جادوگر پر پلٹ آتا ہے پھر وہ پریشانیاں خود اُسے بھگتنا پڑتی ہیں۔ اس لیے جادوگر بڑی احتیاط کرتے ہیں تو یہ میرے تجربے میں بھی ہے کہ اہلِ اللہ پر کسی نے جادو کرنے کی کوشش کی تو خود تباہ ہو گیا۔ اگر ایک عام ولی اللہ پر، پندرھویں صدی کے انسان پر بھی اللہ کی حفاظت ایسی ہے کہ اگر وہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہے تو جادو کرنے والا جادوگر خود ہلاک ہو جاتا ہے تو عظمتِ نبوت کہاں! یہ جہلا میں بات پھیلا دی گئی جادو برحق ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہو گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے تھے۔ بھئی جادو ظلم ہے۔ برحق کہاں سے آ گیا۔ حرام ہے ناجائز ہے، ظلم ہے۔ ہاں! ہو سکتا ہے ایسے ہی ہے جیسے ظاہری آپ کسی کو چوٹ لگاتے ہیں تو اثر ہوتا ہے وہ بھی اس طرح کی ایک چوٹ ہے لیکن ظاہری چوٹ میں بھی ایک کمزور آدمی ایک پتھر پھینکتا ہے تو آگے سے ایک طاقتور آدمی اُس کا ہاتھ بھی پکڑ لیتا ہے۔ اُس کا بگڑتا کچھ نہیں۔ اسے لگ بھی جائے تو اُس کا بگڑتا کچھ نہیں۔ اس میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

جادو، دکھ، پریشانی کا علاج:

اگر کوئی مسلمان باوضو رہنے والا، نماز پڑھنے والا، حلال کھانے والا، سچ بولنے والا، باکردار ہے تو وہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ وہ جادو واپس ہی پلٹتا ہے۔ اللہ اُس کی حفاظت فرماتا ہے تو اگر جادو کا اثر ہے تو جادو سے بچنے کا اثر جو

ہے وہ بہت یقینی ہے کہ آپ نماز، روزہ کریں، حلال کھائیں، پاک رہیں، سچ بولیں کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھی کوئی تکلیف یا گرانی محسوس ہوتی ہے تو یہ گیارہ آیات اپنے اوپر پڑھ کر دم کرلیں چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھر عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ ان کے نزول کے بعد کوئی بھی تکلیف ہوتی کوئی بخار، درد، تکلیف، زکام کچھ بھی ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھ کر دستِ اقدس پر دم فرما کے جسم اطہر پر پھیر لیا کرتے تھے تو ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے۔ اُس کے پاس جادو کا، بیماری کا، دکھ کا، پریشانی کا علاج ہے کہ یہ دو سورتیں پڑھ کر، اوّل آخر درود شریف پڑھ کر طاق مرتبہ یعنی تین، پانچ، سات، گیارہ مرتبہ پڑھ کے ہاتھ پر دم کر کے اپنے سارے جسم پر پھیرے۔ ان میں اُس قادرِ کریم، اُس قادرِ مطلق سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے جو ہر چیز کا خالق ہے اور اُن میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے۔

ظاہری چیزیں جن سے آپ ضرب لگاتے ہیں وہ بھی اُس نے پیدا کیں اُن میں ضرب لگانے کی طاقت بھی اُسی نے پیدا کیں۔ باطنی کیفیات کا خالق بھی وہی ہے اور اُن میں وہ قوت یا طاقت یا تاثیر پیدا کرنا بھی اُسی کا کام ہے لہٰذا اِن آیات میں حکم دیا گیا فرما دیجیے کہہ دیجیے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ ''کہہ دیجیے کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہر چیز کی برائی سے جو اُس نے پیدا کی''۔ کہ میں پناہ مانگتا ہوں اُس پروردگار کی جو تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح طلوع کر دیتا ہے۔ عملی زندگی میں بیماری دکھ تکلیف زندگی پر تاریکی بن کر چھا جاتا ہے۔ فرمایا جو گہری رات کی تاریکیوں کا سینہ پھاڑ کر طلوعِ فجر کر دیتا ہے اُس پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ ہر چیز کے شر اور ایذا سے جو اُس نے پیدا فرمائیں چونکہ دکھ دینے والی ساری چیزیں کا خالق بھی تو وہی ہے۔ سانپ بچھو ہے یا درندہ ہے یا زہرِ قاتل ہے یا گولی ہے۔ اُس میں بھی تو تاثیر اُسی نے رکھی ہے۔ ہر چیز کا خالق وہی ہے تو فرمایا، میں اُس ربِّ کریم کی پناہ مانگتا ہوں جو اندھیروں کا جگر پھاڑ کر صبح روشن کر دیتا ہے۔ ہر چیز کی برائی سے جو بھی اُس نے پیدا فرمائی، مخلوق میں جو بھی دکھ دینے والی چیز ہے اُس کے دکھ دینے کے اثرات سے۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ ''اور شبِ تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے''۔ اور شبِ تاریکی تاریکی سے، نہایت اندھیری شب کے اندھیروں سے، جب وہ چھا جاتی ہے۔ زندگی اور زندگی کے آرام، صحت، سلامتی روزِ روشن کی طرح ہے۔ بیماری شبِ تار کی طرح ہے چلتے پھرتے بندے کو بستر پر ڈال دیتی ہے۔ ہوشمند کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ اچھے بھلے کھانے پینے والا بندہ، کھانے پینے سے رہ جاتا ہے۔ نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ دردیں شروع ہو جاتی ہیں۔ زندگی پر ایک طرح کی تاریکی چھا جاتی ہے تو فرمایا، اُس کیفیت سے جو شبِ تار کی طرح چھا جائے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اُس کے شر سے۔ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾ ''اور گرہوں پر (پڑھ کر) پھونکنے والیوں کی برائی سے''۔ اور عورتوں کی اُن حرکات سے جو اُنہوں نے گرہیں لگا کر اُس پر پھونکیں ماریں۔ یہ اُسی یہودی لبید کی بیٹیاں تھیں اور میں

نے عرض کیا کہ جادوگر کوشش کرتے تھے کہ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے یہ عمل کرایا جائے چونکہ اس میں جو کیفیات اور محسوسات ہمارے اندر کی ہیں اُن کا بڑا دخل ہوتا ہے تو اِس میں حسد کی ایک کیفیت چاہیے کہ اگلے کے ساتھ حسد ہو۔ مرد بھی حاسد ہیں اور بڑا بڑا حسد کرتے ہیں لیکن فطری طور پر عورتوں میں حسد کی کیفیت بہت زیادہ ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی حسد کرتی ہیں اور بڑا زیادہ کرتی ہیں۔ فرمایا، اُن گرہوں پر پھونکنے والی عورتوں کی برائی سے۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝ اور ہر حسد کرنے والے کے حسد کی برائی سے یعنی جتنی کیفیات نقصان دینے والی، دکھ پہنچانے والی مردوں کی طرف سے ہوں یا خواتین کی طرف سے ہر دشمن کی طرف سے جو آسکتی ہیں۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ کریم جو خالق ہیں چیزوں کا بھی اور اُن کے اثرات کے بھی اُن کی پناہ مانگ لی گئی ہے تو اب اتنا بڑا تحفظ حاصل ہو گیا کہ کسی دکھ، کسی ایذا، کسی پریشانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ اُنہیں ہرگز توفیق نہ ہوتی وہ ایسا کر ہی نہ سکتے یہ سب ہوا تعلیم اُمت کے لیے کہ کفار و مشرکین بدکار اور بے دین لوگ، بھلے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اسے پیشہ بنالیں، لوگوں کو ایذا دیں گے، لوگوں کے عقائد خراب کریں گے تو بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پوری امت کو اُس کا ایک رڈ اور علاج تحفظ عطا کر دیا گیا۔ اس میں کسی بزرگ کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی پیر فقیر کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بہت پارسا کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی بہت عالم و فاضل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر مسلمان کو یہ اجازت دے دی اللہ کریم نے کہ یہ دو سورتیں یاد رکھے۔ جب بھی کوئی دکھ محسوس کرے جادوگر کے جادو کی تکلیف ہو، جنات پریشان کر رہے ہوں، حالات خراب ہو رہے ہوں بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ گناہوں میں مبتلا ہو جائے تو بھی یہ سورتیں پڑھنا شروع کر دے تو اللہ کریم حفاظت فرماتے ہیں، ہدایت فرما دیتے ہیں۔ کہیں سے زندگی راہ سے بھٹکتی ہوئی نظر آئے تو ہر مسلمان کو عافیت کے لیے اللہ نے یہ نسخہ دے دیا جو بہترین ہے۔

دعا کے لیے علمائے حق فرماتے ہیں کہ درود شریف ایسی دعا ہے کہ ہمہ وقت قبول ہے کبھی رڈ نہیں ہوتی۔ إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (الاحزاب:56) اللہ کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج رہے ہیں۔ فرشتے درود بھیج رہے ہیں آپ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام پڑھیے، مومنین کو حکم دیا جا رہا ہے۔ شیطان کے ہتھکنڈے بھی بڑے عجیب ہیں۔ اللہ ہی اس سے بچائے تو جس بندے کی پچاس ساٹھ سال عمر ہو جائے وہ بڑا اتراتا ہے کہ اسے بڑا تجربہ ہے یاد رکھو! شیطان آدم علیہ السلام سے پہلے کا ہے اس کے تجربے کا اندازہ کرلو۔ یہاں بھی اس نے لوگوں کو ایسا گمراہ کیا اگلے دن ایک سوال تھا جی ہم اللہ کی سنت پر عمل کیوں نہ کریں؟ اور تقابل دیا گیا تھا کہ سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یا عام عبادت پر عمل کیا جائے یا اللہ کی سنت پر عمل کیا جائے۔ اللہ کی سنت کیا ہے؟ اللہ درود بھیج رہا ہے۔

ظالمو! اللہ تمہاری طرح بیٹھ کر دعا نہیں مانگ رہا۔ ہمارا درود اور فرشتوں کا درود بھی یہ ہے کہ فرشتے بھی دعا کرتے ہیں یا اللہ! آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتیں نازل فرما ہمارا درود بھی یہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! حضور پر رحمتیں نازل فرما۔ اللہ کا درود یہ نہیں کہ اللہ کسی سے مانگ رہا ہے اللہ کا درود یہ ہے کہ اللہ ہمہ وقت رحمتیں نازل فرما رہا ہے تو تم اللہ کی سنت پر عمل کیسے کرو گے کیا تم رحمتیں نازل کرو گے؟ تو پھر اللہ کی سنت پر عمل کیسے کرلیا تم نے؟ شیطان یہاں بھی چکمہ دے جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں واہ واہ جی مولانا نے بڑی بات کی اور مولانا کو خود پتا نہیں کس کی بات کر رہے ہیں۔ مولانا کو یہ شیطان نے سکھادی اب یہ عقیدے میں کتنا فتور آ گیا۔ درود شریف پڑھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے میں وہ کام کر رہا ہوں جو اللہ کیا کرتا ہے۔ خدا کے بندے! اللہ کا درود یہ ہے کہ وہ میری اور آپ کی طرح کسی سے دعا نہیں مانگتا اللہ کریم کا درود یہ ہے کہ وہ خود رحمتیں مسلسل نازل فرماتا رہتا ہے۔ یہ اُسی کا کام ہے بندہ نہیں کرسکتا۔ بندے نے سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ السلام پر ہی عمل کرنا ہے تو یہاں بھی شیطان چکمہ دے گیا اور روزِ حشر بات جب کھلے گی تو کتنی بڑی بات ہے۔ بہرحال میں نے تو کوشش کی سمجھانے کی، سمجھ دینا اللہ کا کام ہے۔ لوگ بعض گمراہیوں کو دین سمجھ کر چمٹے رہتے ہیں اسے دین سمجھ کر کرتے ہیں بے چارے سادہ لوگ!

علمائے حق کا ارشاد ہے کہ یہ دعا ہمہ وقت مقبول ہے چونکہ اس پر عمل ہو رہا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتیں نازل فرما تو وہ رحمتیں نازل فرما رہا ہے۔ اب آپ کوئی دعا کرتے ہیں اُس کے پہلے بھی درود شریف پڑھتے ہیں آخر میں بھی درود شریف پڑھتے ہیں تو یہ وہ دعا ہے جو ہمہ وقت مقبول ہے کہ ایسا ہو رہا ہے تو وہ کہتے ہیں، عظمتِ باری سے بعید ہے کہ پہلی بات بھی مان لی جائے، آخری بھی قبول فرمالی جائے لیکن درمیان کی چھوڑ دی جائے، یہ اُس کی شانِ کریمی سے بعید ہے لہٰذا اس کے طفیل تمہاری بات بھی قبول ہو جائے گی دعا کے لیے بہتر ہے کہ درود شریف پہلے بھی پڑھا جائے آخر بھی پڑھا جائے۔ ان آیاتِ مبارکہ، ان دو سورتوں کو میں تو سمجھتا ہوں کہ بندہ روزانہ ایک آدھ مرتبہ تو یہ سورتیں پڑھ کر اپنے اوپر پھونک مارلے تو برکات رہتی ہیں۔ ہم ہمہ وقت خطا میں گرفتار ہیں مختلف خیالات میں اسیر رہتے ہیں شیطانی وساوس میں اسیر رہتے ہیں۔ بعض ساتھیوں کے خطوط بھی آتے ہیں ای میل بھی آتی ہے بڑے وساوس آتے ہیں اُن کا بھی یہ علاج ہے کہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں پانی پر پھونک مار کر پی لیں تو ان میں ہر طرح کی شفا ہے۔ آپ نے دیکھا یہ جو ہم نے تلاوت کرنے کا شرف حاصل کیا ہے ان میں بھی اور جو باقی رہ گئی ہیں پانچ ہم نے تلاوت کی ہیں چھ رہ گئی ہیں اُن میں بھی ہمہ گیر قسم کی ہر دکھ ہر تکلیف کا، ہر ہر پریشانی کا مداوا ہے اور ہر مسلمان کے لیے ہے، قرآنِ کریم کا حصہ ہیں۔ ہر مومن کو چاہیے، جو اپنے آپ کو صحتمند صحیح سمجھتا ہے اُسے بھی چاہیے کہ ایک آدھ بار پھونک مار کر اپنے اوپر یا پانی پر دم کر کے پی بھی لے تو بہت اچھا علاج بھی ہے۔

سورۃ الناس رکوع 1 آیات 1 تا 6

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

کہہ دیجیے کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں ﴿۱﴾ لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی ﴿۲﴾ لوگوں کے معبودِ برحق کی ﴿۳﴾ وسوسہ ڈالنے والے کی برائی سے جو (اللہ کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے ﴿۴﴾ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے ﴿۵﴾ جنات میں سے اور انسانوں میں سے ﴿۶﴾

تفسیر و معارف

الحمدللہ! سورۃ الناس مکی سورتوں میں سے ہے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ دونوں آخری سورتیں الفلق اور الناس یکجا ہیں یہ گیارہ آیات ہیں۔ ان کا شانِ نزول گذشتہ سبق میں عرض ہو چکا۔ اجمالی طور پر دہرائے دیتا ہوں۔ جس طرح انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے بے شمار مختلف طریقے ہیں حیات کے بے شمار سلیقے ہیں بہت سے ہمیں نظر آتے ہیں لیکن بہت سے ایسے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے جو ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتے صرف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے غذا ضروری ہے۔ غذا کا صحت بخش ہونا، صحت کے قابل ہونا ضروری ہے لیکن اگر کسی کو صحت بخش اور اچھی غذا بھی دی جائے بروقت بھی دی جائے لیکن اُسے پیار نصیب نہ ہو ہمہ وقت جھڑکتے رہیں تو اس سے اُسے وہ صحت نصیب نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ پیار کیا ہے؟ ایک کیفیت ہے وہ نظر نہیں آتی لیکن اُس ظاہری غذا سے اُس کا اثر زیادہ ہے۔ کتنے مرض ایسے ہیں جن میں آج بھی ڈاکٹر یہ رائے دیتے ہیں کہ علاج بھی بڑا قیمتی ہے مشکل ہے بڑی محنت سے ہم کر رہے ہیں لیکن اصل علاج اس مرض کا یہ ہے کہ آپ مریض کو خوش رکھیں۔ اگر یہ پریشان ہوگا

تو یہ ظاہری دوا بھی کام نہیں کرے گی۔

اب وہ جو اُس کے اندر خوشی پیدا کرنا ہے، اُسے ہر وقت اچھی خبر دینا ہے بُری بات سے بچانا ہے اس سے جھگڑا نہیں کرنا ہر وقت ماحول ایسا رکھنا ہے کہ اُس کی طبیعت خوش رہے تو یہ ساری چیزیں محسوس کی جا سکتی ہیں نظر تو نہیں آتیں۔ اسی طرح انسان کو ایذا دینے والے یا زندگی کے مانع جو اسباب ہیں گولی مار کر قتل کر دیا، لاٹھی سے مار دیا یا کسی اور ذریعے سے زندگی ختم کر دی، یہ ظاہری ذریعے ہیں۔ ایک نظر نہ آنے والا ذریعہ بھی ہے یعنی کسی سے ہمیشہ حقارت کا سلوک کریں، نفرت کا سلوک کریں، توہین کرتے رہیں، ذلیل کرتے رہیں تو وہ جیتے جی بھی مر ہی جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی محسوسات ہوتی ہیں جن میں نظرِ بد بھی ہے۔ کسی نے کسی چیز کو دیکھا اُس کے اندر اتنا حسد پیدا ہوا اُس کا دل اندر سے جل گیا کہ یہ چیز اس بندے کے پاس کیوں ہے میرے پاس کیوں نہیں وہ کیفیت جو اُس کے دل میں بنتی ہے اُس سے جو لہریں نکلتی ہیں جو (WAVES) پھوٹتی ہیں وہ جب اگلے سے ٹکراتی ہیں تو اُس کا نقصان ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے!

اسی طرح جادو بھی ایک کیفیت ہے۔ شیطان ہر طرح سے انسان کو ایذا دینے کی کوشش کرتا ہے اور یاد رہے کہ شیطان انسان کا دشمن ہے۔ دوست، وہ کافر کا بھی نہیں ہے۔ وہ مطلق انسان کا دشمن ہے، اولادِ آدم کا دشمن ہے۔ کافر کفر کرے، شیطان کی ہر بات مان لے پھر بھی اُس سے وہ کام کراتا ہے کہ یہ اور آگے دوزخ میں جائے۔ کسی انسان سے رعایت نہیں کرتا۔

انسانوں کو گمراہ کرنے کا اُس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بعض انسانوں کو کفریہ کلمات سکھاتا ہے۔ اُن کے کچھ الفاظ ایسے مبہم سے ہوتے ہیں جن کے معنی عام آدمی کو کیا جادوگروں کو بھی سمجھ نہیں آتے لیکن وہ پڑھتے رہتے ہیں تو اُن کے مفاہیم یہ ہوتے ہیں کہ وہ کُلی طاقت اللہ کی جگہ کسی شیطان کو مان کر اُس سے مدد کی درخواست کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک تو جادو کے وہ الفاظ پڑھنے والا خود صریح کفر میں چلا جاتا ہے پھر اس سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں وہ جس کے نام سے کرتے ہیں جس پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں وہ اثراتِ بد اُس تک پہنچتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کی اس سے موت تک واقع ہو سکتی ہے قتل تک کیے جا سکتے ہیں۔

دو قتل ایسے ہیں جن کی جوابدہی میدانِ حشر میں ہو گی دنیا میں ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ ایک وہ شخص جو طب

کرتا ہے لیکن اسے طب آتی نہیں ہے۔ اُس نے طب پڑھی نہیں ہے فاضل نہیں ہے محض ٹو ٹکے دیکھ کر طبیب بن گیا اُس کی دوا سے اگر کوئی بندہ مرجائے تو وہ قاتل ہے۔ دنیا کو اُس کے قاتل ہونے کا علم نہیں ہوتا قیامت کو اُس سے قتل کا حساب لیا جائے گا۔

ایک شخص نے طب پڑھی ہے طبیب ہے، اُس نے دوا شفا کے لیے دی تھی غلطی ہوگئی، بندہ مرگیا اُس سے پُرسش نہیں ہوگی کہ اُس نے بہتری کے لیے دی لیکن ایک شخص طب جانتا نہیں خوامخواہ طبیب بن بیٹھا، اس نے دی، بندہ مرگیا تو وہ قاتل ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ جادو کے زور سے بندہ ماردیا۔ کوئی حکومت، کوئی ظاہری ادارہ اُسے گرفت نہیں کر سکے گا۔ میدانِ حشر میں اُس کی گرفت ہوگی اُس سے قاتل ہی کے طور پر حساب لیا جائے گا۔

حضوا کرم صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کو ایذا دینے کے سارے طریقے مشرکین وکافرین نے آزمائے۔ ہمیں آج شکوہ ہوتا ہے اپنے ماحول کا کہ ہم ایک مسلمان ریاست میں رہتے ہیں اور اسلام پر چلنے کے لیے تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ریاست مسلمانوں کی ہے اسلامی نہیں ہے۔ اسلامی ریاست وہ ہوتی ہے جس کے سارے ضابطے شریعت کے مطابق ہوں اور اسلامی ہوں۔ یہ چونکہ مسلمانوں کی ریاست ہے قوانین اسلامی نہیں ہیں، الحمد للہ! مسلمان ریاست ہے، اٹھانوے فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ جگہ جگہ مساجد ہیں خطبات ہو رہے ہیں۔ تلاوت ہو رہی ہے، تشریح ہو رہی ہے، تفسیر ہو رہی ہے، لکھا جا رہا ہے، پڑھا جا رہا ہے، بیان ہو رہا ہے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ پھر بھی کہیں ذراسی چوٹ لگ جائے ذراسا کوئی دکھ آجائے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی ہیں جو بڑی کوشش کر رہے ہیں اور بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں لہذا بڑا مشکل ہے دین پر قائم رہنا۔ ذرا خیال کیجیے اُس ہستی کا صلی اللہ علیہ وسلم! کائنات پر کوئی بندہ اللہ کے نام سے آشنا نہیں تھا ایک ہستی نے اللہ کا نام بلند کیا۔ پوری دنیائے کفر مخالف ہوگئی مشرکینِ مکہ نے وہ وہ مظالم ڈھائے جن سے تاریخ کے صفحات بھی لرزلرز جاتے ہیں۔ جہاں مادّی تکالیف دی گئیں جسمانی تکالیف دی گئیں، وہاں نظرِ بد کا بھی انتظام کیا گیا کہ یہ جو نظرِ بد ہے اس کو عرب بطورِ پیشہ اپناتے تھے۔ بعض لوگوں میں فطرتاً حسد کی خصوصیت زیادہ ہوتی ہے اور خصوصاً خواتین میں مردوں کی نسبت یہ زیادہ ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر بھی حسد کرتی ہیں۔ اس کا جوتا، مجھ سے اچھا کیوں ہے اس کے چہرے کا غازہ مجھ سے بہتر کیوں ہے؟ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی حسد کرتی ہیں تو جن کی نظرِ بد لگتی تھی اُن کو باقاعدہ وہ کئی کئی روز تک تنہائی میں رکھ کر اندر بٹھا کر بھوکا رکھ کر

اس قوت کو DEVELOP کرنے کی ترغیب دیتے اور پھر وہ ارادتاً کسی کے اونٹ کو کسی جانور کو کسی انسان کو دیکھتے تو اسے نظرِ بد لگ جاتی۔ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ نظرِ بد جوان کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں پہنچا دیتی ہے۔

نظرِ بد کا علاج:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نظرِ بد بھی آزمائی گئی جس کا قرآن کریم میں ذکر خیر ہے: وَاِنۡ يَّكَادُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَيُزۡلِقُوۡنَكَ بِاَبۡصَارِهِمۡ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكۡرَ وَيَقُوۡلُوۡنَ اِنَّهٗ لَمَجۡنُوۡنٌ (القلم:51) یہ چاہتے ہیں کہ نظرِ بند سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس کو نقصان پہنچائیں وہ آیہء کریمہ آج تک نظرِ بد کا علاج ہے۔کسی کو شبہ ہے کہ اسے نظر کا اثر ہے تو وہ اوّل آخر درود شریف کے ساتھ یہ آیہء کریمہ تین بار یا پانچ بار یا سات بار، طاق بار پڑھ کر دم کرے تو ان شآء اللہ ٹھیک ہو جاتی ہے۔کفار نے تو ایذا دینے کے لیے نظرِ بد آزمائی لیکن اس آیت کی صورت میں امتِ مرحومہ کو ہمیشہ کے لیے نظرِ بد کا علاج مل گیا۔

جادو بھی آزمایا گیا لبید ابن عاصم یہودی ایک مشہور جادوگر تھا اور اپنی بیٹیوں کو بھی اُس نے یہ تربیت دے رکھی تھی چونکہ خواتین سے یہ عمل زیادہ ہوتا ہے نظر کا بھی، جادو کا بھی تو اُن سب نے مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کہیں سے حاصل کیے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ عمر عزیز تک یہی رہی کہ آپ بال مبارک کان کے نصف تک لمبے رکھتے تھے پھر وہ بڑھتے رہتے شانہء مبارک تک جب آجاتے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کان کے نصف تک کٹوا دیتے تھے۔یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ عادیہ ہے عادت مبارک تھی۔

یہ بھی یاد رہے سنت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ایک ہے شرعی سنت جن پر عمل کرنا ضروری ہے سنتِ موکدہ، جن کی عمر بھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی۔بعض سنتیں غیر موکدہ ہیں یعنی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عمل کیا کبھی چھوڑ دیا اُس پر وہ تاکید نہیں ہے کبھی ہو سکے کر لیں، کبھی نہیں ہو سکے کوئی حرج نہیں۔بعض سنتیں عادیہ ہیں، عادت مبارک تھی اُسے کہتے ہیں سنتِ عادیہ۔جیسے یہ بال مبارک رکھنے کی اگر کوئی رکھے تو بہت اچھی بات ہے نہ رکھے تو گناہ نہیں ہے چونکہ یہ سنتِ موکدہ نہیں ہے سنتِ عادیہ ہے۔اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں جیسے آپ دائیں پہلو پر سوتے تھے تو دائیں پہلو پر سونا سنتِ عادیہ ہے۔اگر کوئی بائیں پہلو پر سوجاتا ہے تو گناہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی دائیں پر سوتا ہے سوتے وقت دائیں لیٹتا ہے تو ثواب ہے۔

بعض سنتیں سنتِ اضطراری ہوتی ہیں جس پر عمل بالکل ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد میں دندانِ مبارک شہید ہو گیا یہ سنتِ اضطراری ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضی سے نہیں کیا، مجبوراً ہو گیا چنانچہ یہ سنتِ اضطراری پر عمل درست نہیں۔ یہ جو قصہ بنا ہوا ہے حضرت اویس قرنیؒ نے سارے دانت اکھیڑ دیے یہ گھڑا ہوا قصہ ہے اس کی کوئی سند نہیں۔ یہ سنت نہیں ہے۔ ایک نبیؑ کا جہاد میں ہاتھ کٹ جائے تو ساری امت ہاتھ کٹوا دے گی؟ یہ کون سی سنت ہے؟ کسی امت کا نبیؑ جہاد میں شہید ہو جائے، کتنے انبیاؑ کافروں کے ہاتھوں شہید ہوئے، کیا ساری اُمت خودکشی کرلے گی؟ اسے کہتے ہیں سنتِ اضطراری، سنتِ اضطراری پر عمل نہیں کیا جاتا۔ عمل کرنا منع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک شہید ہوا تو اب ساری اُمت دانت تڑوالے تو یہ سنت نہیں ہے قصے گھڑے گئے۔ کہ فلاں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سارے دانت تڑوا دیے۔ یہ کون سی جاہلانہ حکایات ہیں! ان کی کوئی سند نہیں ہے بلکہ ایک مناظرے میں ایک معروف شیعہ عالم مولوی اسماعیل شیعہ جو عہدِ رفتہ کی یادگار تھا کہ شیعہ کو ایسا عالم نہیں ملے گا اور پاکستان بھر میں اُس کا جواب حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہی تھے کہ کوئی مولوی قریب نہیں جاتا تھا بہت وسیع المطالعہ تھا بڑی لائبریری کا مالک تھا۔ اُس نے ایک مناظرے میں حضرت کے آگے یہ پیش کیا تھا آپؒ نے فرمایا کسی مدلل کتاب سے کسی دلیل سے ثابت کرو حکایات سے نہیں۔ وہ نہیں کر سکا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بہر طور اُنہوں نے وہ موئے مبارک حاصل کیے۔ پرانی کنگھی کے دندانوں میں پھنسا کر اُن پر گرہیں لگائیں۔ اب بال کو گرہ لگائی جائے تو وہ آسانی سے نہیں کھلتی۔ انسانی بال باریک ہوتا ہے اور ربڑ کی طرح لطیف سا ہوتا ہے گرہ کھینچ جائے تو نہیں کھلتی۔ تو ایک ویران کنویں میں اتر کر نیچے رکھ کر ایک بڑے سے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ یہاں بھی بہت حکایات لکھی گئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب ہائے مبارک سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے کچھ اور تھے کچھ اور نکل جاتا تھا، یہ سب واہیات قصے ہیں۔ ان کی کوئی سند نہیں ہے۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کرلیا۔ اگر یہ بات مانی جائے کہ جادو کے اثر سے ایک لفظ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لب ہائے مبارک سے خلافِ مرضی نکلا تو سارا دین مشکوک ہو جاتا ہے۔ کیا سند رہ جاتی ہے کہ کون سا حکم صحیح ہے، کیا خبر اُس میں کون سا لفظ خلافِ مرضی نکل گیا! یہ ممکن نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لفظ وحی ءالٰہی ہوتا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى O اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم:3,4) فرمایا گیا کہ لب ہائے مبارک، نطق سے، کوئی لفظ ادا نہیں ہوتا سوائے وحی ءالٰہی کے۔ نطق

کہتے ہیں بولنے کی قوت کو۔ فرمانِ باری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ ناطقہ کام نہیں کرتی جب تک اللہ کی طرف سے القا نہیں ہوتا، بتایا نہیں جاتا۔ قرآنِ کریم وحیءِ متلوّ ہے وہ وحی ہے جو خالص اللہ کا کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہوا، جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ساری حدیث وحی غیر متلو ہے جو کلام، اللہ ہی کا ہے، الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ارشاد فرمایا، وہ حدیث ہے۔ جو قلبِ اطہر پر آیا اور وہی الفاظ جو ذاتِ باری نے منتخب فرمائے اور وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائے وہ قرآن ہے وہ وحی متلو ہے۔ حدیث وحی غیر متلو ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ محسوس کیا تو فوراً وحی آ گئی۔ اللہ کریم کی طرف سے سارا قصہ جبرائیل امین نے بیان فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدام کو حکم دیا نشاندہی کی۔ وہ گئے اُس کنویں میں اترے پتھر ہٹایا وہ کنگھی اُٹھا کر بارگاہِ رسالت میں لے آئے۔ جبرائیل امین یہ آیات تلاوت کرتے جاتے تھے پوری سورۃ الفلق اور پوری سورۃ الناس قل اعوذ برب الفلق سے سورۃ الناس کے اختتام تک وہ ایک آیت پڑھتے ایک گرہ کھل جاتی۔ دوسری آیت پڑھتے دوسری کھل جاتی گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ گیارہ آیتیں ہیں اُنہوں نے تلاوت کی گرہیں کھل گئیں جادو کا اثر ختم ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کو یہ تعلیم کر دیا گیا۔ انسان کو ایذا پہنچانے کے، نظر نہ آنے والے غیر مرئی ذرائع بھی ہیں اور بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا علاج یہ ہے۔

معوذتین کے ذریعے علاج کا طریقہ:

قیامت تک پوری امتِ مسلمہ کو یہ علاج نصیب ہوگیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارک تھی کوئی بیماری بھی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ گیارہ آیات یعنی یہ دونوں سورتیں پڑھ کر ہاتھ پر دم فرما کر وجودِ اطہر پر پھر لیا کرتے تھے تو تمام مسلمانوں کے لیے، جہاں دوا لیتے ہیں ڈاکٹر سے، طبیب سے، وہاں یہ علاج بھی کر لیا کریں۔ طاق مرتبہ درود شریف پڑھیں طاق مرتبہ یہ سورتیں پڑھیں کہ طاق میں برکت ہے اور طاق مرتبہ درود شریف پھر پڑھیں اور ہاتھ پر پھونک کر جسم پر پھیر لیں۔ اوّل آخر درود شریف کی مصلحت علمائے حق فرماتے ہیں کہ درود شریف دعا ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔۔ اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بے پناہ رحمتیں نازل فرما۔

علما فرماتے ہیں کہ درود شریف وہ دعا ہے جو مقبول شدہ ہے۔ رحمتیں تو اللہ نازل فرما رہا ہے، ہم نے تو خوامخواہ اپنا نام لکھوانا ہے کہ ہم بھی اس کی تمنا رکھتے ہیں وہ کام تو پہلے ہو رہا ہے لہٰذا دعا سے پہلے بھی درود شریف پڑھا جائے اور آخر میں بھی درود شریف پڑھا جائے تو گویا پہلا حصّہ بھی قبول ہے آخری بھی قبول ہے تو اُس کریم کی بارگاہ سے امید ہے کہ درمیان والے کو چھوڑ نہیں دے گا۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ دعا سے پہلے بھی درود پڑھا جائے آخر میں بھی درود پڑھا جائے تو اس کے قبول ہونے کی امید زیادہ کی جاسکتی ہے۔ سوان سورتوں کے بھی اوّل آخر طاق مرتبہ درود پڑھا جائے اللہ کو طاق پسند ہے اس کی ذات واحد لاشریک ہے۔ وہ طاق امور کو پسند کرتا ہے۔ ہم جتنے فرائض پڑھتے ہیں اُن میں مغرب کے تین فرض سب فرائض کو طاق کر دیتے ہیں۔ وتر اس لیے واجب ہیں کہ سنت نفل جتنے پڑھے جاتے ہیں جُفت پڑھے جاتے ہیں وتر کی ایک رکعت واجب ہے، دو سنتیں ہیں۔ واجب رکعت جو ہے اُن تمام نوافل کو طاق کر دیتی ہے اللہ کریم کو طاق پسند ہے۔ تو طاق مرتبہ، یعنی ایک مرتبہ پڑھ لیں تین مرتبہ، سات مرتبہ، گیارہ مرتبہ، طاق مرتبہ اوّل آخر درود شریف پڑھ کر اپنے ہاتھ پر پھونک کر جسم پر پھیر لیں تمام بیماریوں سے شفا کا کام دیتی ہے۔ ارشاد باری ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① ''کہہ دیجیے کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں''۔ اچھے یا برے سارے کردار انسانوں میں ہیں لیکن انسان تو مالک کے دستِ قدرت میں ہیں۔ وہ ربّ ہے۔ ہر ایک کو ہر چیز دینے والا وہ واحد ولاشریک ہے۔ ہر چیز اُس کے قبضہءِ قدرت میں ہے تو فرمایا، ''فرما دیجیے میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں''۔ کسی میں کوئی بھی خصوصیت ہے اُس کی ایذا سے اُس مالک کی پناہ چاہتا ہوں جو ان سب پر قادر ہے انہیں روک سکتا ہے۔ مَلِكِ النَّاسِ ② ''لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی''۔ انسان مزاجاً بادشاہت حکومت کے ایک نظام کا عادی ہے۔ ہمیشہ ہر جگہ ہر طبقے ہر معاشرے میں ایک بادشاہ ہوتا ہے۔ وقت بدلتا ہے بادشاہت حاصل کرنے کے طریقے سلیقے بدلتے ہیں۔ بادشاہوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ بادشاہ کی جگہ وزیر اعظم رکھ دیتے ہیں لیکن جو بھی اقتدار میں آتا ہے ہوتا وہ واحد آدمی ہے جس کی مرضی پر جس کے اشارۂ ابرو پر سارے کام چلتے ہیں۔ نام مختلف ہوتے ہیں۔ ہوتے بادشاہ ہی ہیں۔ فرمایا، یہ تو وقتی عارضی آنے جانے والے لحاتی عارضی ظاہری بادشاہ ہیں۔ انسانوں کا حقیقی بادشاہ، معبود برحق اللہ جلّ شانہٗ ہے جس کے دستِ قدرت میں انسانوں کا ظاہر و باطن سب کچھ ہے۔ ہمہ وقت، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا اور وہ صرف بادشاہ نہیں: اِلٰهِ النَّاسِ ③ ''لوگوں کے معبودِ برحق کی''۔ اللہ جلّ شانہٗ ہی لوگوں کا معبودِ برحق ہے! اُس کی شان یہ ہے کہ ساری مخلوق اُس کے آگے سجدہ ریز رہے۔ حقیقی بادشاہ، معبودِ برحق ہے وہی عبادت کا مستحق ہے۔

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ۔۔۔ ''وسوسہ ڈالنے کی برائی سے'' وہ جو نظر نہ آنے والی چیزیں ہیں جن کا کام دلوں میں وسوسے ڈالنا، مزاج بگاڑنا، طبیعتیں مکدر کرنا، اُن کی برائی سے۔ الۡخَنَّاسِ۪ ''جو (اللہ کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے'' یہ صفت شیطان کی ہے تو سارے شیطانوں کے شر سے۔ چونکہ یہ برائی کرنا دلوں میں برائی ڈالنا، ایک دوسرے کے خلاف نفرت ڈالنا مزاج بگاڑ کر اُسے صحت سے بیماری کی طرف لے جانا یہ برائیاں خنّاس شیاطین کا مزاج ہیں، کام ہے۔ خنّاس بڑے شیاطین کو کہا جاتا ہے۔ ہمیں ہر وقت پناہ مانگنی چاہیے بڑے بڑے شیاطین کے شر سے: الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ۝ ''جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے''۔

یہ خنّاس کون ہیں؟ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔ وسوسہ کیا ہوتا ہے؟ کسی کے دل میں خلافِ حقیقت کوئی بات ڈال دینا۔ جس بات کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس کا وہم ڈال دینا کہ تمہارا فلاں نے یہ کر دیا ہے فلاں نے تمہارا۔۔۔ نہ فلاں کو پتا ہے نہ اس کو پتا ہے۔ تم نے یہ کیا تھا، تمہیں یہ ہو گیا ہے۔ بھئی تجھے کیا پتا ہے اس نے کیا کیا تھا۔ کوئی اُس کی حیثیت، سر پیر نہیں ایک وسوسہ ڈال دیا۔ معاشرے میں خرابیاں پیدا کرتا رہا۔ یہ خنّاس بڑے بڑے شیاطین ہوتے ہیں۔ یہ کون ہوتے ہیں؟ فرمایا: مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ۝ ''جنات میں سے اور انسانوں میں سے''۔ یہ جنّوں میں بھی ہیں۔ خود ابلیس ہے اور اُس کی اولاد ہے۔ ایک حدیث شریف ملتی ہے صاحبِ کتاب الحیوان نے نقل کیا ہے اور حدیث کی کتابوں میں بھی ہے جس کا مفہوم ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے عہدِ مبارک میں فرمایا تھا کہ جتنی آبادی روئے زمین پر انسانوں کی ہے اس سے نو گنا زیادہ آبادی جنات کی ہے۔ چونکہ وہ کئی ہزار سال پہلے زمین پر آباد تھے تو اُن کی نسل ظاہر ہے کہ زیادہ بڑھنی چاہیے پھر اُن کی عمریں بھی طویل ہوتی ہیں اور فرمایا انسانوں اور جنّوں کی مجموعی آبادی سے شیطان کی جو اولاد ہے اُس کی آبادی نو گنا زیادہ ہے۔ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ارشادِ عالی پر بھی اب پندرھویں صدی آ گئی تو اُس وقت انسانی آبادی کتنی تھی آج کتنی ہے؟ اُس لحاظ سے نو گنا کر کے دیکھیں جنات بھی اتنے بڑھ گئے ہوں گے اور اس سب کو ملا کر نو گنا کریں تو شیاطین بھی اتنے بڑھ گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے آج تو ایک بندے کے ساتھ پچاسوں شیاطین اور پچاسوں جنات پھر رہے ہیں مشورہ دینے کے لیے اور وسوسے ڈالنے کے لیے۔ اس عہد میں تو بچنے کی کوئی امید نہیں جب تک دامانِ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں نہ ہو۔ یہ جن کاموں کی ہمیں فرصت نہیں ہے یہ ہماری ضرورت ہیں۔ ہمیں فرصت نہیں ورنہ نماز تو پڑھتے، فرصت نہیں ہے کہ ذکر کر لیتے، فرصت نہیں ملی ورنہ تلاوت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کام فرصت کے نہیں ہیں یہ اوّلین کام ہیں یہ کر

کے باقی کام کرنے چاہیں تاکہ اس طوفانِ شیطنت سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ انہی شیاطین کے اثرات کی کارکردگی ہے ناں کہ لوگ بیٹیوں کو نچا رہے ہیں اور باپ تالی بجا رہے ہیں۔ بہنیں نیم برہنہ CAT WALK کر رہی ہیں اور بھائی تالیاں بجا رہے ہیں۔ بہنیں طبلے، ڈھول، سارنگی کی تاپ پر ناچ رہی ہیں۔ گانے گا رہی ہیں اور بھائی خوش ہو رہے ہیں۔ یہ مزاج کس نے بدل دیے ہیں؟ یہ انسانی مزاج تو نہیں ہے۔ یہ تو کوئی عہد جاہلیت میں بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسلام نہیں تھا تو مشرکین بھی ناچنے گانے والوں کا طبقہ الگ رکھتے تھے۔ شرفا کے یہاں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ گانے سنتے تھے، گانے والوں کو شریف نہیں سمجھتے تھے اور ہماری جوانی تک بھی ڈوم، کنجر یہ الگ قومیں ہوتی تھیں۔ ان کے اپنے ضابطے قاعدے ہوتے تھے اب تو سارے STAR بن گئے آسمانوں پر چلے گئے۔ ہم زمین کے زمین پر رہ گئے یہ آسمانوں پر چلے گئے۔ یہ کس کی کارکردگی ہے؟ یہ جو شیطانی لشکر پھرتے ہیں جن بھی مل گئے۔ پھر فرمایا، صرف جنوں سے نہیں: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦ انسانوں سے بھی لوگ شیطان بن جاتے ہیں۔ جس طرح کچھ خوش نصیب فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو جاتے ہیں کچھ خوش بخت فنافی اللہ ہو جاتے ہیں اسی طرح کچھ بدبخت فنافی الشیطان ہو کر شیطان بن جاتے ہیں۔ تو فرمایا شیطان کی اولاد تو ہے ہی شیطان ہے جنوں میں سے جو اُس کے پیروکار ہیں اُن کی برائی سے بھی اور انسانوں میں سے جو شیطان کا کہنا مان کر خود بھی شیطان بن گئے ہیں اُن کے وساوس سے بھی اُس اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

یہ گیارہ آیات اس طرح کی ہر بیماری کا حتمی علاج ہیں اور ہر عمومی بیماری کے لیے بھی شفا کا کام دیتی ہیں اور ہر مسلمان کے لیے ہیں ہر مسلمان کا حق ہے۔ قرآن میں نازل ہیں، کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان قرآن پر عمل کر سکتا ہے قرآن سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ظاہری بھی علمی بھی، باطنی بھی، مالی بھی ہر طرح کے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی بیماری کوئی تکلیف ہو بچہ بیمار ہو تو ان جادوگروں، عاملوں کے پاس بھاگنے سے زیادہ بہتر ہے کہ خود یہی آیات پڑھ کر دم کر دیں۔ کرتے رہا کریں۔